سلسلۂ نصابِ تعلیمِ جامعۂ عثمانیہ

ارتقائے نظم حکومت یورپ

تصنیف

ہنری سجوک

ترجمہ

قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے

رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۴۸ھ م سنہ ۱۳۳۸ف م سنہ ۱۹۲۹ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین ارتقائے نظم حکومت یورپ

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارتقائے نظم حکومت یورپ

خطبۂ اول

تمہیدی تبصرہ

۱ـــــ میرا مقصد یہ ہے کہ اس تمہید کے بعد جو خطبات شروع ہوں ان میں سیاسی معاشرتوں کی تاریخ کے ایک اہم حصہ پر سیاسیات استقرائی کے لحاظ سے جیسا کہ میں اس علم کو سمجھتا ہوں بحث کروں "سیاسی معاشرت" کا پورا مفہوم جوں جوں ہم اس مضمون کو آگے پڑھیں گے معلوم ہوتا جائیگا۔ سردست اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس جملہ سے میری مراد ایک گروہ آدمیوں کا ہے جو آپس میں متحد ہوتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں سے اس بنا پر امتیاز رکھتے ہیں کہ وہ ایک ہی نظم حکومت کے مطیع رہنے کے عادی ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ ایک متحدہ مجموعہ ہیں یعنی کل کا اطلاق ان پر ہوتا ہے۔ اس مجموعۂ انسانی کی زندگی میں اور ان لوگوں کی زندگی میں جن سے یہ مجموعہ بنا ہے تمیز کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کی معاشرت (یعنی سیاسی معاشرت) جب تمدن کے ایک خاص درجہ پر پہونچتی ہے تو اس کو "سلطنت" بھی کہتے ہیں اور یہ امر میرے لئے اختیاری ہوگا کہ میں اس کو چاہے "سیاسی معاشرت" کہوں چاہے سلطنت۔ نظم حکومت کو میں ایک لازمی خاصہ سلطنتوں یا سیاسی معاشرتوں کا اس حیثیت سے کہ وہ "سلطنتیں" یا سیاسی معاشرتیں ہیں سمجھتا ہوں۔ اور چونکہ ان میں نظم حکومت ہوتا ہے اس لئے ہم کو ان ہی سلطنتوں یا سیاسی معاشرتوں سے از اول تا آخر بحث رہے گی۔ معاشری انسان کے دیگر خصائص جنکے

ساتھ وہ ہم کو مختلف زمانوں اور ملکوں میں نظر آئے گا اور اس کے السنہ و رواج، اس کے مذاہب اور علوم و فنون حتیٰ کہ اس کی معاشی حالت سے ہم کو جو کچھ بحث ہوگی وہ بواسطہ ہوگی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان دیگر خصائص سے ہم کو اسی حد تک بحث ہوگی جس حد تک کوئی بڑا تعلق علت و معلول کی قسم کا اس چیز میں نظر آئے گا جکو میں مختصر طور پر دستور کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دستور سے میری مراد ہوگی نظم حکومت کی وہ ساخت جس کے تحت میں انسان رہتا ہے اور اس نظم حکومت کے وہ تعلقات جو اس کو اپنے محکوموں کے ساتھ ہوتے ہیں

میرے اس قول کا کہ میں سیاسی معاشرتوں سے بلحاظ سیاست بحث کروں گا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو مجھکو بحث دساتیر سے ہوگی جیسے کہ وہ ہیں یا رہ چکے ہیں اور اس سے بحث نہ ہوگی کہ کسی دستور کو کیسا ہونا چاہیئے اور دوسری طرف مجھکو اس تحقیق کیلئے غور کرنا ہوگا کہ (۱) یہ دساتیر اپنے اقسام میں کس قسم کے ہیں یا وہ عام نمونے کیا ہیں جنکو یہ دساتیر بطور مثال کے پیش کرتے ہیں اور (۲) وہ اسباب کیا ہیں جن سے کوئی عام نمونہ مختلف ملکوں میں مختلف زمانوں میں رائج ہوا۔ اس طرح جن پہلوؤں سے سیاسیات کو دیکھا جاتا ہے ان میں امتیاز قایم کروں گا یعنی ایک جانب تو سیاسی فلسفے سے جسکا میدان بہت وسیع ہے اور دوسری جانب معمولی سیاسی تاریخ سے سیاسیات کا فرق بتاؤں گا۔ سیاسیات کو جب اس طریقے سے بیان کیا جائے گا تو ایک جانب تو یہ دریافت ہوگا کہ اس علم کو سیاسی فلسفہ کی طرح اس بات سے براہ راست کوئی بحث نہیں ہے کہ نظم حکومت کی کونسی شکل صحیح اور بہترین ہے یا اس کی وہ کونسی شکل ہے جس کو ہم معاشرت کے ارتقا میں ایک خاص درجہ پر پہونچ کر رائج کریں۔ فی الواقع ہم سیاسیات سے ایسے نتائج اخذ کرنے کی توقع کر سکتے ہیں جو انسان کو عملی فایدہ پہونچاتے ہیں۔ اور میں آگے چلکر غور کروں گا کہ کس طریقے سے اور کس حد تک یہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں، لیکن سیاسیات کا اصلی کام یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی سیاسی تعمیر کھڑی کر دے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ سیاسی واقعات سے خواہ وہ تاریخ سے مہیا ہوئے ہوں یا کسی زمانۂ خاص کے مشاہدے سے، عام نتائج مستنبط کرے۔ جہاں تک ہمارے مطالعہ کو دستور کے نمونوں سے بحث ہے وہاں تک یہ نمونے وہ ہیں جو دنیا کے واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ یہ مثالی نمونے نہیں ہیں جن کو مطمح نظر بنانے کے لئے سیاسیات ہمارے سامنے پیش کرتی ہو۔

دوسری جانب سیاسیات اور سیاسی تاریخ میں جو چیز تمیز پیدا کرتی ہے وہ
سیاسیات کی یہ غرض ہے کہ اس سے نتائج کلی پیدا کئے جائیں۔ لیکن سیاسیات کے طالب علم
ہونے کی حیثیت سے ہمارا اصلی مقصود یہ نہیں ہے کہ کسی خاص تاریخی قوم کی نظم حکومت
کی ساخت یا اس کے منصبی فرائض کو تحقیق کریں بلکہ ہمارا اصلی مقصود یہ ہے کہ نظم حکومت
کی مختلف شکلوں میں جو خصوصیات بہ اعتبار ان کی ساخت اور منصبی فرائض کے ایسے ہوں
جو ان شکلوں میں تمیز کراتے ہوں انکو تحقیق کیا جائے ہمارا اصلی کام یہ نہوگا کہ اس
خاص روش کو جو مثلاً ایتھنز یا انگلستان میں سیاسی تبدیلی نے اختیار کی اس کو دریافت
کریں بلکہ ہمارا کام ان قوانین اور رجحانات کو دریافت کرنا ہوگا جن کی مثال سیاسی
تبدیلی کی ان خاص روشوں میں ملتی ہے۔

چنانچہ اکثر ہوتا ہے کہ سیاسی واقعات بالکل ایک ہی ہیں لیکن مورخ اور
متعلم سیاسیات ان کو بالکل مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرتا ہے۔ مورخ کی اصلی غرض
یہ ہوتی ہے کہ واقعات کو وقت کے لحاظ سے ترتیب دے کر پیش کرے۔ لیکن بنی
نوع انسان کے مختلف حصوں میں ان کے ارتقا کا مقابلہ کرنے میں ہم کو تمام زمانۂ
ماضی اور حال میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر محض ایک زمانہ لیا جائے تو ان مختلف حصوں
کے ارتقا مختلف مراحل پر نظر آئیں گے اور اس وجہ سے یہ تقریباً ممکن ہے کہ ارتقا کے
ایک ہی مرحلہ پر وہ ایسے مختلف زمانوں میں ہوں جن میں بڑا فصل ہو۔ پس سیاسیات
کا مقصد یہ ہے کہ مقابلہ کی غرض سے ان معاشرتوں کو یکجا کرے جو اپنے سیاسی خصائص
میں مشابہت رکھتے ہوں۔ زمانہ کے لحاظ سے خواہ ان میں کتنا ہی بعد ہو۔ اس طرح
جب اس مطالعہ کے شروع میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ "ابتدائی ہندی جرمانی" دستور
کا ایک عام تخیل قائم کریں تو ہم کو مصنف ٹیسیٹس نے اپنے زمانہ میں جرمانیوں
کا جو کچھ حال لکھا ہے اس کا مقابلہ اسی زمانہ کے سیاسی نظام روما سے نہیں کرنا پڑتا بلکہ
اس سے بہت پہلے کے رومانی دستور سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے جس کا حال ازمنۂ قدیمہ کے
بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہے اس سے دریافت ہوتا ہے۔

۲- پس دیگر علوم کی طرح سیاسیات کا مقصد بھی یہی ہے کہ جن چیزوں
کو وہ مطالعہ کرے ان میں مشابہت کے تعلقات کو دریافت کرے۔ ان چیزوں

کو اقسام میں ترتیب دینا یا ان کو اس طور سے پیش کرنا کہ وہ سیاسی نمونوں کی مثالیں ہیں اس کا کام ہے۔ لیکن گو اقسام میں ترتیب دینا اس کے کام کا بڑا حصہ ہے لیکن یہ کل کام نہیں ہے اور نہ میں یہ کہوں گا کہ یہ سب سے زیادہ خوشگوار کام ہے مختلف شکل کے دستوروں میں جو چیز خاص طور پر دلچسپ معلوم ہوتی ہے وہ ان کے اسباب اور نتائج کا دریافت کرنا ہے اور خصوصاً ارتقا میں اس التزام کو معلوم کرنا کہ دستور کی ایک شکل کس طرح دوسری شکل اختیار کرنے کی طرف مائل رہتی ہے۔ اس کام کی دشواری میں مطلق شبہ نہیں۔ تمام سیاسی معاشرتوں کے متعلق جو تاریخ میں ملتے ہیں سرسری طور پر یا امتحاناً اس کام کو انجام دینے کی میں ہمت تک نہ کر سکا۔ البتہ اس مضمون کے صرف ایک محدود حصہ سے مجھکو بحث رہیگی جس کو میں نے اس وجہ سے منتخب کیا ہے کہ میرے سامعین علمی و سیاسی دونوں اعتبار سے اس میں دلچسپی رکھتے ہیں پس میری کوشش زیادہ تر اس طرف مبذول رہیگی کہ سیاسی معاشرت کی جن خاص شکلوں کو یورپ کی تاریخ تمدن ظاہر کرے ان کو مع ان کے تمیزی خصوصیات کے پیش کروں اور جو بڑی مشابہتیں ان میں ہوں ان کے لحاظ سے ان کے اقسام قائم کروں اور ارتقار مسلسل کا ایک تصور قائم کرکے اس کی بنا پر ان میں ایک رشتہ پیدا کروں۔ اور ان کی نسبت خیال کروں کہ یہ خاص شکلیں اس راہ کے مراحل ہیں جنکو سیاسی معاشرتوں نے تاریخ کی اقلیم میں طے کیا ہے اور جسکا نتیجہ آج کل کی سلطنت ہے جیسا کہ ہم اس کا علم رکھتے ہیں۔

یورپ کی تاریخ پر اس پہلو سے بحث کرنے میں اس کو ایک احدیت اس قسم کی حاصل ہو جائے گی جو ترکیب وارتقار اجسام حیوانات و نباتات میں پائی جاتی ہے! لیکن، حقیقت میں یہی ایک پہلو نہیں ہے جس سے تاریخ کی احدیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ متمدن معاشرت کا نشو و نما ایک بڑا پیچیدہ واقعہ ہے جسکے بہت سے اجزاء اور منظر ہیں۔ پھر اس کے دوسرے اجزاء بھی ہیں مثلاً خیال اور علم کا ارتقا۔ یہ اجزاء ایک ایسا مرکزی اور اساسی واقعہ صحیح طور پر سمجھے جاسکتے ہیں جسکے گرد دوسری قسم کے ارتقاؤں کو جمع کرنا پڑے گا۔ تاہم منظمہ سیاسی معاشرت کے ارتقا میں ہم کو معاشری تبدیلی کی زنجیر کی ایک ایسی کڑی ملجاتی ہے جسکی درجہ بدرجہ تحقیق سے تاریخ کے وہ سلسلے جنکو ہم زمانہ قدیم ، زمانہ وسطیٰ و دور جدید کی تاریخیں کہکر ان میں

فرق کرنے کے عادی ہوگئے ہیں وہ سب قدرتی طور پر ایک ہی مسلسل و بسیط تاریخ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اب تاریخ کی اس احدیت کا ایک روشن اور مکمل تصور قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ماضی و حال کو جوڑ دیں۔ یعنی اپنے ذہن میں اس بات کو ہمیشہ حاضر رکھیں کہ "تاریخ زمانۂ ماضی کی سیاست ہے اور سیاست زمانہ حال کی تاریخ ہے"۔ اور جب ہم اس طرح ماضی کو حال سے ملا دینگے تو لازمی ہے کہ ہمارے خیالات حال سے مستقبل میں پہونچیں۔ خاصکر سلطنتوں کے اس مجموعے کی آیندہ حالت کا اندازہ کرنے لگیں جنکا ایک رکن انگریزی سلطنت بھی ہے اور جو اس وقت بدیہی طور پر کرۂ ارض کے بڑے حصہ پر صاحب اقتدار ہے اور اسطرح، گو سیاسیات جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں صرف علم ہے، براہ راست کوئی عمل نہیں، ہم قدرتاً سیاسی معاشرت کے ارتقائے ماضیہ کو ایک خیالی شوق علمی سے بڑھکر کسی چیز کے لئے مطالعہ کرنے لگتے ہیں یعنی اس تحقیق میں مصروف ہوجاتے ہیں کہ اپنے زمانہ کے عملی مسائل سیاسی کے متعلق اس مطالعہ سے کس قسم کی اور کس قدر ہدایت حاصل کرنے کی ہم کو توقع رکھنی چاہیئے۔ میرا خیال نہیں ہے جیسے کہ میں کہیں اور بھی لکھ چکا ہوں کہ تاریخی طریقہ وہ طریقہ ہے جو عملی سیاسیات کے مسائل کو معقول طور پر حل کرنے میں حقیقتاً مستقل ہو سکتا ہو۔ اس کی پہلی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ تاریخ نہ تو سیاسی ادارات میں ان کے آخری مقصود کو بتا سکتی ہے اور نہ ان میں برُے بھلے صحیح و غلط کے معیار کا اندازہ کرسکتی ہے خواہ اس کو ہم انسان کی "عام مسرت" سمجھیں اور خواہ جیسا کہ اور لوگوں نے خیال کیا ہے "انسانی بہبودی" تصور کریں جس کا مفہوم کسی طور پر ایسا بتایا گیا ہے کہ "انسانی مسرت" کے مفہوم سے اس میں تمیز ہوسکے۔ یہ آخری مقصود ہم تاریخ سے حاصل نہیں کرسکتے بلکہ ہم اپنے ساتھ اس کو تاریخ میں لاتے ہیں یعنی جسوقت ہم پرانے قوانین یا سیاسی ادارات کو تاریخ میں پڑھکر ان کی بھلائی برائی کا اندازہ کرتے ہیں تو اس آخری مقصود کے خیال کو ہم پیش نظر رکھتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فرض کیجیے کہ ہم اس امر میں متفق بھی ہوگئے کہ وہ مقصود آخری کیا ہے جس تک ایک سیاسی مدبر کو پہونچنا چاہئے تو اس حالت میں بھی میرے خیال میں تاریخ بہت محدود طریقے پر ان ذرائع کے انتخاب

یعنی یہ کہ ایسی معاشرتوں سے جو ہم سے غیر ہیں خواہ وہ غیر قومیں ہوں یا ماتحت ممالک، ان کے ساتھ ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہئے۔ سیاسی ادارت کی تاریخ میں سیاسی اور معاشری نظام کی شکلیں طرح طرح کی نظر آتی ہیں جنکے مطالعہ سے ہم اسی قسم کے ہم زمانہ نظاموں کی نوعیت کو اور اس امر کو کہ ان سے کس عمل کے ظاہر ہونے کا احتمال ہے بہتر طریقہ پر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ انسانی معاشرتیں (جیساکہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) ارتقا کے مختلف مراحل میں ہم زمانہ ہوتی ہیں، اور ہم کو بحث فی الواقع ان قوموں سے ہوتی ہے جنکی موجودہ سیاسی معاشرت کی حالت کیلئے ہدایت آموز نظیریں ایسی گزشتہ معاشرتوں کی حالت میں دریافت ہوتی ہیں جن سے ہم بہتر طریقہ پر واقف ہیں، مثلاً نہایت قابل مبصروں کی رائے ہے کہ اگر قبضۂ اراضی کا تاریخی ارتقا جسطرح کہ ہمارے موجودہ تصور کے مطابق وہ یورپ کے ملکوں میں پیش آیا تھا اگر انگریزی مدبروں کے پیش نظر ہوتا تو ہند کی انگریزی حکومت میں بہت سی صریح غلطیاں نہ ہونے پاتیں۔

اس طرح تاریخ اپنے معمولی مفہوم میں یعنی یہ کہ وہ ایک مطالعہ زمانۂ ماضی کا ہے ایک جزو اس علم کا مہیا کرتی ہے جنکو ہم "سیاسیات متقابلہ" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ دوسرا جزو اس علم کا اسی زمانہ کے مشاہدات سے مہیا ہوتا ہے، اگرچہ معلومات کے جو مختلف مجموعے ان دونوں اجزا سے حاصل ہوتے ہیں ان کا ملانا ایک دشوار کام ہے۔

۳۔ اس کے بعد ایک سوال جو سب سے زیادہ وقعت رکھتا ہے یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی دستور کی گذشتہ تاریخ سے ہم اپنی سیاسی حالت کی کس حد تک ایسی نظیریں یا تمثیلیں (مشابہتیں) دریافت کر سکتے ہیں جن سے ہدایت حاصل ہوتی ہے؟

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ اگر مغربی یورپ کے لوگوں کا یہ خیال درست ہے کہ ترقی کی راہ میں وہ اوروں سے آگے ہیں تو ہم کو اس قسم کی اکثر نظیریں (مشابہتیں) جن سے ہدایت حاصل ہو سکتی ہے ان سلطنتوں کی زمانہ حال سے کچھ پہلے کی تاریخ میں ملیں گی جو ہمارے مجموعے میں شامل ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں مثلاً ممالک متحدہ امریکہ اور انگریزی نوآبادیاں تجربے کے بڑے قیمتی سبق اس مضمون کے متعلق دے سکتی ہیں کہ نیابتی جمہوریت جو انگریزوں کے مقدر میں لکھی معلوم ہوتی ہے لیکن جو انگلستان کی

یں مدد دے گی جو مقصود حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں - اس کا باعث یہ ہے کہ تبدیلی اور ارتقا کا سلسلہ جس میں سیاسی معاشرت نقل وحرکت کرتی ہے برابر جاری ہے اور اس بنا پر زمانہ گزشتہ کے تجربے اگر یہ زمانہ گزشتہ بالکل ہی ماضی قریب نہیں ہے ان ضروریات پر اکثر عائد نہیں ہوتے جو موجودہ زمانہ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کو پیش آتی ہیں -

لیکن گزشتہ زمانہ کی تاریخ میرے خیال میں اصلی سرچشمہ ان معلومات کا نہیں ہے جنکی بنا پر ہم اپنے زمانے اور اپنے ملک کے مسائل سیاسی کا فیصلہ کرتے ہیں تاہم یہ بہت ضروری ہے کہ اس گزشتہ تاریخ سے جس حد تک ہدایت مل سکے ہدایت حاصل کی جائے - اولاً - جو کچھ گزر چکا ہے اس کے مطالعہ سے ہم سیاسی ارتقا کے قوانین دریافت کرتے ہیں اور اسطرح پیش بینی کر سکتے ہیں - گو بہت غیر واضح طور پر کہ کیا ہونے والا ہے - اس پیش بینی میں ہم کوئی سیاسی تخیل ایسا نہیں قائم کر سکتے جس سے ہم کو اس کا اندازہ ہو کہ کس چیز کو ہمیں اپنا مقصود بنانا چاہئے لیکن اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس چیز کو اپنا مقصود نہ بنانا چاہئے، اس بنا پر کہ اپنی پہونچ سے وہ باہر ہے - واقعات گذشتہ کے مطالعہ سے ہم کو کسی قدر اندازہ ان حدود کا ہو جاتا ہے جس میں ایک قابل عمل سیاسی تخیل محدود ہے، اور اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرت اور حالات کس قسم کے ہوں گے جنکا لحاظ کرکے آیندہ سیاسی ادارات کو ان کے موافق مزاج بنانا ہے - تاریخ گذشتہ کے مطالعہ سے ہم گو بالکل یقین کے ساتھ نہیں لیکن احتمال کے بڑے درجہ تک یہ بھی دریافت کر سکتے ہیں کہ خود ہماری سیاسی معاشرت سے کون سے اجزا اور خصائص ایسے ہیں جو تعداد میں بڑھتے جائیں گے اور ان کی وقعت کم ہوتی جائے گی اور کون سے اجزا، وخصائص ایسے ہیں جو تعداد میں کم ہوتے جائیں گے اور ان کی قیمت گھٹتی جائے گی - اس قسم کی پیش بینی کا مادہ صحیح طور پر کس حد تک حاصل ہو سکتا ہے میں ابتک نہیں معلوم کر سکا ہوں لیکن سیاسیات کا مقصد اور اس کی بڑی تمنا یہی ہونی چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو اس پیش بینی کی قابلیت کو حاصل کرے -

دوسرے یہ کہ تاریخ ایک اور طرح پر بھی ہماری خدمت کرتی ہے،

بہ نسبت ممالک متحدہ اور نوآبادیوں میں زیادہ مکمل طریقہ پر رائج ہے کس طرح کام کرتی ہے۔

زمانۂ حال سے کچھ پہلے کی تاریخ ہی سے یہ ہدایت آموز نظیریں اس وقت تلاش نہیں کی گئیں جبکہ ایک بڑا سلسلہ سیاسی مباحث کا اس بنا پر مدت تک جاری رہا تھا کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جمہوری آزادی اور اس کی برکتیں حاصل کرنے کے شوق نے بڑے پرجوش طریقہ پر اپنا اعلان کیا تھا بلکہ مونٹسکیو اور روسو کے زمانہ سے سر ہنری مین کے زمانہ تک اس قسم کی سیاسی بحث میں ایک بڑا درجہ اس عمومیت پر غور کرنے کو دیا گیا جس کا علم ہم کو یونان اور روما کی تاریخوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر اس پرانی عمومیت کا مطالعہ غور واحتیاط سے کیا جائے تو اس تبدیلی کی تدریجی حالت دریافت ہو جائے گی جو سیاسی معاشرت کے اس نمونے میں پیش آرہی ہے جسکو ہم مغربی یورپ اور امریکہ کی باقاعدہ سلطنت کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس میں عام طور پر اتفاق کیا گیا ہے کہ مغربی یورپ کی سلطنتیں عمومیت کی طرف حرکت کر رہی ہیں اور اس امر پر غور کرنے میں کہ یہ تحریک اچھی ہے یا بری اور جو خطرات ومشکلات اس راہ میں پیدا ہیں ان کو کسطرح رفع کیا جائے تمثیلی دلائل ہمیشہ اس بات پر مبنی کیے گئے ہیں کہ یونان کی شہری سلطنتوں میں عموم کا اور روما کی جمہوریت میں جبکہ وہ اپنی آخری شکل اختیار کر چکی تھی عمومی مجالس کا چلن اور برتاؤ کیسا تھا۔ میرے خیال میں اس قسم کے نظائر وتشبیہات سے کام لینے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ یونان وروما کے سیاسی حالات میں اور موجودہ یورپ کے سیاسی حالات میں بڑا فرق ہے۔ خاصکر (۱) ایک چھوٹی سی سلطنت کی بلا واسطہ عمومیت میں جہاں قوم کے سب لوگ مجلس میں شریک ہو سکتے تھے اور بڑی سلطنتوں کی نیابتی عمومیت میں جنکا آجکل بالعموم رواج ہے بڑا فرق ہے (۲) دوسرا فرق وہ تھا جو رواج غلامی نے پیدا کیا تھا۔ اس فرق نے قدیم زمانہ کی سب سے زیادہ عمومی قوموں میں مزدور پیشہ جماعت کے ایک بڑے حصہ کو سیاسی حقوق سے قطعی محروم کر دیا تھا۔ (۳) تیسرا فرق کلیسا اور سلطنت کی علحدگی تھا جو ہمارے آج کل کی معاشرتوں نے وسطی یورپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ (۴) چوتھا فرق آج کل کی سلطنت میں صنعت وحرفت کے تبدیل شدہ حالات اور مرتبہ کا ہے، مگر ان فرقوں کا لحاظ کرنے کے بعد بھی میرے

خیال میں یہ بات دلچسپ اور سبق آموز ہے کہ قدیم یونان اور اطالیہ کی شہری سلطنتوں کے تیز رفتار ارتقا میں جو مراحل یکے بعد دیگرے پیش آئے اور موجودہ یورپ کی "ملکی سلطنت" کے سست رفتار ارتقا میں جو مراحل ایک کے بعد ایک پیش آئے، ان میں مقابلہ کیا جائے کیونکہ ان ارتقاؤں میں مشابہت چاہے کسی درجہ کی ہو پھر بھی ان میں احتیاط اور قاعدے سے مقابلہ کرنا وہ چیز ہے جو ہماری نظر کو ان نصیحتوں کی پوری قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صحیح کر دے گا جو آجکل کے ارباب سیاست کے لئے قدیم تاریخ سے ہمیشہ نکلتی رہیگی یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ قدیم اور بعد کے ارتقا میں صرف مشابہت ہی کی بناء پر تعلق نہیں ہے۔ "جدید سلطنت" جو سیاسی تمدن کا آخری ثمرہ ہے ایک ایسا نمونہ ہے جس کی مثالیں صرف مغربی یورپ کی سلطنتوں میں یا ایسی نو آبادیوں میں جو ان سلطنتوں نے قایم کی ہیں مل سکتی ہیں اور مغربی یورپ کی سلطنتیں یا تو (۱) رومانی شہنشاہی کے ٹکڑے ہیں جو جرمانیوں کی ناگہانی یورشس نے کر دئے تھے اور جن کی سیاسی تنظیم رومانی تمدن اور جرمانی قبائل کے سیاسی عادات کے مطابق از سر نو ہوئی۔ یا (۲) وہ قومیں ہیں جو ان جرمانی قبائل فاتح سے ابتداء میں نسلی قرابت رکھتی تھیں اور بعد کو انھیں کے سیاسی اور معاشری ارتقا کے اثرات سے ان کی طرف کھنچ آئیں۔ فرانس۔ ہسپانیہ۔ اطالیہ پہلی قسم کی مثالیں ہیں اور جرمانیہ اور اسکانڈی نیویا دوسری قسم کی۔ انگلستان تاریخی حیثیت سے تو ان دونوں کے بیچ بیچ ہے لیکن جب ان کے سیاسی ارتقا کے حالات دریافت ہوتے ہیں تو انگلستان کو دوسری قسم میں رکھنا پڑتا ہے[ع۱]۔ علاوہ اس کے ان سلطنتوں کے کل مجموعے کے سیاسی خیال پر ایک بڑے درجہ تک وہ اثر پڑا جو تاریخ یونان کے مطالعہ سے اور حکمائے یونان کے اُن تصورات اور اصول کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا جو انھوں نے یونان کی شہری سلطنتوں پہ غور کرکے قائم کئے تھے۔

لہٰذا میرا قصد ہے کہ میں قدیم یونان، روما کے سیاسی ادارات اور رومانی دور

ع۱ گو انگلستان مدت دراز تک رومانی شہنشاہی کا ایک صوبہ تھا اور جرمانیہ کل کا کل کبھی رومانی شہنشاہی میں داخل نہ تھا پھر بھی انگلستان کی بہ نسبت جرمانیہ کے سیاسی ارتقا پر ان خیالات کا زیادہ اثر پڑا جو روما سے ماخوذ تھے۔

سلطنت کے بعد والے مغربی یورپ اور اس کی نو آبادیوں کے سیاسی ادارات کے دائرہ میں اپنی توجہ تمام تر محدود رکھوں۔ یہ حد بندی اس قدر تنگ نہیں ہے جیسے کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ سیاسیات کی غرض جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں پیش نظر رکھی جائے بلاشبہ سیاسی ادارات اپنے وسیع ترین معنوں میں کرۂ ارض کے کسی خاص حصہ یا انسان کی مختلف نسلوں میں سے کسی خاص نسل سے مخصوص نہیں ہیں۔ گو ایسی معاشرتیں یعنی گروہ میں رہنے والے آدمیوں کی جماعتیں موجود ہیں جن میں حاکم و محکوم کی تفریق بہت ہی مشکل سے نظر آتی ہے لیکن اس طرح کی معاشرتیں بنی نوع انسان کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ہیں۔ یہ تقریباً بالکل صحیح ہے کہ انسان ایک "سیاسی حیوان" اس معنی میں ہے کہ یا تو وہ حاکم ہے یا محکوم، یا کسی نہ کسی نظم حکومت کا مطیع ہے یا نظم حکومت نے خود اس سے ترکیب پائی ہے، لیکن ایک اور معنی یہ ہیں کہ اعلیٰ قسم کا سیاسی نشو و نما دراصل سفید نسل کے چند مخصوص حصوں میں جسکو ابتک نسل قفقازی کہتے ہیں شروع ہوا اور ابتک وہ ان میں محدود ہے۔ صرف اسی سفید نسل کے مخصوص حصوں نے تمدن[1] کے نشو و نما کے ساتھ حکومت کے وہ نظام پیدا کئے جنکے ارکان حکومت کرنے اور اطاعت کرنے کے (جیسی باری ہو) عادی ہیں، یعنی یہ کہ آیا (۱) حاکم بالا صرف ایک خاص مدت کے لئے شہریوں کی جانب سے منتخب ہوتا ہے اور پھر اپنے اختیارات اس کو چھوڑنے پڑتے ہیں اور ان اختیارات کو کام میں لانے کے متعلق اس سے باضابطہ طریقہ پر باز پرس ہو سکتی ہے۔ یا (۲) یہ کہ شہریوں کی ایک جماعت (کل یا اس کا کوئی حصہ) اعلیٰ حکومت بحیثیت مجموعی خود کرتی ہے جس کے لئے وہ وقتاً فوقتاً ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔

ادارات سیاسی کی تاریخ میں یہ سیاسی شکلیں ہمکو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہیں، نہ صرف اس حیثیت سے کہ ہم کسی مغربی یورپ کی سلطنت کے شہری ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ ہم سیاسیات کے متعلم ہیں۔ ان کی دلچسپی ہمارے لئے ایسی ہی ہے جیسے حیاتیات کے طالبعلم کے لئے حیات کے اعلیٰ ترین نمونوں کی۔ اس لئے میں اپنی توجہ

---

[1] یہ شرط ضروری ہے؛ کیونکہ اس قسم کے نظم حکومت کے ابتدائی مراحل "مسلح قوم کی مجلس" کی شکل میں ہم اس ابتدائی دستور سیاسی میں رکھتے ہیں جو کسی ایک نسل تک محدود نہیں ہے۔

صرف ان قوموں کی طرف مبذول رکھوں گا جنھوں نے نشو و نما کی قابلیت اپنے میں ظاہر کی ہے، اور ان میں سب سے زیادہ قابل وقعت اور نمایاں قومیں جن کا حال ہم جانتے ہیں یونان اور اہل روما اور مغربی یورپ کی قومیں ہیں۔ بنی نوع انسان کے مختلف حصوں میں یہ قومیں سب سے زیادہ نمایاں اس بات میں ہیں کہ ان میں نہ صرف سیاسی ادارات نے بلکہ سیاسی دستوروں اور دستوری خیالات اور نظریوں نے اس اعلیٰ ترین درجہ تک نشو و نما پایا ہے جہاں تک ان کا تمدن پہونچا ہے۔

فی الحقیقت ہم اپنی توجہ صرف دستوری حکومت تک محدود نہیں رکھ سکتے کیونکہ جس تغیر کو ہم تحقیق کر رہے ہیں اس میں تقریباً ابتدا سے لیکر انتہا تک ہمارے سامنے نظم حکومت کا وہ طرز متواتر پیش ہوتا رہے گا جسکو عام طور پر مطلق العنان بادشاہی کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ امر قابل غور ہے کہ اگر ہم نظم حکومت کے متعلق متمدن معاشرتوں کے واقعی تجربوں کا ایک سرسری معائنہ کریں اور اس معائنہ میں جہانتک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ زمانے اور زیادہ سے زیادہ ملکوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ تعداد کے اعتبار سے بنی نوع انسان کے سب سے بڑے حصہ پر جو نظم حکومت حاوی ہے وہ مطلق العنان بادشاہی ہے۔ لفظ مطلق العنان سے مراد یہ نہیں ہے کہ محکوم پر حاکم کے اختیارات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس طرح کے حاکم کو ہمیشہ اپنی رعایا کی ناراضی کا خوف لگا رہتا ہے، اس کی ہر وقت خواہش ہوتی ہے کہ رعایا کے دل میں اس کی قدر ہو، اس کے علاوہ انقلاب پیدا کرنے والے اسباب سے بھی اس کو خطرہ رہتا ہے۔ یہ خطرہ وہ ہے جس سے کوئی سیاسی معاشرت کبھی لاعلم نہیں رہی ہے۔ مذہب کا اثر بھی اس کی طبیعت پر رہتا ہے اور اس کو اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ اس کی رعایا پر بھی مذہب کا اثر موجود ہے۔ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں ایسے حاکم کے اختیارات پر بڑی روک یہ تھی کہ اور لوگوں کے مانند وہ بھی انسانی ارادے کے بجائے کسی الٰہی قوت کو قانون و رواج کا مبدا تصور کر کے ان چیزوں کو قطعی معین اور ناقابل رد و بدل سمجھتا تھا۔ ازمنۂ مابعد میں بادشاہ کے اختیارات میں بڑی روک اس طرح ہو گئی کہ قانون اور ذرائع انتظام حکومت ایک مہذب سلطنت میں ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ ان کی وجہ سے ایک بادشاہ کے لئے اپنے حسب مراد

کوئی تبدیلی (بغیر ایسے برے نتائج کے جنکو وہ نہ دیکھنا چاہتا ہو) پیدا کرنی سخت دشوار ہوگی۔ بہرحال بادشاہ کو مطلق العنان کہنے کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ایسے بادشاہ کی سلطنت میں کوئی دستوری اقتدار یعنی کوئی دوسرا انسانی اقتدار ایسا قایم نہیں ہوتا جسکی اطاعت وہاں کی رعایا عادتاً اپنے بادشاہ کی اطاعت کے مثل کرتی ہو اور جو جائز طریقہ پر بادشاہ کا مقابلہ یا اس سے بازپرس کرسکتا ہو۔

اس بات کا سمجھنا کہ اس قسم کی شاہی حکومتیں اس قدر کیوں عام ہیں، مشکل نہیں ہے کوئی حکومت خواہ اس کی ترکیب و ساخت کیسی ہی پیچیدہ ہو اگر عمدگی کے اعتبار سے اعلیٰ ترین حالت رکھتی ہے تو اس کے مختلف اجزا و اعضائے حکمرانی کے ارادوں اور افعال میں مثل ان احکام و حرکات کے جو ایک صاحب عقل واور اک کی فکر کا نتیجہ ہوں احدیت و مطابقت پائی جائے گی۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب سے سادہ طریقہ حکومت میں احدیت اور نظم و سلسلہ پیدا کرنے کا یہ ہے کہ جملہ امور سلطنت کا انتظام اخیر نوبت میں صرف ایک شخص کے سپرد کر دیا جائے جو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق عمل کرے۔ ایسے نظم حکومت کا مفید و کارگر ہونا جس میں اختیارات صرف ایک شخص کو دیدیئے گئے ہوں گزشتہ اور نیز موجودہ زمانہ کی بہت سی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے گو ان مثالوں میں مطلق العنانی بے قاعدہ طور ہی پر کیوں نہ ظاہر ہوتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ بڑی بڑی بادشاہیاں جو فتوحات کے ذریعہ سے قایم ہوئیں ان میں مفتوح کی اطاعت اس بنا پر نہیں ہوتی کہ نئے نظم حکومت سے اس کو فوائد حاصل ہوتے ہیں بلکہ اس اطاعت کا باعث ان فتحوں کا خوف ہوتا ہے جو مقابلہ اور سرکشی سے پیدا ہوسکتے ہیں، لیکن قوم فاتح کی اس عادت میں کہ وہ ایک ہی شخص کی مطیع رہے اس وجہ سے مضبوطی آجاتی ہے کہ غیر قوموں سے کشمکش کے وقت یہ چیز اس کے کاموں اور ارادوں میں ایک طرح کا زور، ربط و اتحاد پیدا کر دیتی ہے۔ اسی بنا پر تو اگلے زمانہ میں نہ صرف ان پرانے لڑنے والوں نے جن کا ذکر ایلیاڈ (Iliad) میں آیا ہے بلکہ دیگر قدیم نبرد آزماؤں نے بھی یہ کہا تھا کہ "بہت سے لوگوں کا حاکم ہونا اچھا نہیں۔ حاکم تو صرف ایک ہی آدمی ہونا چاہئے"۔ جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا تھا ہم کو یہ نہیں فرض کرنا چاہئے کہ جہاں اس قسم کی حکومت مستقل طور پر قائم ہے وہاں رعایا نے ہمیشہ صبر

کے ساتھ ان خرابیوں کو گوارا کر لیا جو ایک نااہل اور غیر ذمہ دار متنفس کے ہاتھ میں کل اختیارات دیدینے سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جہاں ایسی حکومت کے مقابلہ میں رعایا نے بغاوت میں کامیابی بھی حاصل کی تو اس نے طرز حکومت کو بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف یہ کیا کہ ایک آدمی سے پیچھا چھڑا کر دوسرے آدمی کو اس کی جگہ بٹھادیا۔

ادارات سیاسی کی عام تاریخ سے سفید نسل یا انسانی نسلوں کے بعض حصوں میں یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ تمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ کر انھوں نے ایک جدا طریقہ مطلق العنان حکومت کی خرابیوں سے بچنے کا قائم کیا جو زیادہ تر مصنوعی بھی تھا اور باقاعدہ بھی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ارادے اور عمل کے اس اتحاد کو قایم رکھنے کی کوشش کی جو حکومت کے کاموں کو معقول طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے اور یہی طریقہ وہ ہے جس کو ہم دستوری طریقہ کہتے ہیں۔

چونکہ یہ طریقہ پورے طور پر نشو و نما پاکر حکومت اور سیاسی اطاعت کی عادت کے متعلق مروجہ خیالات میں زیادہ پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے اس لئے مجبوراً ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا پورا نشو و نما صرف ایسی انسانی جماعتوں میں ہوتا ہوگا جنھوں نے تمدن میں کچھ ترقی کر لی ہے۔ لیکن تاریخ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ تمدن کی ترقی بہر نوع اپنے ابتدائی مدارج میں اس طریقہ کو برتنے کی طرف کوئی عام میلان نہیں رکھتی حقیقت میں یہ طریقہ جیسا کہ میں نے بیان کیا (زمانۂ حال سے کچھ پہلے تک) صرف سفید نسل میں خاص کر (گو تمام تر نہیں[1]) اقوام عالم کی "ہندی جرمانی" خاندان میں محدود تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان حدود کے اندر بھی اپنے نشو و نما کے لئے اس کو خاص طور پر خارجی وسائل کی ضرورت ہوئی۔

۴۔ "نسل" اور "خاندان اقوام" کے متعلق کسی قدر توضیح کی ضرورت ہے اولاً جب میں "سفید نسل" کہتا ہوں تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ ابتداً انسان کی چار پانچ مختلف نسلیں تھیں اور ان میں رنگ اور دوسری علامتوں سے تمیز کی جاتی تھی۔ مثلاً کوئی نسل سفید رنگ کی، کوئی بھورے رنگ کی، کوئی زرد اور کوئی سیاہ رنگ کی

[1] معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی قرطاجنۂ سامیہ کے نظام حکومت کو یونان میں بہت شہرت حاصل تھی۔

تھی۔ علم الانسان کے مطابق جو حالت اس وقت علم کی ہے نسلوں میں اس قسم کے فرق
ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور جو طبعی فرق فی الواقع نسلوں میں موجود ہیں وہ ان تفریقوں
سے جو عام طور پر (گورے، بھورے، پیلے اور کالے کے) مانے جاتے ہیں کہیں زیادہ
اور پیچیدہ ہیں اور ایک فرق دوسرے فرق میں رفتہ رفتہ متبدل ہوتا ہے اور چونکہ علم
حیوانات کی رو سے انسان کی تمام قسموں کی ایک ہی نوع ہے یعنی کوئی سی دو قسموں میں
شادی بیاہ سے ایسی اولاد پیدا ہو سکتی ہے جس میں خود صاحب اولاد ہونے کا مادّہ
ہے، اس لئے نسلوں کی جن طبعی تفریقوں کو تاریخ پیش کرتی ہے وہ بے انتہا وسعت
کے ساتھ نسلوں کے دو غلے ہو جانے سے پیدا ہوئی ہیں اس کی ایک خاص مثال ان
بڑی تفریقوں میں ملتی ہے جو شمالی یورپ کے سفید اور جنوبی یورپ اور ایشیا
کے بعض حصوں کے سیاہی مائل سفید باشندوں میں نظر آتی ہیں کیونکہ علم الانسان کے متعدد
ماہروں کا خیال ہے کہ جنوبی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں کی سیاہی مائل سفید نسل
غالباً سفید اور کسی سیاہ نسل کے میل سے پیدا ہوئی ہے لیکن یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ
نسلوں کے دو غلے ہو جانے سے جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ اس نسلی تفریق کی تردید کرتا ہے جو
لسانیات متقابلہ کی رو سے ہم آریا یا ہندی جرمانی اور سامی قوموں میں دکھاتے ہیں
اور اس سے نسل کے خیال کو عائد کرنے میں ایک اور شبہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ
اس طرح کہ مختلف انسانی جماعتوں کے لوگوں کو جو دماغی خصوصیات ایک کو دوسرے
سے تمیز کراتے ہیں ان میں سے ایسے خصوصیات کو جو معاشرت کے اثر سے پیدا ہوئے
ہیں اور ایسے خصوصیات کو جو نسلی وراثت کا نتیجہ ہیں جدا کر کے دکھانا مشکل ہو جاتا ہے
نتیجہ یہ ہے کہ لسانی قرابتیں نسلی قرابتوں کو ثابت کرنے کا کامل ذریعہ نہیں ہیں، پس
جب میں "ہندی جرمانی خاندان اقوام" کا ذکر کروں تو اس سے میری مراد یہ نہ سمجھنی
چاہئے کہ جو قومیں اس طرح ایک ہی مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں وہ طبعی طور پر ایک ہی
اصل رکھتی ہیں بلکہ میری مراد یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قدیم معاشرتی مجموعہ سے اس بنا
پر متعلق کی گئی ہیں کہ ان کی معاشی زندگی میں ایک سلسلہ نظر آتا ہے جسکا ثبوت زبان
اور کم از کم ایک حد تک نسلی تسلسل سے ملتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی بعض مخصوص امتیازات نسل میں طبعی حیثیت سے ایسے

ہیں جو تاریخ کے پورے سلسلے میں تقریبًا مستقل طور پر برقرار رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹائیلر صاحب[1] لکھتے ہیں کہ شہر تھیبز (Thebes) واقع مصر کی دیواروں پر رنگین تصویروں کو دیکھکر ہم بہت آسانی سے سرخی مائل بھورے رنگ کے مصریوں اور حبشیوں کو اس طرح پہچان سکتے ہیں جیسے کہ آج کل کے مصریوں اور حبشیوں کو پہچانیں۔ اسی طرح فلسطین کے یہودی الگ پہچانے جاتے ہیں جن کے چہرہ کا نقشہ اگر پہلو سے دیکھا جائے تو وہی ہے جو ابتک سامیوں کی شکل میں نظر آتا ہے اور جیسے سب جانتے ہیں یا اسی طرح موٹے ہونٹوں والے شیدی اور گورے رنگ کے باشندگان لیبیہ اس طرح پہچانے جاتے ہیں جیسے آجکل ان لوگوں کو کوئی پہچانے۔ ان مثالوں سے یہ بات پھر ہمارے ذہن میں آتی ہے کہ اگر تمدن کو اس کے وسیع ترین معنی میں لیا جائے تو اس پر سفید نسل کا تنہا اجارہ نہیں ہے۔ "عہد تاریخ کے آغاز میں تہذیب و تمدن کے پیش رو سانولے رنگ کے مصری اور بابلی تھے۔ ان دونوں کی زبانیں کسی ایسی معلوم زبان سے جو سفید رنگ والی قومیں بولتی ہوں تعلق نہیں رکھتی ہیں" اسی طرح زرد رنگ منغولی چینی "چار ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ سے ایک متمدن اور خواندہ قوم چلے آتے ہیں" جو تمدن بحر متوسط کے گرد شائع ہوا اس کے بانی سیاہی مائل سفید رنگ کی قومیں یعنی فینیقی، یونانی اور رومانی نہ تھے بلکہ وہ اس کو چلا رہے تھے باوجود اس کے شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کا سیاسی تمدن اور ایک "متمدن سلطنت" میں دستوری حکومت کو فروغ دینے کی قابلیت ابتدا سے سفید نسل کا متاع ہے اور بالخصوص سفید نسل کی ان شاخوں کا جو کوئی ہندی جرمانی زبان بولتی ہیں اور اس طرح ظاہر کرتی ہیں کہ جز ًا ایک ہی اصلی مجموعے سے ان کا نزول بہ تسلسل ہوا ہے۔

نسل پر غور کرنے کے بعد قدرتًا ہم کو موسم اور احوال خارجی پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ اب یہ خیال بالکل پارینہ ہو گیا ہے کہ انسانی نسلوں کا اختلاف انکی اصلوں کے جدا جدا ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے اب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کے ابتدائی نظام عضوی پر جو عمل بواسطہ یا بلاواسطہ احوال خارجی نے کیا ہے

[1] "انسانیات"۔ باب ۱

اس کے اثرات کا مجموعہ فی الواقع اختلاف نسل کا باعث ہوا ہے۔ پس خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہم کسی قدر غور اس بات پر کریں کہ موسم اور احوال خارجی نے سفید نسل کے بعض حصوں یا اس کی ہندی جرمانی شاخ پر کس حد تک اس قسم کا اثر کیا کہ اس کی طبیعت میں ایک مناسبت اعلیٰ سیاسیات کو ترقی دینے کی بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ پیدا ہوگئی۔ یقینی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی ترقی کے لئے منطقۂ معتدلہ زیادہ موافق و معاون ہے، کیونکہ شمالی ملکوں میں تنازع للبقا میں خاص مشکلیں ہمیشہ رہتی ہیں اور اس وجہ سے وہاں کی آبادی قلیل ہے جو ترقی تمدن کی روکنے والی ہے اور یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ منطقۂ حارہ کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکے جذبات آسانی سے مشتعل ہوجاتے ہیں اور (تا وقتیکہ طبیعی ضرورتیں مجبور نکریں) وہ کاہل اور آرام طلب ہوتے ہیں۔ اس طرح عقل و ہوشمندی، طبیعت میں ضبط، محنت و جفاکشی میں ثابت قدمی جن کی ضرورت دستوری حکومت میں ہوتی ہے منطقۂ معتدلہ میں اپنے نشو و نما کے لئے بہتر موقع رکھتی ہیں۔ دستوری حکومت نے گو منطقۂ معتدلہ میں نشو و نما پایا لیکن وہ ایسے ملکوں میں بھی جہاں کی وہ ایجاد نہیں ہے دیگر ایجادوں کی طرح جو خاص خاص مفید حالات میں انسان کی بہتری کے لئے عمل میں آتی ہیں شائع ہوگئی ہے لیکن دستوری حکومت کی تاریخ دریافت کرنے میں ملکوں کا موسم ہی ایسی حکومت کا بڑا خارجی سبب نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ میں ہم کو متواتر ایسی مثالیں ملتی ہیں جنمیں بنی نوع انسان کے بعض حصوں کا غیر معمولی سیاسی نشو و نما اس سرزمین کی غیر معمولی نوعیت یا تعلقات کے بنا پر ہوا ہے جس پر وہ آباد ہیں۔ چنانچہ عہد وسطیٰ اور زمانۂ حال کی تاریخ سے میں صرف وینس۔ سوئٹزرستان۔ ولندستان، انگلستان کے نام لینے کافی سمجھتا ہوں جو اس سیاسی نشو و نما کی مسلم مثالیں ذہن میں تازہ کردینگے اس زمرہ میں یونان کی مثال بھی کم وقعت نہیں ہے۔ صرف تاریخ یونان کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ملک یونان کی خاص قدرتی وضع یعنی اس کے پہاڑ جو قبیلوں کو جدا کرکے آزادی کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کے بحری راستے جو تجارت اور آمد و رفت کے لئے سودمند ہیں، متمدن دستوری حکومت کے ابتدائی طرزوں کے ارتقا کے لئے کیسی موزوں تھی، اور اس خیال کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ دوسرے

ملکوں میں جہاں قدرت نے زرخیز مسطح زمینوں پر بڑے بڑے دریا دوڑا کر وسائل آمد و رفت اور ذرائع نقل مال و انسان کو بغیر آزادی کی ترغیب دیئے ترقی دی اور اس طرح جہالت سے نکلکر تہذیب میں آنے کے لئے سہولتیں پیدا کردیں، وہاں تمدن کی ترقی محض مطلق العنان بادشاہیوں کے ذریعہ سے ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ محض شاہی طرز حکومت کا بکثرت رواج جو تاریخ تمدن کے ایک بڑے حصہ میں ہماری نظر سے گذر چکا ہے۔ وہ چیز ہے جو ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ یونان کی عجیب و غریب ترقی ایک حد تک اس کے خاص طبیعی حالات کا نتیجہ تھی۔ مصر و بابل۔ اشور و ایران کی بڑی بڑی سلطنتوں میں جن کی تاریخ یونان کی تاریخ سے یا تو بیشتر کی ہے یا ان کی ہم زمانہ ہے، بادشاہی ان معنوں میں جو اوپر بیان ہوئے بالکل مطلق العنان تھی۔ جس زمانہ سے کہ ہمارا تاریخی علم کچھ بھی شروع ہوتا ہے یہ بھی دریافت ہوتا ہے کہ افراد قوم کے جم غفیر کو "نظم حکومت سے بجز اس کے مطلق واسطہ نہ تھا کہ حکومت کی اطاعت کی جائے"، اور ماتحت والیان ملک کو کوئی دستوری استحقاق اس کا نہ تھا کہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف کچھ کرسکیں۔ جب کبھی اس قسم کا کوئی مقابلہ پیش آیا ہے تو وہ بغاوت یا ایک حد تک بدعملی سمجھا گیا ہے۔ بہرکیف اب ہم یہہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ جہاں تک تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے یہ سیاسی حالت (یعنی مطلق العنان شاہی) کوئی ابتدائی سیاسی حالت نہیں ہے اور میں آگے چلکر اس امر کے ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا کہ جس وقت خاندان ترقی کرکے سلطنت بنتا ہے تو سلطنت بنتے ہی اس میں شاہی حکومت کے قائم ہونے کو ایک قدرتی صورت سمجھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ بہرکیف سب سے ابتدائی سیاسی دستور جو ہم کو ان قوموں کی تاریخ میں نظر آتا ہے جس سے ہم کو یہاں بحث ہے وہ اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس قسم کا معلوم ہوتا ہے جس میں حالات سیاسی میں بمقابلہ شاہی حکومت کے زیادہ مساوات اور زیادہ شخصی آزادی ہی نہیں دریافت ہوتی ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے قبیلے میں جو لوگ لڑنے والے ہوتے تھے وہ متحد ہوکر دوسروں کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔

۵۔ لہٰذا یورپ میں سیاسی ادارات کی ترقی کا حال میں اس سیاسی دستور کے بیان سے شروع کرونگا جس کو فریمین نے قدیم[1] آریا یا ہندی جرمانی دستور لکھا ہے لیکن

---

[1] میں بعد یہ ظاہر کروں گا کہ لفظ "قدیم" سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دستور محض آریا یا ہندی جرمانی نسل کے ساتھ مخصوص ہے تاہم میں اس دستور کی ان شکلوں کی صرف جانچ کروں گا جن شکلوں میں ہندی جرمانی نسل کی شاخوں میں ازروئے تاریخ اس دستور کا ارتقا ہونا پایا جاتا ہے، اور یہی وہ شاخیں ہیں یعنی یونانی رومانی اور جرمانی قومیں جن سے ہم کو خاص طور پر بحث ہے۔ جب ہم جرمانیوں کے پرانے سے پرانے سیاسی ادارات کا جو ہم کو معلوم ہیں اور یونانیوں اور رومانیوں کے پرانے سے پرانے سیاسی ادارات کا جن کا علم ہم کو ہے باہمی مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں اختلاف نظر آتا ہے مگر میں باوجود اس اختلاف کے ان میں ایک مشابہت دکھاؤں گا اس کے بعد ان قوموں کے قدیم تاریخی حالات کے بام پر جن سے ہم کو خاص دلچسپی ہے کھڑے ہوکر میں پیچھے کی طرف نظر دوڑاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ اس سے بھی قدیم زمانے کے سیاسی ارتقا کا حال جیسا کچھ بھی غیر واضح اور قیاسی طور پر وہ معلوم ہوسکے دریافت کروں اور اس کوشش میں محققین سلف کے قیاسات اور ان قوموں کے علاوہ دوسری اقوام قدیم کے ابتدائی مدارج ترقی سے جو نتائج مستنبط ہوں ان کو بھی شامل کروں۔ اس طریقہ تحقیق سے ہم اس منزل کے اس قدر نزدیک پہونچ جائیں گے جس قدر نزدیک میری رائے میں ایک ہوشمند محقق کو اس پرانے مسئلہ کے حل کرنے میں کہ سیاسی معاشرت کی ابتدا کیونکر ہوئی پہونچ جانا چاہئے۔

لیکن جب ہم اپنے منہ زمانے کے بہتے دریا کی طرف پھیر دیں گے تو معلوم ہوگا کہ مختلف نظامہائے حکومت بمقابلہ "ملکی سلطنت" کے جو موجودہ یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑھکر نظام حکومت ہے بہت جلد "شہری سلطنت" کی شکل اختیار کررہے ہیں جو یونان قدیم کے زمانۂ اقبال مندی میں نظم حکومت کا سب سے بہتر نمونہ تھی۔ جہاں تک ہمارا ناتمام علم اجازت دیگا میں دکھاؤں گا کہ ابتدائی نظم حکومت جس میں صاف تمیز ہوتی ہے کہ اختیارات کی ایک خاص تقسیم مختلف نسبتوں سے تین اجزائے بسیط میں یعنی "بادشا، مجلس سرداران ماتحت اور آزاد لڑنے والوں کی جماعت میں کی گئی تھی، کیونکہ رفتہ رفتہ عدیدی طرز حکومت تک پہونچی، اور مختصر طور پر بتاؤں گا کہ یہ عدیدی طرز حکومت کس طرح مختلف سلطنتوں میں مختلف شکلیں اختیار کرنے اور مختلف حالتوں میں سے گزرنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ اس مرحلہ سے گزرکر میں

اس حکومت خودسری یا غیر دستوری مطلق العنانی کی جانچ کرونگا جس کا رواج ایک مدت کے لئے یونان کی سربرآوردہ سلطنتوں میں ایک حد تک اس وجہ سے ہوگیا تھا کہ عموم کی طرف سے قائم شدہ عدیدی حکومت کے خلاف تحریکیں پیدا ہوگئی تھیں اور جس کا شیوع یونان قدیم اور اطالیہ کے دور وسطی کی شہری سلطنت کے انکشاف میں ایک قابل غور خصوصیت ہے جو بلا غلط فہمی کے صاف نظر آتی ہے گو یہ طرز حکومت اکثر عدیدی طرز حکومت سے عارضی طور پر مغلوب ہوتا رہتا ہے اور خاتمہ دور کے قریب جبکہ پرانی قومی فوج کی جگہ تنخواہ پانے والی فوج لے لیتی ہے تو اس کو پھر غیر دستوری مطلق العنانی میں بدل جانے کا اکثر خطرہ پیش ہوجاتا ہے۔ ارسطو کے بیانات سے مدد لیکر میں ان تمام اسباب کی مختصر طور پر شرح کروں گا جنھوں نے یونان کی شہری سلطنت میں حکومت کے ان مختلف طرزوں میں سے کسی ایک یا دوسرے طرز کو پیدا کیا اور قایم رکھا اور دکھاؤں گا کہ خود ارسطو کے خیال میں اس کے مثالی طرز حکومت کے قریب تک پہونچنا کیسا نادر الوقوع تھا۔ یہ طرز حکومت وہ تھا جس میں ارکان حکومت ایسے لوگ قرار پائے تھے جو حکمرانی کی بہترین قابلیت رکھتے ہوں یعنی یہ طرز ایک حکومت اعیان اپنے صحیح معنوں میں ہو، اور میں دکھاؤں گا کہ اس معتدل دستوری عمومیت کو قائم رکھنا تک کیسا دشوار تھا جسکی ارسطو نے تعریف کی تھی کہ چوتھی صدی قبل مسیح کے آخری نصف حصے کی شہری سلطنت کے لئے وہ حکومت کا بہترین طرز تھا۔ بعد ازاں یونانی شہروں کا ان کی تاریخ کے سب سے بہتر و شاندار زمانہ میں ایک مستقل اتحاد قائم کرنے میں ناکام ہونے کا تذکرہ کیا جائیگا اور آخر میں، میں اپنی توجہ اس عجیب کامیابی کی طرف مبذول کرونگا جو وفاقیت نے باوجود مقدونیہ کی سیادت کے زمانہ میں نامساعد حالات پیش رہنے کے حاصل کی

اس کے بعد رومتہ الکبری کی جانب متوجہ ہوکر میں رومانی سیاسی ادارات کی ابتدائی خصوصیت و تبدیلیوں کو ان پر یونان کے مماثل و متشابہ حالات کی روشنی ڈالکر بیان کرونگا، اور شرح کروں گا اس عجیب لیکن کامیابی کے ساتھ عہد و پیمان میں جکڑے ہوئے دستور سلطنت کی ماہیت اور اسباب کی جو چوتھی صدی قبل مسیح کے طویل المدت فتنوں و فسادوں کے سیلاب سے زندہ ابھر آیا تھا۔ میں اس امر کی شرح کرنے میں بھی کوشش کروں گا کہ ایک جمعیت عوام جو از روئے دستور سیاسی

کامل الاقتدار تھی اور زمانہ مابعد میں اس کے دو ناموں میں سے خواہ مجلس قبائل سے موسوم رہی ہو یا مجلس سنتوریہ سے ہر صورت میں اس کا رجحان ہمیشہ اس طرف رہا تھا کہ اپنے نظام میں زیادہ عمومیت کی شان اختیار کرتی جائے پھر اس نے کیونکر گوارا کر لیا کہ جس زمانہ میں روما ملک اطالیہ اور بحر متوسط کے ارد گرد کے ملکوں کی تسخیر میں مصروف تھا ملکی معالات کے متعلق عملی اختیارات ایک اعیانی مجلس سینات کے ہاتھ میں رہنے دے۔ اس کے بعد میں یہ بھی بتاؤں گا کہ جس زمانہ میں تسخیر ممالک کا سلسلہ جاری تھا تو رومانی شہریت کی مسلسل توسیع نے جو ملک گیری میں اضافہ اور جذب دونوں کے باقاعدہ عمل کا نتیجہ تھی ایک بڑی سلطنت کو اس درجہ بڑھایا کہ اگر ارسطو زندہ ہوتا تو اس کو ایک حد سے گذری ہوئی اور غیر طبعی ترقی کہتا۔ یہاں تک کہ جب پہلی صدی قبل مسیح کے شروع میں اطالوی اتحادیوں سے جنگ ہوئی تو اس تصادم سے یہ بڑی شہری سلطنت آخر کار تمام اطالویوں کو جذب کر کے ایک ملکی سلطنت میں بدل گئی جسکی نمائندہ دار الملک کی کثیر خلقت غلط طور پر سمجھی گئی، اور جو شہنشاہی حکومت کے کاموں کے لئے ناقص طور پر منتظم ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں مختصر طور پر اس تبدیلی کی ماہیت بیان کروں گا جو جمہوریت کو شاہی کی شکل اختیار کرنے میں بڑی تکلیفوں اور خونریزیوں کے ساتھ پیش آئی۔ پہلے اس شاہی نے جمہوریت کے بھیس میں اپنے تئیں چھپائے رکھا اور جمہوری ادارات کے ذریعہ کارپرداز رہی یہاں تک کہ کاراکالا کے عہد میں رومانی شہری اور رومانی رعیت کا فرق مٹ گیا اور دیوک لیشیان کے دور میں تو شہنشاہی اپنے منہ سے نقاب ہٹا کر بالکل ہی مطلق العنان حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

پھر اس مقام سے یونانی رومانی تمدن کی سابقہ تاریخ پر نظر کرتے ہوئے میں نظم حکومت کے منصبی فرایض کے عام خیال کی کہ کس طرح اس کا نشو و نما ہوا اور بالخصوص قانون اور نظم حکومت کے باہمی تعلق کی جانچ دو حیثیتوں سے کروں گا یعنی جس طرح کہ متقدمین نے اس کو سوچا تھا اور جس طرح یونانی رومانی نظام حکومت کے واقعات میں اس کا عملاً ظہور ہوا۔

اس کے بعد مغربی شہنشاہی کے ویرانہ سے گزرتا ہوا میں ان تبدیلیوں کو بیان کروں گا جو ٹیوٹانی قوم کی سیاسی ترکیب کے متعلق اس جد و جہد میں پیش آئیں کہ

پانچویں صدی عیسوی کی پیچیدہ و پراگندہ نیم غیر رومانی وحشی بادشاہیوں کی سخت ضروریات کو کس طرح مہیا کیا جائے۔ میں دکھاؤں گا کہ ٹیوٹانی اور شہنشاہی اور مسیحی ادارات کیونکر متحد اور آمیز ہو گئے۔ یہاں تک کہ مغربی یورپ کے اس حصہ میں جہاں بدعملی کی نوبت قطعی زیادتی تک پہونچنے کی تھی معاشرت نے رفتہ رفتہ پھر اپنی ایک ترکیب ایک ناتکمل نظام کی مدد سے قایم کی جسکو ہم نظام جاگیری کہتے ہیں۔ میں یہ بھی بیان کروں گا کہ مسیحی کلیسانے جو عقل و دانش میں دوسروں پر فضیلت رکھنے کے باعث بہت زور رکھتا تھا اور جس نے ایک زیادہ مستحکم جماعتی زندگی ان قوتوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر کے حاصل کرلی تھی جو کلیسا کے اندر اور کلیسا کے باہر تفرقہ ڈالنے والی تھیں، (کیونکر یورپ کو کلیسائی حکومت کے تحت میں لانے کی ایک زبردست کوشش کی)، اور میں یہ بھی بیان کروں گا کہ اس طرح مذہبی قسم کی حکومت نے (جس کی بابت ارسطو کچھ بھی نہیں جانتا ہے) سیاسی ارتقا کے اس طریقہ عمل میں جس کا علم تاریخ سے ہوتا ہے اور جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہے پہلی بار ظہور کیا۔ میں یہ بھی ظاہر کروں گا کہ دنیاوی طبقہ میں "شہر" اور "ملک" میں تمیز کرنے کی سیاسی اہمیت عہد وسطی کی قوم میں، جوں جوں وہ تمدن و تہذیب میں ترقی کرتی ہے کیونکر زیادہ ہوتی جاتی ہے، اور میں قدیم یونان کی شہری سلطنت سے جس کا دارومدار غلاموں کی محنت و مشقت پر تھا عہد وسطی کی صنعت و حرفت والی شہری جماعت کا مقابلہ کروں گا جو جرمانیہ اور اطالیہ میں عملاً آزاد ہو گئی تھی، جسمیں آلات سے کام کرنے والے پہلے آزادی اور پھر عزت اور اختیارات کے درجہ کو پہونچے۔

پھر میں بتاؤں گا کہ نظام جاگیری نے جو ناتکمل ربط و تعلق افراد میں پیدا کیا تھا اس سے آج کل کی قوم میں زیادہ اتحاد کا نشو و نما رفتہ رفتہ کیونکر ہوا۔ اس زیادہ اتحاد نے شاہی طرز حکومت کے اقتدار و اقبال میں کہ وہ قومی یکجہتی و تنظیم کا سرچشمہ اور ذریعہ ہے اضافہ کیا اور قوم کے مختلف طبقوں کی مجلسیں پیدا کر دیں جو ایک زمانہ میں معلوم ہوتا تھا کہ ضرور ترقی کر کے مستقل طور پر دستوری نظم حکومت کے اعضا بن جائے گی۔ پھر ہم کو یہ دیکھنا ہو گا کہ قوم کے مختلف طبقے جن سے یہ

مجلسیں بنی تھیں ان کے نفاذ نے جو کسی طرح رفع نہ ہو سکتا تھا ان تمام اچھے توقعات کو کس طرح خاک میں ملا دیا، یہاں تک کہ مغربی یورپ کے ایک بڑے حصہ پر خالص شاہی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ یہی شکل ایک متمدن اور باقرینہ ملکی سلطنت کے حق میں سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ہم ان غیر معمولی حالات کا بھی اندازہ کریں گے جنھوں نے ولندستان اور سوئیزرستان کی چھوٹی مگر باوقعت قوموں میں وفاقی اور جمہوری ادارات پیدا کر کے ان کو سرسبز رکھا۔

اس مقام تک پہونچنے پر میرا قصد یہ ہوگا کہ سیاسی واقعات کی سرزمین سے گزرتا ہوا سیاسی خیال کے میدان میں آؤں اور اسی سیاسی خیال کے سلسلے کو مختصر طور پر رومانی مقننوں سے شروع کر کے بتاؤں کہ رفتہ رفتہ اس نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے خاتمہ کے قریب عام سیاسی حریت اور مساوات کا مطالبہ کس جوش و خروش کے ساتھ پیدا کر دیا اور باوجودیکہ فرانس میں اس مطالبہ کی پہلی کوشش کے بعد طبیعتیں اس سے پھر گئیں لیکن ابتک وہی سیاسی خیال ایک بڑا جزو اس سلسلۂ تغیر کا ہے جس کا تعلق زیادہ تر انیسویں صدی سے ہے اور جو تمام مغربی یورپ میں موجودہ دستوری سلطنت کا بانی ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں اس تغیر عظیم کے دوسرے بڑے جزو پر غور کرنے کے لئے آپ سے درخواست کرونگا یعنی آپ سے کہوں گا کہ دستوری حکومت کے اس مسلسل اور سرسبز نشو و نما پر غور کیجیے جس کی مثال پیش کرنے کا حق مغربی یورپ کی تمام بڑی سلطنتوں میں صرف انگلستان کو نصیب ہوا ہے۔ میں فرایض حکومت کے متعلق نظریہ انفرادیت کی ابتدا پر بھی غور کرونگا جو اٹھارھویں صدی میں ہوئی اس نظریہ میں جب ان قدرتی طریقوں کا حل بھی شامل کر دیا جاتا ہے جو پیدا وار تقسیم اور تبادلۂ دولت کے متعلق ہیں تو ان سے بالتخصیص زمانہ حال کے وہ تمام قواعد اور اصول مراد ہوتے ہیں جس کا مجموعی نام معاشیات ہے۔

پھر میں مغربی براعظم (یعنی امریکہ) کی طرف متوجہ ہو کر مختصر طور پر اس نظم حکومت کے خصوصیات بیان کروں گا جو نوآبادیوں کی آزادی نے وہاں پیدا کی ہیں اور جو یورپ کے نظم حکومت سے بعض بڑی باتوں میں فرق رکھتا ہے اور میں اس وفاقی نظام کی ماہیت اور عمل پر غور کروں گا جس کی بنا پر شمالی امریکہ

کی بڑی انگریزی نوآبادی نے صد سالہ حریت کی زندگی کے ساتھ ایک ایسے ملک میں جو مغربی یورپ سے رقبہ میں زیادہ ہے جمہوری انتظام قائم کر رکھا ہے۔ آخر میں تمدن یورپ کی پوری تاریخ پر ایک نظر ڈالکر میں غور کروں گا کہ اس کی آیندہ ترقی کی نسبت معقول طریقہ سے کیا پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

میرے اس کل بیان سے شاید یہ خیال گزرے کہ یہ سب تو تاریخ کے ایک ضخیم حصہ کو کوزہ میں بند کرنا ہو جائے گا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کو تاریخی سوانح سے بحیثیت فن تاریخ واسطہ نہ ہوگا، بلکہ ان عام واقعات سے واسطہ ہوگا جن کی مثالیں تاریخی سوانح سے دی جاسکتی ہیں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہم کو تاریخ کے اس حصہ سے جس میں لوگوں کی ذاتیات یا دنیا کے اور تماشے بیان ہوئے ہیں، یعنی مدبران ملکی اور امرائے لشکر کے کارنامے۔ بادشاہوں کی شادیاں، بڑی بڑی لڑائیاں، ہم کو ان سب سے کچھ بحث نہوگی اور یہی نہیں بلکہ ہم کو اکثر کسی خاص قوم کے سیاسی ارتقا سے بھی اس حد سے زیادہ تعلق نہوگا کہ عام اسباب ورجحانات پر وہ روشنی ڈال سکتا ہے۔ جن چیزوں سے ہم کو واقعی بحث ہے وہ سیاسی معاشرت کا ایک عام نمونہ ہے جسکی مثالیں چند معاشرتیں اپنی اپنی ترقی کے ایک خاص موقع پر پیش کرتی ہیں اور اس نمونہ کے طرز وساخت کے بڑی خصوصیات ہیں اور تغیرات ہیں جو ان میں ہوتے رہے ہیں اور ان تغیرات کے اسباب ہیں۔

۶۔ اس موقع پر اس بات کو سمجھ لینا بھی مناسب ہوگا کہ ملکوں کے سیاسی نشو ونما پر غور کرکے ان سے عام نتائج نکالنے میں ایک سبب ایسا بھی ہے جو اس کام میں حارج ہوتا ہے اور جس کا لحاظ رکھنا ضروریات سے ہے۔ یہ سبب حارج کسی دوسرے نظام سیاسی کی نقل آتار لینا ہے۔

مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دستوری شاہی کی شکل میں موجودہ یورپ کا پارلیمنٹی نظم حکومت جو اطالیہ۔ بلجیم۔ اسپین اور اسکانڈی نے دیا کی سلطنتوں میں رائج ہے اور ان ملکوں میں سے ہر ایک ملک کے سیاسی نشو ونما کے متشابہ رجحانات کا نتیجہ بلا امداد غیر ہے یہ بات ایک ایسے طالب علم پر بھی جو تاریخ کو بالکل سرسری نظر سے پڑھتا

ہے روشن ہے کہ ان مختلف ملکوں کے طرز حکومت میں جو مشابہت اس وقت موجود ہے اس کا باعث زیادہ تر یہ ہے کہ ان سب نے بواسطہ یا بلا واسطہ انگلستان کی نقل اتاری ہے، اور انگلستان کا موجودہ طرز حکومت فی نفسہٖ پارلیمنٹی ادارات کے اس مسلسل نشو ونما کا نتیجہ ہے جو دور وسطیٰ سے لیکر اس وقت تک ہوتا رہا ہے اور جو یورپ کی تاریخ میں اگر بالکل نہیں تو تقریباً بے مثال ہے۔ جب اس تقلید یا نقل اتارنے کے مضمون کو ذہن میں رکھکر ہم تاریخ کے پرانے زمانوں کے حالات پڑھتے ہیں تو ہم کو ایسی سلطنتوں میں جن میں ہمیشہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا تھا جیسے کہ یونان کی اکثر شہری سلطنتیں تھیں کسی خاص نظم حکومت کے اسباب شیوع پر اس کے کسی خاص زمانۂ ارتقا میں غور کرتے وقت اس تقلید یا نقل اتار لینے کا بھی پورا لحاظ کرنا ضروری ہو جاتا ہے[1]۔

اس قسم کی نقل یا تتبع کا اگر کوئی ثبوت نہ بھی مل سکے تو بھی ہم کو اس کا پورا لحاظ کرنے کے لئے بہت گنجایش رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی نقل یا تتبع کا اثر ان عام نتایج کی قدر و قیمت کو قطعی زائل نہیں کر دیتا جنکو ہم مختلف سلطنتوں کے سیاسی ادارات میں مقابلہ کرنے سے حاصل کرتے ہیں، کیونکہ محض اس واقعہ سے کہ نظام حکومت کا ایک مخصوص طرز، نقل یا تتبع کے ذریعہ سے رواج پاتا ہے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جن سلطنتوں نے اس کو اختیار کیا ان میں ایسے ہی ایک نظم حکومت کے اختیار کرنے کی طرف شدت سے رجحان موجود تھا، یعنی یہ کہ ان مختلف ملکوں میں تغیر کے لئے ہم شکل ضروریات اور خواہشات چند مخصوص اسباب عامہ کی بنا پر شدت سے محسوس ہو رہی تھیں گو جس خاص طرز کو اختیار کیا گیا اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اس سلطنت واحد میں جو نقل کے لئے نمونہ پیش کرتی ہے پہلے عمل میں آچکا تھا۔ پس یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ اگر انگلستان کی تاریخ میں نیابتی ادارات کی رفتہ رفتہ ترقی کا بے مثل واقعہ جو اس کو دوسروں میں فی الواقع ممتاز کرتا ہے نہ بھی پیش آیا ہوتا تو بھی انیسویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کی سلطنتیں بالعموم عمومیت کے طرز حکومت کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتیں اور یہ فرض کرنا قرین قیاس ہوگا کہ مغربی یورپ کی ان سلطنتوں میں ایک مجلس مقننہ کلاً یا جزاً نیابتی اصول پر قائم

---

[1] فریمین نے بھی اپنی تصنیف "سیاسیات متقابلہ" میں تقلید کے اس پریشان کن اثر پر توجہ دلائی ہے۔

ہوجاتی کیونکہ تمام افراد قوم سے نظم حکومت کا مرتب کیا جانا ایسی وسیع سلطنتوں میں جیسے کہ فرانس اور اسپین کی تھیں سخت دشواریوں سے مملو تھا۔ نیز یہ وجہ بھی تھی کہ سوائے اطالیہ کے تمام مغربی یورپ کے ملکوں میں دور وسطیٰ کی نیابتی مجلسیں جن کے ارکان قوم کے مختلف طبقات کے لوگ ہوئے تھے موجود تھیں اور یہ انگریزی پارلیمنٹ سے کم وبیش مشابہ تھیں۔ جن اسباب نے دور وسطیٰ کی ان مجلسوں کو قائم کیا تھا وہ ہم آگے چلکر بتائیں گے، لیکن بلا تامل یہ کہدینا کہ نقل اتارنے کے لئے اگر برطانوی دستور موجود نہ ہوتا تو بھی مغربی یورپ کی سلطنتوں میں دو ایوانی مجالس مقننہ بالعموم قائم ہوجاتیں درست نہیں مثلاً ایک ایسے ملک میں جیسا کہ فرانس ہے اگر وہاں کے سیاسی دستور کے بنانے والے آجکل کے خیالات سے متاثر ہوتے تو وہ آسانی سے سمجھ جاتے کہ اختیارات مقننہ عاملہ اور عدیدیہ کی کامل علیحدگی اور توازن سے نظم حکومت اعلیٰ میں اتنی پیچیدگی پیدا ہوچکی ہے کہ زیادہ پیچیدگیاں پیدا کرنے کے لئے دو ایوانی مجلس مقننہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا دوسری مثال لیجئے۔ مثلاً ایسے ملکوں میں جہاں پرانے ادارات اس طرح نہیں مٹائے گئے جیسے کہ فرانس میں پیش آیا تھا وہاں دور وسطیٰ کی تقسیم طبقات پھر زندہ کردی جاتی جن سے پارلیمنٹ کی تقسیم (بجائے دو کے) تین نہیں بلکہ چار ایوانوں میں ہوسکتی تھی۔ جیسا کہ ملک سویڈن میں واقعی پیش آیا۔ یہاں چار طبقے یعنی شرفا۔ پادری۔ تاجر اور کاشتکار سنہ ۱۸۱۰ء سے سنہ ۱۸۶۶ء تک اکثر مقاصد کے لئے جدا جدا مشورہ کرتے رہے۔

علاوہ بریں ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی یورپ کی اگر سب نہیں تو بعض سلطنتوں نے ایک قسم کی حکومت اپنے یہاں جاری کی ہے جس کا نام بیجہٹ نے حکومت کابینی رکھا ہے۔ اس طرز کی حکومت میں جماعت مقننہ کی ایک ذیلی کمیٹی کو سب سے اعلیٰ اختیارات انتظامی حاصل ہوتے ہیں لیکن اس کا وجود وعدم مجلس نائبین کی کثرت رائے پر منحصر ہے کہ جب چاہے وہ اس ذیلی مجلس کو باعانت کثرت رائے انتخاب کنندگان برطرف کردے۔ پس اس کابینی حکومت کے بارے میں اس امر کے فرض کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس کا وجود میں آنا انگریزی نمونہ کے اثر سے علیحدہ ہے یعنی وہ انگلستان کی کابینی حکومت کی نقل نہیں ہے۔

سیاسی ادارات کے نشو و نما میں نقل اتارنا، قطع نظر نقل اتارنے کے اس رجحان پر بھی دلالت کرتا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز مثل اس نمونہ کے جسکی نقل اتاری جاتی ہے پیدا کی جائے یا کم از کم ایسے حالات پیدا کئے جائیں جو اس نمونہ کو قائم رکھنے کے لئے موافق ہوں۔ اس خیال کی مثالیں میں تاریخ یونان کی دو قوی سلطنتوں کو مقابلہ کر کے پیش کروں گا۔ ان میں ایک مثال تو ایسی ہے جس میں نقل اتارنے کی کوشش پائی جاتی ہے جس کو مثال سلبی کہنا چاہئے اور دوسری مثال ایسی ہے جس میں یہ کوشش نہیں پائی جاتی جس کو مثال ایجابی کہنا چاہئے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ یونان میں ڈیڑھ صدی تک جس کے حالات سب سے زیادہ معلوم اور جس کے واقعات نہایت تاباں اور درخشاں ہیں یعنی ۴۸۰ ق م میں ایران کی پسپائی سے ۳۲۶ ق م میں مقدونیہ سے مغلوب ہو جانے کے زمانہ تک ایتھنز اور اسپارٹا یونان کی دو بڑی سر بر آوردہ سلطنتیں تھیں، اور ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں عدیدیت اور عمومیت کے اصول کے متعلق جو نزاع یونان کی دیگر شہری سلطنتوں میں برپا رہی اس میں عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایتھنز عمومیت کا اور اسپارٹا عدیدیت کا طرفدار تھا۔ ارسطو فی الواقع شکایت کرتا ہے کہ یہ دونوں سلطنتیں ایسی دوسری سلطنتوں میں جو ان کے زیر اثر تھیں اپنے اقتدار کو کام میں لاکر عدیدی یا عمومی طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتی تھیں جس سے مدعا یہ نہ تھا کہ یہ طرز حکومت فی الواقع ان سلطنتوں کے حق میں مفید تھا بلکہ صرف اپنی شہنشاہی کے فوائد کے خیال سے ایسا کرتی تھیں[۱]۔ پس بالعموم یونان کی شہری سلطنتوں میں عمومیت کے نشو و نمائے تدریجی حالات معلوم کرنے میں ہمارا میلان اس طرف ہوگا کہ ایتھنز کی نقل اتارنے کو ایک اصلی محرک بدرجۂ غالب اس نشو و نما کا سمجھیں، گو ہم کو مفصل کیفیت اس قدر معلوم نہیں ہے کہ اس نقل و تتبع نے جس حد تک عمل کیا تھا اس کو ٹھیک ٹھیک بتا سکیں، لیکن ظاہر ہے کہ اسپارٹا کی نقل اتارنے کے لئے غالباً کسی نے کوشش نہیں کی اور یہ میرے خیال کی جو اوپر بیان ہوا ایجابی مثال ہے۔ کیونکہ (جیسا کہ ہم آیندہ دیکھینگے) گو بلحاظ اپنی حکمت عملی کے

[۱] سیاسیات ۶ (۴) ۲، ۱۰

اسپارٹا دوسری سلطنتوں میں عدیدیت کے قائم کئے جانے کا طرفدار تھا گر خود اس کا نظم حکومت متقدمین کے خیال میں ایسا نہ تھا جس کو عدیدیت کے زمرہ میں شمار کیا جاتا گو عدیدیت کے اجزا اس میں موجود تھے، اور یہ امر اور بھی قابل حیرت اس وجہ سے ہو جاتا ہے کہ مثالی نظم حکومت جس کو سیاست کے بڑے بڑے عالی خیال لوگوں نے انسان کی خیر و سلامتی کے جملہ شرائط کا جو ان کی سمجھ میں آئے لحاظ کر کے بنایا تھا وہ بہ نسبت ایتھنز کی نظم حکومت کے زیادہ مشابہت رکھتا تھا یعنی یہ کہ افلاطون کی سب سے آخر تصنیف کے مطابق اس کی مثالی نظم حکومت میں اور ارسطو کی مثالی نظم حکومت میں شہری فی الواقع ایک ایسی انسانی جماعت تھے جو صنعت و حرفت کے کاموں سے بڑی صراحت کے ساتھ قطعی مستثنیٰ کر دئے گئے تھے ان کی بسر اوقات ایسی زمینوں کی پیداوار پر رکھی گئی تھی جنکی کاشت غلاموں کے ذمہ تھی اور خود ان کو بڑی توجہ کے ساتھ فوجی کاموں کے لئے تربیت دی جاتی تھی جیسا کہ اسپارٹا میں قاعدہ تھا لیکن باوجود اسپارٹا کی اقبالمندی کے جو اس کو عالم واقعات میں حاصل تھی اور باوجود افلاطون اور ارسطو کے اثر کے جو عالم خیال میں وہ رکھتے تھے کسی قسم کا میلان اسپارٹا کے طرز حکومت کو نقل کرنے کا یا ان حکما کے مثالی نظم حکومت کو حیطۂ عمل میں لانے کا دریافت نہیں ہوتا۔ یہ عجب شہادت اس امر کی ہے کہ نقل صرف اس حالت میں اتاری جاسکتی ہے جبکہ وہ نمونہ جس کی نقل اتاری جائے نقل اتارنے والی سلطنتوں میں ان کے سیاسی نشو و نما کے عام رجحانات سے مطابقت رکھتا ہو۔

باوجود اس کے یہ بات صحیح ہی رہتی ہے اور عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس حالت میں چند سلطنتوں میں ان کے طرز حکومت میں تبدیلی کی بڑی محرک نقل رہی ہو تو یہ بتانا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس تبدیلی میں جو چیزیں تبدیل ہوئی ہیں وہ کس حد تک اس نظم حکومت کے خاص نشو و نما کے باعث ہوئی ہیں جس کی نقل اتاری گئی ہے خلاصہ یہ کہ نقل اتارنا وہ چیز نہیں ہے جس سے سب باتوں کی صراحت ہو جائے لیکن پھر بھی اس سے بہت سی باتوں کی صراحت ہو جاتی ہے۔ جب یہ صورت ہے تو پھر سیاسی نشو و نما کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش میں یہ چیز بڑی بادقعت ہے کہ ایسے متشابہ نظمہائے حکومت کا باہمی مقابلہ کر کے جن میں مشابہتیں از روئے عقل تتبع یا نقل کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں جس قدر معلومات حاصل کرنی ممکن ہو حاصل کی جائے

غرض یہ ہے کہ اس مقابلہ کو زیادہ نمودار کیا جائے اور یہی مقابلہ وہ چیز ہے جو میری کتاب کا موضوع قائم کرتا ہے۔ کیونکہ یورپ کی تاریخ اپنے دور فریدمیں سیاسی نشوونما کے بہت سے مختلف سلسلے ایسے دکھاتی ہے جن میں ایک حد تک جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مشابہت موجود ہے اور اس وجہ سے مقابلہ کے لئے وہ بہت سامان پیش کرتی ہیں درآنحالیکہ ایک بڑی حد تک ان میں ہر ایک کا نشوونما بذات خود ہوا ہے۔ پہلے ہم کو قدیم شہری سلطنتوں کے نشوونما میں اور پھر مغربی یورپ کی سلطنت کے نشوونما میں باہمی مقابلہ کرنا ہوگا لیکن رومانی نظم حکومت اپنے تفصیلی حالات میں یونانی نظم حکومت کے نشوونما سے اس قدر مختلف ہے کہ اس کے اسباب بیان کرنے میں ہم کو یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ رومانی نظم حکومت نے ایک بڑی حد تک یونانی نظم حکومت کی براہ راست نقل آتاری ہے لیکن نقل کے مسئلہ کو قطعی نظرانداز بھی نہ کرنا چاہئے۔ بہرکیف یونانی شہری سلطنت اور رومانی شہری سلطنت کی نسبت سمجھنا چاہئے کہ ان میں ہر ایک کا نشوونما تقریباً بذات خود علٰحدہ علٰحدہ ہوا ہے اسیطرح موجودہ ملکی سلطنت کی ترقی کا ایک تیسرا سلسلہ ہے اور ایک چوتھا سلسلہ دور وسطیٰ کے شہروں کے نشوونما میں ملتا ہے جس کا میں پہلے تذکرہ کرچکا ہوں۔

یہ بات دیکھنے کی ہے کہ سیاسی دستور کے ان بدلتے ہوئے نمونوں کے چار مختلف سلسلوں میں تین سلسلے اس درجہ آپس میں تعلق رکھتے ہیں کہ ان سب کی تاریخ ایک ہی تاریخ معلوم ہوتی ہے، اور اس میں شروع کے مراحل اخیر کے مراحل سے سبب ومسبب کا تعلق رکھتے ہیں۔ روما کی ابتدائی سیاسی ترکیب سے لیکر رومائی شہنشاہی تک اور اس شہنشاہی سے دور وسطیٰ کی جزوی بے ترکیب حکومتوں تک جس میں دور وسطیٰ کے جزوی آزاد شہروں کا نشوونما ہوا اور ان سے حال کی یورپی سلطنتوں تک ایک ایسی مسلسل ترقی کا پتا چلتا ہے جس میں کہیں کوئی دقعہ بجز اس کے کہ کہیں کوئی بات مجبوراً پیش آئی ہو نہیں پایا جاتا۔ اس حد تک قدیم اور جدید تاریخ کے متعلق مجھکو فریمین سے اتفاق ہے لیکن تاریخ یونان کی فی الواقع یہ کیفیت نہیں ہے۔ تاہم تاریخ یونان نے روما اور آمجتل کی تاریخ پر بڑا اثر کیا گویہ اثر سیاسیات میں یا دیگر اصناف علم میں زیادہ تر انسان کے خیال پر پڑا۔ سیاسی خیالات کے فراہم کردینے میں اس اثر نے اپنا زور دکھایا۔ سیاسی ادارات یا عادات فی الواقع دوسروں کو نہیں دیں۔

اس کے ساتھ ہی سیاسی خیالات پر تاریخ یونان کا اثر ہی وہ چیز نہیں ہے جس کی بنا پر یونانی شہری سلطنت کا نشو و نما ارتقا کے دوسرے سلسلوں میں جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ایک لازمی جگہ رکھتا ہو۔ میری کتاب کے موضوع کا ضروری حصہ یہ ہے کہ ان تمام شکلوں کو مطالعہ کیا جائے جن میں سے گزرنے کا میلان سلطنت کے اس نمونے نے ظاہر کیا ہے جسکو میں شہری سلطنت کہتا ہوں۔ اگر ہم متمدن دستور کی اعلیٰ ترین شکلوں پر اپنی توجہ قطعاً مرکوز کر دیں تو یہی نمونہ نہ صرف وقت کی ترتیب کے لحاظ سے بلکہ اُن وجوہ کی بنا پر جن کو میں آیندہ بیان کروں گا سیاسی نشو و نما کی ترتیب میں سب سے مقدم ہے پس اگر اس نمونہ کا مطالعہ مقصود ہے تو بہر لازمی ہے کہ یونان کی تاریخ میں اس کو مطالعہ کیا جائے۔ روما کا سیاسی نشو و نما بہت سی مخصوص وجوہ سے ایسا ہے کہ جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ یہی ایک مقدمہ ایسا ہے جس میں شہری سلطنت بڑھتے بڑھتے ایک شہنشاہی ملکی سلطنت ہو گئی، اور دور وسطیٰ کے شہر اطالیہ میں بھی جہاں وہ تقریباً آزاد تھے کامل طور پر آزاد انہ رہے۔

۱۔ اوپر کے مختصر تبصرے میں، میں نے کبھی "سیاسی معاشرت" کا کبھی سلطنت کا اور کبھی "قوم" کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ آگے کچھ لکھا جائے مناسب ہے کہ ان اصطلاحات کے معنوں اور ان کے آپس کے تعلقات کی جانچ زیادہ احتیاط کے ساتھ کر لی جائے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، میں "سلطنت"، اور "سیاسی معاشرت" کی اصطلاحوں کو بالعموم اس طرح استعمال کرتا ہوں کہ ایک کی جگہ دوسری بلا تکلف لکھی جا سکے مگر اتنا فرق ضرور کرتا ہوں کہ "سلطنت"، کی اصطلاح کو صرف ان معاشرتوں تک محدود رکھتا ہوں جو سیاسی تمدن میں ایک خاص درجہ تک ترقی کر چکی ہیں۔ لیکن ہم کو اس بات پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ بعض وقت "سلطنت"، کی اصطلاح اس سے بھی زیادہ تنگ معنی میں استعمال کی جاتی ہے یعنی اس سے مراد ایک سیاسی معاشرت ہوتی ہے جسکو ماہرین اصول قانون اپنی اصطلاح میں "مصنوعی شخصیت" کہتے ہیں اور اس حیثیت سے اس "مصنوعی شخصیت" کے حقوق و فرائض ان افراد کے حقوق و فرائض سے قابل امتیاز ہوتے ہیں جن سے یہ "مصنوعی شخصیت" بنی ہے۔ جہاں کہیں کسی ابہام کا خطرہ نہو گا میں اپنے تئیں اجازت دوں گا کہ لفظ سلطنت کو اس زیادہ تنگ معنی میں بلغیر زیادہ توجیہ کے استعمال کروں

اور میں خیال کرتا ہوں کہ ہم کو اس درجۂ تمدن کی بھی تعریف کردینی چاہئے جس تک
پہونچنے کے بعد سیاسی معاشرت اس خاصیت کے ساتھ سلطنت کہلائی جاسکتی ہے کہ وہ
اس اساسی امتیاز سے بخوبی آشنا ہوچکی ہے جو جماعت کے حقوق و فرائض میں بحیثیت ایک
مجموعہ ہونے کے اور ان افراد کے حقوق و فرائض میں جن سے یہ جماعت بنی ہے موجود ہے
انگریزوں کے جرمانی آبا و اجداد کی پرانی قبیلی حالت میں اور دوسری غیر متمدن اور نیم متمدن
قوموں میں یہ امتیاز ابتک غیر واضح ہے۔

علاوہ اس کے سلطنت کا جو معمولی تصور ہمارے ذہن میں ہے اس میں یہ
بات شامل ہے کہ جس سیاسی معاشرت کو سلطنت کہا جاتا ہے وہ روئے زمین کے کسی
خاص حصے سے وابستہ ہے۔ اور اس بنا پر اس کو اس بات کا دعوی ہوتا ہے جس کو بالعموم
سب تسلیم کرتے ہیں کہ روئے زمین کے اس حصہ پر جسقدر لوگ آباد ہوں خواہ وہ اس
سلطنت کے رکن ہوں یا نہوں ان سب کے حقوق و فرائض مقرر کرے، اور یہ خیال
اتنا بڑھا ہوا ہے کہ بعض وقت ہم لفظ "سلطنت" کو روئے زمین کے اس خاص حصہ
کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کے نسبت یہ دعوی ہو۔

یہاں تک میں نے ایک سلطنت کی احدیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا اس کا
حصر محض اس واقعہ پر ہے کہ اس کے تمام ارکان ایک ہی نظم حکومت کے مطیع ہیں۔ اس
کے علاوہ کوئی اور واسطہ جس کو سلطنت کا تصور ظاہر کرتا ہو میرے خیال میں موجود نہیں
ہے۔ تاہم اس بات کو تسلیم کرنا چاہئے کہ ایک سیاسی سلطنت جس کے ارکان کو نظم حکومت
کی اطاعت کرنے کے علاوہ کسی طرح کے تعلقات کا مطلق وقوف نہیں ہے ان میں مشکل
سے وہ اتصالی قوت پیدا ہو سکتی ہے جو ان ابتری ڈالنے والے صدموں اور مناقشوں کو
روکنے کے لئے ضروری ہوتی ہے جو بیرونی لڑائیوں اور اندرونی نارانیبوں سے وقتاً فوقتاً
پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اگر کوئی سیاسی معاشرت یہ چاہے کہ وہ محکم طور پر قایم ہو اور اسکی

ف۱ اگر کوئی سیاسی جماعت اپنی مملکت کو چھوڑ کر کسی سرزمین میں آباد ہوجائے تو یہ دعوی کیا جاسکتا ہے
کہ اس تغیر کے دوران میں اور اس کے بعد وہ، وہی سلطنت رہی ہے جو تھی مگر میرا خیال ہے کہ یہ بحث
مشتبہ ہوگی۔

حالت قابل اطمینان ہو تو اس کے ارکان کو اس بات کا علم رہنا لازمی ہے کہ ان میں ہر
ایک آپس میں ہر ایک کا ہے اور وہ سب ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ علاوہ اس تعلق
کے جو ایک ہی نظم حکومت کے مطیع رہنے سے پیدا ہوا ہے معاشرت کے ارکان میں اس
قسم کا وقوف تصور کرنے کے بعد میں "سلطنت" کو ایک "قوم" بھی کہہ سکتا ہوں۔ موجودہ
سیاسی تخیل کے مطابق جس کو بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے ایک "سلطنت" کو یقیناً "قوم"
بھی ہونا چاہئے۔ تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قوم ہونے کی صفت "سلطنت" یا "سیاسی معاشرت"
کے الفاظ سے جسطرح کہ آجکل وہ مستعمل ہیں از خود مستنبط ہوتی ہے۔ ان الفاظ سے جو صفات
عموماً مستنبط ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) آدمیوں کا مجموعہ جس کو سلطنت یا سیاسی معاشرت
تعبیر کرتی ہے باہم اتحاد رکھتا ہے۔ اگر کسی اور بنا پر نہیں تو اس واقعہ کی بنا پر وہ متحد
ہے کہ ایک ہی نظم حکومت کا دائمی طور پر مطیع ہونا وہ اپنی نسبت تسلیم کرتا ہے اور اس
حاکم ومحکوم کے تعلق میں دوام ہونے کے باعث وہ ایک "مصنوعی شخص" کی زندگی
رکھتا ہے جو اس کے ارکان کی زندگیوں سے مختلف ہے (۲) نظم حکومت زمین کے
ایک حصہ پر بااختیار ہے۔ اور (۳) سیاسی معاشرت کے ارکان کی تعداد کم نہیں ہو
گو تعداد کا ٹھیک ٹھیک بتانا ممکن نہ ہو[1]

یہ صفات اس وقت دریافت ہوتے ہیں جبکہ ہم سلطنت کے متعلق اپنے موجودہ
تصور کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم "طریقۂ تقابل" کی مدد سے سیاسی معاشرت کی تاریخ
پچھلے زمانوں میں تحقیق کرتے ہوئے ارتقا کے چشموں تک پہونچ جائیں اور یہ تسلیم کرلیں
کہ جس معاشرت میں ارتقا کم ہوا ہے وہ اس معاشرت سے جس میں ارتقا زیادہ ہوا ہے
مقدم ہے تو پھر یہ صفات دھندلے ہوتے ہوتے بالکل ہی محو ہو جائیں گے۔ آدمیوں کی
تعداد کم ہوتی جائے گی یہاں تک کہ محض ایک ایسے قبیلے تک نوبت پہونچیگی جس میں اور
ایک بڑے خاندان میں آسانی سے تمیز نہ ہوسکیگی۔ زمین سے تعلق میں بھی ایک بے پروائی

[1] سلطنت کی حکومت کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خارجی اقتدار سے آزاد ہوتی ہے۔ مگر انگریزی زبان
میں یہ اصطلاح ان محکوم جماعات کے متعلق بھی استعمال کی جاتی ہے جنمیں اس خصوص کی کمی ہوتی ہے اور جو کسی وفاقی
اتحاد کے ارکان یا کسی ذی اقتدار سلطنت کے توابع ہوتے ہیں۔

نظر آئے گی کیونکہ قبیلہ ایک آوارہ گرد گروہ غول میں پھرنے والے گلّہ بانوں یا کاشتکاروں کا ہوگا۔ حاکم اور محکوم کا تعلق بھی بہت خفیف طور پر دریافت ہوسکیگا۔ سردار جس کی سرداری سب نے تسلیم کی ہے ایسا نہوگا جو قوانین وضع کرسکے۔ یہ گروہ چند ایسے رواجوں کا پابند نظر آئے گا جو پشتہا پشت سے ان میں چلے آتے ہیں کوئی عامل بھی ان میں ایسا نہ ملیگا جو عدول حکمی پر سزا دیتا ہو۔ اگر سردار کم سے کم زمانۂ امن میں احکام جاری کرتا نظر آئیگا تو اس کا احتمال بہت کم ہوگا کہ عام طور پر ان احکام کی پابندی بھی کی گئی ہوگی۔ آخر کار ہم کو وہ غول میں پھرنے والے گروہ ملیں گے جن میں کوئی ایسی چیز جس کو ہم باقاعدہ سرداری کہہ سکیں دریافت ہوسکیگی۔ پس ان تمام وجوہ کی بنا پر سیاسی معاشرت کے ارتقا کی تحقیقات شروع کرنے میں خاص مشکل پیدا ہوجاتی ہے، کیونکہ اگر ہم ابتدا سے اس تحقیقات کو شروع کرنا چاہیں جیسا کہ مقتضائے قدرت ہے تو پھر یہ قریب قریب گھپ اندھیرے میں کسی چیز کا ڈھونڈنا ہوگا اگر ہمارا یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ ہمارے سیاسی معاشرے نے ایک ایسے سیاسی نمونہ سے جس کا ارتقا نہایت ناکمل تھا اسی طرح براہ راست نزول کیا ہے جس طرح اولاد باپ سے پیدا ہوتی ہے (اور یہ سوال ایسا ہے جس پر میں اس وقت غور نکرونگا) تو پھر ہمارے سلسلۂ ارتقا کا بہت بڑا حصہ اس زمانہ میں آجاتا ہے جس کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ جس وقت تاریخ کی پہلی کرن روشنی کی ان معاشرتوں پر پڑتی ہے جن سے حال کی یورپی سلطنت کا ماخوذ ہونا قطعی طور پر تحقیق ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام معاشرتیں ایک ممیز و پیچیدہ نظام سیاسی رکھتی تھیں۔ اس امر کی تحقیق کہ سیاسی معاشرت کی سب سے پہلی بنا کیوں کر ہوئی ہم کو اصلی تاریخ کے احاطہ سے باہر نکالکر قیاس اور گمان اور ایسے نتائج کی سرزمین میں پہونچا دیتی ہے جو از روئے تمثیل مستنبط کیئے جاتے ہیں۔ پس بہترین طریقہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس پہلے سیاسی دستور سے ابتدا کی جائے جس کا علم ہم کو تاریخ سے حاصل ہوتا ہے اور اس کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دنیا میں سب سے پہلا سیاسی دستور وہی تھا۔ پھر اس تاریخی سیاسی دستور کے مقام سے قیاس دوڑا کر معلوم کرنا چاہیئے کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اور پھر اس کا بعد کا ارتقا کس طرح جاری رہا اس کو تاریخ کی روشنی میں دریافت کیا جائے۔

خطبۂ دوم

دورِ تاریخی کے نظمِ حکومت کا بدو و آغاز

ا۔میں نے اپنے سابقہ خطبے میں اس سلسلے کے طرق و مقاصد کی توضیح کر دی ہے ہمیں جس شئے کا مطالعہ کرنا ہے وہ ارتقاء کی وہ رفتار ہے جو ہمیں زمانۂ جدیدہ کی سلطنت تک پہنچاتی ہے، زمانۂ جدیدہ کی سلطنت ایک آئینی سلطنت ہے ۱۱ور اس لئے یورپ کی تاریخ پر اس نظر سے نگاہ ڈالنے کے لئے کہ اس کی رفتار اس جانب رہبری کرتی ہو، ہمارا اولین تعلق وساتیر. سلطنت کی تاریخ سے ہے اور اس محدود مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم فی الجملہ قوموں کی ہندی جرمانی گروہ کی تین شاخوں کی تاریخ کے اندر ہی اندر رہ سکتے ہیں۔ ہم اپنی توجہ اصناف ذیل پر مرکوز کر سکتے ہیں (۱) یونان، (۲) روما (جس میں شہنشاہی اور خاصکر اس کا مغربی حصہ شامل ہے)۔(۳) وہ جرمانی قبائل جنھوں نے خروج کر کے مغربی شہنشاہی کو منقلب کر دیا اور جب ان کی باری آئی تو خود ان کے سیاسی ارتقاء اِن نئے حالات سے اثر پذیر ہوئے جو ان کی فتح سے اس منقلب شدہ شہنشاہی میں پیدا ہو گئے تھے اور ان حالات نے ان کے سیاسی ارتقا میں بہت کچھ ترمیم بھی کی۔

شروع ہی میں یہ ظاہر کر دینا ضروری و اہم ہے کہ یونانی اطالوی اور ٹیوٹانی تہذیب کے نشو و نما کی روشیں مختلف ہیں مگر اپنے بدو و آغاز میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ جدا نہیں ہیں۔ جب بہترین شہادتوں کے اعتبار سے ہم یونان، روما اور جرمانیہ کے سیاسی نظم کی ابتدائی شکلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم ان کے اہم اختلافات کے باوجود، ان کی عام ہیئتوں میں ایک گونہ اتحاد و اتفاق پاتے ہیں۔ درحقیقت

بقول فریمن۔ آریائی خاندان کی سیاسی زندگی کی جو قدیم ترین جھلک ہمیں نظر آتی ہے، ان میں سے کم از کم یورپی ارکان خاندان میں ہم مختلف ترمیمات کے تحت میں حکومت کی ایک ہی شکل دیکھتے ہیں یہ شکل وہ ہے جس میں ایک بادشاہ یا سردار ہوتا تھا جو زمانۂ امن میں حکمران اول، اور زمانۂ جنگ میں قائد افواج ہوتا تھا مگر وہ اپنی ہی خود رایانہ مرضی سے حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ سرداروں کی مجلس مشورت کا پابند رہتا تھا اور یہ سردار وہ ہوتے تھے جو عمر، نسب یا شخصی کارہائے نمایاں کی وجہ سے ممتاز ہوتے تھے۔ مزید برآں، حکمران تمام خاص خاص اہم مسائل کو قوم کی جمعیت عام میں آخری تصدیق کے لئے پیش کرتا تھا۔ ..... ہومر کے نغموں میں یورپی زندگی کی جو پہلی تصویر کھینچی گئی ہے اس میں بھی ہمیں حکومت کی یہی شکل نظر آتی ہے ..... جس قدیم لاطینی دستہ سلطنت سے اولاً دولت عامہ اور بعد ازاں رومانی شہنشاہی وجود میں آئی، روایت سے اس کی جو قدیم ترین شکل ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے اس میں بھی حکومت کی یہی شکل نظر آئی ہے۔ ٹیسیٹس کے ہاتھوں نے ہماری نسل کی جو پہلی تصویر کھینچی ہے اس میں بھی ہم حکومت کی یہی شکل دیکھتے ہیں، اور اس نسل میں سے خاص ہماری شاخ جب اس جزیرے میں وارد ہوئی جس میں (اب) ہم رہتے ہیں تو اس کے ابتدائی ایام کے متعلق خاص ہمارے ملکی وقائع میں جو لمعات نظر آتے ہیں ان میں بھی حکومت کی یہی شکل دکھائی دیتی ہے۔"[1]

میرے نزدیک اس رائے میں صداقت کا اہم عنصر ضرور موجود ہے مگر اس میں کسی قدر مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ پس اس موجودہ خطبے میں میری تجویز یہ ہے کہ بالترتیب ان تین مقدم صورتوں کی جانچ کروں جن پر فریمن کی تعمیم کی بنا قائم ہے، اور اس میں تشابہات کے ساتھ ہی ساتھ تخالفات کو بھی دکھاؤں۔

گر سوال یہ ہے کہ کس ترتیب سے ہم ان کی جانچ کریں فریمن کے بیان پر جو پہلی قید میں لگانا چاہتا ہوں (یہ سوال مجھے اسی جانب لیجاتا ہے) وہ قید یہ ہے کہ ان میں سے ہر صورت کے متعلق جس قدیم ترین حالت کا تاریخی تیقن ہو سکتا ہے، جب ہم اس پر نظر کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قدیمی قومیں

[1] سیاسیات مقابلی (Comparative Politics) خطبۂ دوم صفحات ۶۵، ۶۶

جن کی سیاسی حالت کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے وہ اس وقت ارتقا کے ایک ہی مدارج پر نہیں
تھیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ موسن کے پانچویں باب میں ابتدائی رومانی دستور سلطنت کا
جو خاکہ دیا ہوا ہے اس کے آخر میں اس مورخ نے صاف طور پر یہ کہدیا ہے کہ ملت رومانی
کا یہ قدیم ترین قابل امتیاز سیاسی نظم (یعنی وہ دستور سلطنت جسے ہم سرویوس تولیوس
کی اصلاح کے قبل قائم شدہ تصور کرتے ہیں) ارتقاء سیاسیہ کی رفتار میں اس سے
بیحد بعد کا درجہ ہے جو ہمیں ہومر کی نظموں یا جرمانیوں کے ان حالات سے معلوم ہوتا
ہے جنھیں ٹیسیٹس نے بیان کیا ہے۔ اس رائے کو قبول کرنے کے بعد ہمیں اس
تخالف کی ایک نمایاں مثال ملتی ہے جس کا اشارہ میں پہلے کر چکا ہوں کہ عام تاریخوں
میں سیاسی واقعات کی جو تاریخی ترتیب ہوتی ہے اور سیاسیات ارتقاء کی جس ترتیب
کا پتا چلانا چاہتا ہے ان دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ سیاسیات کے نقطۂ نظر سے
ٹیسیٹس (یعنی پہلی صدی عیسوی) کے جرمانیوں کو چھ سو برس قبل کے رومانیوں سے مقدم
سمجھنا چاہیئے (یعنی ارتقا کی جس رفتار کا ہم پتا چلانا چاہتے ہیں اس کے نقطۂ آغاز سے وہ
(جرمانی) قریب تر تھے۔

آیا ہم اسی طرح بقیہ دو صورتوں کا بھی تصفیہ کر سکتے ہیں؟ آیا ہم یہ کہہ سکتے
ہیں کہ یونانیوں کے جن سیاسی ادارات کا حال ہمیں ہومر سے معلوم ہوتا ہے اور
جرمانیوں کی جو کیفیت ٹیسیٹس سے واضح ہوتی ہے ان دونوں میں سے باعتبار ارتقاء
کے قدیم ترکون ہے۔ یہاں یہ اولین اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ یہ تمام مقابلہ زائد
از ضرورت غیر متیقن بنیاد پر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہومر کے ایسے شاعرانہ بیانات
سے سیاسی نظم معاشرت یا حالت تمدن کے شکل کی تاریخی ہستی کی شہادت نہیں ملسکتی
کیونکہ (۱) یہ بیانات اس زمانہ کے خصوصیات کی شہادت نہیں ہیں جس زمانہ میں یہ
نظمیں لکھی گئی ہیں کیونکہ ہومر نے نہایت شاندار ماضی کا خاکہ کھینچا ہے۔ (۲) وہ اس
زمانۂ گزشتہ کے خصوصیات کی بھی قابل اعتماد شہادت نہیں ہیں کیونکہ ہم ایک
عالم قدامت کا مبلغ علم شاعر کی جانب منسوب نہیں کر سکتے۔ اس بیان
میں کچھ نہ کچھ قوت ضرور ہے، خاصکر ان مقامات کے اعتبار سے جہاں اعاظم رجال
کی قوتوں، عظمتوں اور انعاموں کا ذکر ہوا ہے، تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اس امر

میں شبہ کرنا تشکیک کو ضرورت سے زیادہ طول دینا ہے کہ سیاسی ادارات، معاشری رسم ورواج اور حرفتی فنون کے جو بیانات جا بجا آگئے ہیں (اور صریحاً اس غرض سے نہیں داخل کئے گئے ہیں کہ قصہ کی تاثیر کو زیادہ کریں) ان سے بہ حیثیت مجموعی اس یونانی تمدن کا اظہار ہوتا ہے جسے شاعر یا شعرا اپنے تجربہ سے جانتے تھے[1]۔ اگر ایسا تھا تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ یونانی جن کے لئے ہومر کی نظمیں لکھی گئی تھیں وہ ٹیسیٹس کے جرمانیوں کی بہ نسبت عام تمدن کی سطح پر قطعاً زیادہ بلند تھے[2]۔ کیونکہ ان کے پاس فصیل سے گھرے ہوئے شہر تھے، انگورستان تھے، زیتون کے باغ تھے، جن کی کاشت بہت ہوشیاری سے ہوتی تھی، اور سرداروں کے شاندار محلات تھے اعلیٰ صناعی کے کام اگر وہ خود نہیں کرتے تھے تو دوسرے ملکوں سے اس قسم کے کام لاتے تھے جو صناعی میں اکیلس کے سپر کے مانند ہوتے تھے اور سب سے آخری اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ خود نظمیں مرتب کرتے تھے، اس لئے اگر ہم انہیں صنعتی ارتقا کے زیادہ ترقی یافتہ درجہ پر پائیں تو اس میں استعجاب نہ ہونا چاہیے۔

۲- پس اب ہم کو واقعات کے اسی جزو سے شروع کرنا چاہیے جو بہ اعتبار تاریخ سب سے موخر ہے یعنی قدیمی جرمانی دستور سلطنت سے جسکے متعلق ہماری خاص سند ٹیسیٹس ہے۔ ٹیسیٹس نے جرمانی قبیلوں کے سیاسی ادارات کا جس طرح بیان کیا ہے ان میں ہم فریمین کے ہندی جرمانی نظم حکومت کے تینوں عناصر کو بالیقین پاسکتے ہیں۔ ایک جمعیت آزاد و مسلح اشخاص کی تھی جس کا اجلاس موقت طور پر ہوتا تھا جن چھوٹے چھوٹے اقطاع سے قبیلوں کی مملکت بنتی تھی ان کے والی یا سردار موجود تھے

---

[1] ۔ دو ایک صورتوں میں شاعر کی عبارت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بالارادہ کسی ایسے رواج کا ذکر کررہا ہے جو پرانا ہوچکا ہے، اور خود اس کے زمانہ میں وہ رواج ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے، مثلاً جہاں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ پتروکلوس کی چتا پر ٹرائے کے بارہ نوجوان قربان کئے گئے، وہاں یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

[2] ۔ ٹیسیٹس کے بیان کے بموجب جرمانی اسیران جنگ کو قربان کرتے تھے۔ وقائع، جلد اول صفحہ ۶۱۔

جوان اقطاع میں عدل وانصاف کا نفاذ کرتے تھے، جنگ میں بالعموم اپنے جنگ آوروں کی قیادت کرتے تھے اور قومی جمعیت کے لئے پیش نظر کاموں کے طیار کرنے میں مجلس مستشار کا کام دیتے تھے۔ بعض قبیلوں میں ایک اعلیٰ سردار یا بادشاہ بھی ہوتا تھا، یہ قطعی نہیں تھا کہ وہ موروثی ہو مگر اس کا انتخاب ہمیشہ کسی نہ کسی امیر کے خاندان سے ہوتا تھا اور ہم دوسری شہادتوں سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اکثر ایک ہی خاندان کے ارکان قابلِ انتخاب ہوتے تھے۔

لیکن جب ہم ٹیسیٹس کے بیانات کا سیزر کے اس خاکہ سے مقابلہ کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب متعلقہ گال میں دیا ہے تو ہم اس عجیب امر واقعہ سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں جسے "ابوتی بادشاہی"[1] کی حیثیت سے اس قدیمی نظم سلطنت کے بیان میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جرمانی ادارات کی جو خفیف خفیف جھلک سیزر کی کتاب میں نظر آتی ہے اس میں ہمیں قبیلۂ بادشاہی کا مطلق پتہ نہیں چلتا۔ سیزر کہتا ہے کہ امن کے زمانہ میں کوئی مشترک یا عام نظامت نہیں ہوتی تھی قبائل جن اقطاع میں منقسم ہوتے تھے ان کے سردار اپنے اپنے لوگوں میں عدل وانصاف کا نفاذ کرتے تھے۔ مشترک عام نظامت صرف اس وقت قائم کی جاتی تھی جب قبیلہ برسر جنگ ہوتا تھا۔ ڈیڑھ صدی بعد ٹیسیٹس کے زمانہ میں بھی بادشاہی یعنی کل قبیلہ کی مستقل سرگروہی نے صرف معدودے چند صورتوں ہی میں نشوونما حاصل کی تھی۔ بقول ڈاکٹر اسٹبز "قبیلوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شاہی کو بالکل ہی ساقط کر رکھا تھا۔ حکومت جسے (Civitas) کہتے تھے وہ بجائے خود ایک حد تک مرکز کا کام دیتی تھی اور قومیت کا رشتہ رابطۂ اتحاد کے لئے کافی تھا"[2]

پس جرمانی نظم سلطنت کے ارتقا میں تغیر کے جس قدیم ترین تحرک کا پتہ چلتا ہے وہ بادشاہی کی جانب ہے، بادشاہی سے مراد قبیلہ کی مستقل سرگروہی سے ہے جو موروثی اور بالعموم ایک ہی خاندان میں ہوا کرتی تھی۔ بعد کی تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بادشاہی یوماً فیوماً رائج ہوتی جاتی تھی، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں اس کا وجود پہلے نہیں تھا

---

[1] مثلاً بلنچلی کا نظریۂ سلطنت مقالۂ ششم باب ہفتم و ہشتم دیکھا جائے

[2] تاریخ آئینی (Constitutional History) باب دوم فقرہ ۱۵

وہاں اسے بالارادہ رائج کیا گیا، جو وسیع تر جماعتیں رومانی شہنشاہی کے فتح کرنے کا باعث ہوئیں ان میں ہم بادشاہی کو معمولی حالت میں پاتے ہیں۔ آخر میں سیکسن اور اہل فریزلینڈ ہی اپنے وطن جرمانیہ میں ایسی قومیں رہ گئیں جن میں بادشاہی نہیں تھی اور انگلستان کے سیکسن حملہ آور اگرچہ انگلستان میں بغیر بادشاہی کے وارد ہوئے مگر انھوں نے اسے بہت جلد اختیار کر لیا۔ ؎ۃ

جب صورت حال یہ ہے تو پھر فریمین کی تقلید میں یہ خیال کرنا بڑی بیباکی ہوگی کہ قدیم ہندی جرمانی قوم میں معینہ طور پر اختیارات کی سہ گانہ تقسیم ہوتی تھی، اور یہ اس وقت سے ورثہ میں چلی آرہی تھی جب یونانی، رومانی اور ٹیوٹن ایک ساتھ رہتے تھے (وجہ یہ ہے کہ قبیلہ پر لحاظ کرتے رہے) قدیم ترین شہادت سے ہم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمانیہ کے اندر جرمانیوں میں بادشاہی مفقود تھی، اور یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بے بادشاہ کا قبیلہ جن چھوٹے گروہوں میں منقسم تھا ان میں اعضائے حکومت کی معینہ سہ گونگی موجود تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جن قبیلوں میں بادشاہ موجود تھے ان میں یہ تینوں عناصر صاف طور پر نمایاں تھے گر بہرحال میں ٹیسیٹس کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمانی قبیلوں میں اعلیٰ اقتدار آزاد جنگجویوں کی جمعیت میں مرکوز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اسٹبز نے اس بیان کا جو خلاصہ دیا ہے اس کے ایک اقتباس ؎ۃ سے میں اسے بسہولت واضح کر سکتا ہوں، یہ مسلم ہے کہ ڈاکٹر اسٹبز انگریزوں کے آبا و اجداد کے ادارات کی عمومی تعبیر کی جانب نامناسب غلو نہیں رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دونوں نظموں کے تحت میں مرکزی اقتدار کا نفاذ قومی جمعیتوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ ان جمعیتوں کا انعقاد معینہ اوقات پر اور بالعموم غرۂ ماہ یا بدر کامل کے روز ہوتا تھا حیثیت کا کوئی امتیاز نہیں تھا، اور سب مسلح حاضر ہوتے تھے۔ خاموش اعلان مقتدایان مذہبی کی طرف سے ہوتا تھا جنھیں بروقت اس کے نفاذ کا اختیار حاصل ہوتا تھا۔ اس کے بعد مباحثے کا آغاز کسی ایسے شخص کی طرف سے ہوتا تھا جسے خطابت

ؑلہ۔ مقابلہ کیجئے آٹو گرکی Des Deutsche Genossenschaftsrecht Pt. §

ؑسلہ۔ تاریخ آئینی (Constitutional History باب دوم فقرہ ۱۶۔

کا شخصی حق حاصل ہوتا تھا مثلاً بادشاہ یا کوئی مقامی سردار، یا کوئی ایسا شخص جس کی عمر، امارت، فوجی عظمت یا فصاحت یا بلاغت اسے خطابت کے رتبے کا مستحق بنا دیتی ہو۔ یہ شخص ترغیب و مشورت کا انداز اختیار کرتا تھا، تحکم کا انداز کبھی پیدا نہونے دیتا تھا۔ مخالفت کا اظہار بلند آواز سے ہوتا تھا، موافقت کا اظہار نیزوں کے ہلانے سے ہوتا تھا، پر جوش مدح کا اظہار نیزے اور ڈھال کے بجانے سے۔

"زیر غور مسائل میں سے زیادہ اہم مسائل کا انصرام پوری جمعیت میں ہوتا تھا جس میں تمام آزاد خیالوں کو موجود ہونے کا حق ہوتا تھا مگر معاملات کو قومی تصفیئے کے لئے پیش کرنے کے قبل سرداران کے متعلق لوگوں کو ہموار کر لیتے تھے اور وہی ان معاملات کی ترتیب بھی کرتے تھے۔ کم اہمیت اور معمولی روزمرہ کے معاملات حکام کی محدود مجلسوں میں بھیجدئے جاتے تھے۔ یہ جمعیت عدالت عالیہ کی حیثیت سے بھی کام کرتی شکایات کی سماعت کرتی۔ سزائے موت کا حکم جاری کرتی تھی"، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیسیٹس کے زمانہ میں ضلعوں اور دیہاتوں میں "نفاذ انصاف کے لئے حکام"، کا انتخاب بھی اسی جمعیت میں سے ہوتا تھا۔

۳۔ جب ہم زمانۂ ہومر کے یونان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نظم حکومت میں زیادہ قطعی شاہانہ ہیئت نمودار ہو چکی تھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک سردار اعلیٰ ہوتا تھا، لیکن بازی لیوس (Basileus) کا جو لقب اس کے لئے استعمال ہوتا تھا وہی ان ماتحت سرداروں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا جنھیں ٹیسیٹس "رکس" (شاہ Rex) سے ممیز کرنے کے لئے (Principes) (والی یا سردار کہتا ہے[۱])۔ کم از کم "اوڈیسی" میں تو ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ تاہم، (اوڈیسی کے بموجب)، ہومر کے بیان کردہ قبیلوں میں جو مختلف سردار ہو سکتے تھے ان میں معمولاً ایک سب سے اعلیٰ سردار یا بادشاہ ہوتا تھا

---

[۱] ٹیسیٹس، "جرمانیا" میرا یقین یہ ہے کہ ایلیاڈ میں بازی لیوس Basileus کا لفظ ہرگز صراحۃً کسی ایسے شخص کے لئے استعمال نہیں ہوا ہے جو کسی علاقے (ڈیموس) کا سردار نہ ہو یا کسی ایسے سردار کا بیٹا نہ ہو۔ یہ ان نکات میں سے ہے، جنھیں ایلیڈ یا اس کے قدیم حصص کے سیاسی تصورات، اوڈیسی کے اخلاقی تصورات سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔

جس کا منصب لازماً (از روئے وراثت) نہیں مگر عموماً اس کے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ملتا تھا جب ایک حریف نے تیلےماکوس سے یہ کہا کہ اپنے باپ کے وارث کی حیثیت سے اس کا یہ حق ہے کہ وہ اتھاکا کا بادشاہ ہو تو تیلےماکوس نے متانت کے ساتھ یہ جواب دیا کہ "اتھاکا میں اور بھی بہت سے دوسرے سردار ہیں" اور اگر اودیسیوس کا انتقال ہو گیا ہے تو ان میں سے کوئی ایک انصرام مہمات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اس بحث کے انداز سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیلےماکوس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ حق ضرور ہے مگر یہ حق باطل بھی ہو سکتا تھا۔[۱] اس طرح قدیمی جرمانی دستور سلطنت میں اپنا بادشاہ منتخب کرنے کے لئے قوم کا حق منتخب ہونے کے اس موروثی دعوے کے ساتھ عموماً ملا ہوا تھا جو ایک ہی خاندان کے ارکان سے تعلق رکھتا تھا

پس ہومر کے بیان کردہ قبائل میں ایک مرکزی بادشاہ ہوتا تھا جو معمولاً موروثی ہوتا تھا، اور جو جرمانی بادشاہ کی طرح، زمانۂ امن میں اہلِ قبیلہ کے آپس کے تنازعات حقوق کے فیصلہ کرنے کا فرض ادا کرتا تھا اور انھیں ظالمانہ زیادتی سے محفوظ رکھتا تھا خارجی تعلقات میں اپنی جماعت کی نمائندگی کرتا تھا، سفیروں کو باریاب کرتا اور غیر ملکیوں کی مدارات کرتا تھا، اور جنگ کے زمانہ میں معمولاً فوج کا قائد ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ ملکِ ماتحت سردار یا اکابر، جرمانی سرداروں کے مانند ایک مجلس مرتب کرتے تھے، اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جرمانی سرداروں کی طرح ان کی بھی عادت یہ تھی کہ اپنے معاملات کا تصفیہ ضیافت کے موقع پر کیا کرتے تھے۔ مزید براں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اہمیت عامہ کے معاملات پر بحث کرنے کے لئے قوم کی عام جمعیتیں طلب کی جاتی تھیں، مگر اس قسم کی جمعیتوں کے سیاسی فرض کے متعلق مشہور علمائے مستند کے درمیان شدید اختلاف آرا رہا ہے۔

گروٹ[۲] کی رائے کے بموجب ہومر کی بیان کردہ جمعیت امرا اور مجلس سرداران سے

---

[۱] سیاسی ضیافتیں بہت ہی قدیمی ادارات ہیں۔ تیسٹس کہتا ہے کہ وہ صلح اور جنگ کے معاملات پر اکثر دسترخوان پر بحث کیا کرتے تھے۔ اکلس کے غصہ سے جو نازک حالت پیدا ہو گئی تھی، اس موقع پر نسطر اگامیمنون کو یہ صلاح دیتا ہے کہ "سرداروں کو ایک دعوت دو"

[۲] تاریخ یونان حصۂ اول باب بستم (جلد دوم صفحات ۹۰۔ ۹۲۔ ۹۰۰)۔ طبع اول۔

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے بادشاہ کو صلاح دینے کے مواقع پیدا کئے جاتے تھے اور وہ قوم میں بادشاہ کے منشا کو شائع کرنے کا واسطہ ہوتی تھیں نہ کہ بادشاہ کے اقتدار میں رکاوٹیں ڈالتی تھیں بادشاہ اپنی رائے شائع کرتا تھا مگر ہومر کے جلسہ گاہ میں "ہاں" اور "نہیں" کی تقسیم نہیں ہوتی تھی، نہ کبھی کوئی باضابطہ قرارداد قبول کی جاتی تھی، اس جمعیت کا اجلاس مکالمہ، اطلاع، اور کسی حد تک سرداروں کے مباحثوں کے لئے منعقد ہوتا تھا اور اسی حد پر اس کے ظاہری مقاصد ختم ہو جاتے تھے۔ عامۃ الناس جن پر یہ جمعیت مشتمل ہوتی تھی، وہ سنتے تھے اور راضی برضا رہتے تھے، اکثر ان میں تذبذب نہیں ہوتا تھا اور سرتابی تو کبھی ہوتی ہی نہ تھی۔

اس کے جواب میں فریمین اور گلیڈسٹن نے ناقابل انکار دلائل کے ساتھ اس امر پر زور دیا ہے کہ "باقاعدہ قرارداویں" اور "تقسیم آرا" یہ وہ نزاکت آفرینیاں ہیں جو سیاسی تہذیب کے بعد کے مدارج میں پیدا ہوئیں، ہم اس قسم کی قرارداویں اور تقسیم آرا سلح احرار کی اس جرمانی جمعیت میں بھی نہیں پاتے جس پر صلح و جنگ کے واقعی فیصلے اور دوسرے اہم معاملات کا صریحی انحصار تھا ٹیسیٹس کہتا ہے کہ "اگر وہ کسی تجویز کو ناپسند کرتے ہیں تو اپنے انکار کا اظہار بڑبڑانے سے کرتے ہیں، اگر پسند کرتے ہیں تو نیزے آپس میں ٹکراتے ہیں[۱]" یہ قطعاً ظاہر ہے کہ ہومر کے یونانی پرزور ناپسندیدگی سے اجتناب کرتے تھے مگر ایلیاڈ (نہم ۲۹، ۵۰) میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگامیمنون کی تجویز کی ناپسندیدگی کا موثر اظہار خاموشی سے ہوا، اور فریق مخالف کے مقرر کے لئے زور کا شور تحسین بلند ہوا، یہ عیاں ہے کہ ہومر کی جمعیت میں مقرر ترغیب وہی سے کام لیتے تھے اور ترغیبی فصاحت ان کے لئے سب سے زیادہ اہم تھی۔ شان و عظمت حاصل کرنے کے لئے اعاظم رجال کے واسطے جمعیت گاہ میدان جنگ سے کچھ کم نہ تھی[۲] کم حیثیت شخص بھی اگر اسے فصاحت و بلاغت کی نعمت حاصل ہوتی تھی "اپنی قوم کی جمعیت میں تاباں و درخشاں بن جاتا تھا، اور جب وہ شہر میں ہو کر گزرتا تھا تو اس پر لوگوں کی نظریں اس طرح پڑتی تھیں گویا وہ دیوتا ہے[۳]" پس اس لئے جمعیت

---

[۱] ٹیسیٹس "جرمانیا"۔ ۱۱

[۲] ۔اوڈیسی، ہشتم، صفحہ ۱۲۷

[۳] اوڈیسی ۸، ۱۷۲

محض ایک وسیلۂ اعلان ہونے سے کچھ زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور جیسا کہ گلیڈسٹن اور فریمین کہتے ہیں، جہاں خطابت عامہ روش عامہ کا آلۂ کار ہوتی ہے، آزادی کا اصلی جوہر وہیں موجود ہوتا ہے۔

مزید براں، یہ بھی واضح ہے کہ (ایلیاڈ ۱۸، ۳۱۱) شاعر نے یہ قرار دیا ہے کہ پالیڈمس کی عمدہ صلاح کے بجائے، ہکٹر کی ناقص رائے کو پسند کرنے کی شدید ذمہ داری ٹرائے کی جمعیت ہی پر عائد ہوئی تھی، اور اوڈیسی (۱۶، ۵، ۳) تیلے ماکوس کے مار ڈالنے کی سازش کی سزا کے طور پر پینیلوپ کے خواستگاروں کو اٹیکا سے خارج کر دینے کا اختیار اٹیکا کی جمعیت ہی کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا دشوار ہے کہ رواج کے بموجب بادشاہ مجلس یا جمعیت کی صلاح کے بغیر یا اس کی صلاح کے خلاف کس حد تک اپنے فیصلے سے کام لے سکتا تھا (کیونکہ اس میں شک نہیں کہ تینوں اعضا کے درمیان فرائض کی تقسیم غیر متیقن اور تغیر پذیر تھی) تاہم یہ صاف ظاہر ہے کہ بعض سرکاری کام اس کے حدودِ اختیار کے اندر نہیں تھے۔ چنانچہ ہم بار بار یہ سنتے ہیں کہ کسی بطل اعظم کے لئے اس کی نمایاں خدمت عامہ کے صلہ میں سرکاری زمین میں سے کوئی قطعہ علیحدہ کر کے ایک جاگیر اسے عطا کر دی گئی مگر یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ یہ جاگیر بادشاہ کے اقتدار سے اسے عطا ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ لیسیا میں بیلے روفون کے مہمات کے بعد بادشاہ نے اپنے "تمام شاہی اعزاز کا نصف حصہ اسے دے دیا تھا" مگر "انگورستان اور کاشت سے سرسبز و شاداب جاگیر" اسے اہالی لیسیا ہی نے دی تھی (بادشاہ کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا)۔

پس اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ہم تنہا ہومر ہی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یونان کے سیاسی نظم معاشرت کی جس قدیم ترین شکل کا پتہ چلتا ہے اس میں احرار کی جمعیت کو وہ حیثیت حاصل تھی جو جرمانی جمعیت سے مشابہت رکھتی تھی، اگرچہ یہ بھی یقینی ہے کہ ہومر نے جس نظم معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے اس میں سردار اس سے زیادہ اور عام اشخاص اس سے کم ظاہر ہوتے ہیں جتنا کہ ٹیسیٹس نے جرمانی نظم معاشرت میں بیان کیا ہے۔

اس عام نتیجہ کی مزید تائید اس شہادت سے ہو سکتی ہے جو ہومر سے بعد کے یونان کے متعلق حاصل ہوئی ہے جس سے مکرر توضیح اس امر کی ہوتی ہے کہ استقرا اور تقابل کے ذریعہ سے سیاسی ارتقا کی تمام رفتار کا پتہ چلانے میں ہمیں تاریخی ترتیب کو نظر انداز کر دینا پڑتا ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ ہمیں مختلف سلطنتوں کے ایسے سیاسی حالات کو جن میں طولانی وقفے

حائل ہوتے ہیں متوازی رکھنا پڑتا ہے، اور دوسری طرف مختلف ممالک کے ایسے یکساں حالات پر بیک وقت غور کرنا پڑتا ہے جن میں ارتقا کے طولانی وقفے حائل ہوتے ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ترتیب تاریخ کی اس نظر اندازی کو ہمیں ضرورت سے زیادہ طول نہ دینا چاہیے کیونکہ یہ اغلب ہے کہ ایک قوم جس کی ارتقائی حالت پست ہو اور کسی زیادہ مہذب قوم سے ربط ضبط رکھتی ہو، "وہ اس تعلق کی وجہ سے تہذیب و تمدن کے بعض عناصر اخذ کر لیگی اور اس طرح بعض اعتبارات میں معاشری حیثیت سے اس قوم سے بہت بڑھ جائے گی جو عموماً ارتقا کے اس درجہ پر اس سے بہت قبل ہو گزری ہو لیکن جس قسم کے قدیم نظم معاشرت پر ہم غور کر رہے ہیں، اس کی سیاسی قوتوں کے توازن پر ہمعصر تہذیب و تمدن کے اس اثر سے یہ توقع دشوار ہے کہ وہ آزاد اشخاص کی عام جمعیت کے حق میں اثر انداز نہ ہوگا کیونکہ یہ اغلب ہے کہ سردار اپنی دولت و حیثیت کے اعتبار سے تہذیب و تمدن میں عامۃ الناس پر سبقت لے جائیں گے اور اس طرح اپنے تفوق کو بڑھالیں گے۔ یونانی تاریخ میں مقدونیہ کو جب نمود حاصل ہوئی ہے اس وقت اس کے بادشاہوں کے معاملہ میں یہی صورت واقع ہوئی۔ درحقیقت وہاں شاہی خاندان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ نسلاً اپنے زیادہ متمدن ہمسایوں سے تعلق رکھتا ہے پس جب اس منبع فوقیت کے باوجود ہمیں سکندر کے مورخین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدونی بادشاہوں کے اختیارات آئینی طور پر محدود تھے اور خاصکر موت کی سزا زمان جنگ میں فوج کی اور زمان امن میں جمعیت کی منظوری کے بغیر نہیں صادر ہوسکتی تھی اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سکندر کے ایسے سر بلند و ظفر مند بادشاہ کے تحت میں بھی مقدونوی فوج نے ایشیا میں اپنے اس حق کو قائم رکھا اور واقعاً ان مقدونیوں کو چھوڑ دیا جن پر خود سکندر نے فوج کے روبرو الزام عائد کیا تھا تو بالیقین فریقین کے اس توازن کی کچھ تصدیق ہو جاتی ہے جو اس نے مسلح آزاد اشخاص کی ٹیوٹنی اور یونانی جمعیتوں کے قدیم سیاسی گروہوں کے درمیان قائم کیا ہے۔

لیکن، مقدونوی دستور سلطنت کا حال ہمیں عام مبہم بیانات اور ان نتائج سے معلوم ہوتا ہے جو منفرد واقعات سے اخذ کیے گئے ہیں مگر زیادہ اہم شہادت ہمیں یونان کے تاریخی وساتیر میں سے ایک سب سے زیادہ دلچسپ دستور سلطنت سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ دستور سلطنت وہ ہے جسے اسپارٹا کا لائکرگس والا دستور

سلطنت کہتے ہیں میرے نزدیک یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ (۱) ڈوریس کے جن قبائل نے پیلوپونیز کو فتح کیا وہ معاشری و سیاسی دونوں گروہوں سے اس قوم کی بہ نسبت زیادہ ابتدائی حالت میں تھے جسے انھوں نے مغلوب کر لیا تھا۔ اور (۲) لکرگس کی جانب منسوب شدہ دستور سلطنت میں ایک بڑی حد تک ہمیں یہ ابتدائی حالت مصنوعی طور پر محفوظ اور بے نظیر طور پر مستحکم ملتی ہے۔ ایسے سلسلۂ تغیر کے ذریعہ سے جس کا اب پتہ نہیں چل سکتا ایک حملہ آور غول کی ابتدائی طبعی کیفیت زندگی اور اس کے جنگجویانہ عادات کسی نہ کسی طرح سے سپاہیوں کی ایک نہایت ترتیب دادہ جماعت کی مصنوعی سادگی و جفاکشی اور روایتی جنگی فن کے اندر نقش کالحجر کر دی گئی تھی (روایات قدیمہ نے اسی سلسلۂ تغیر کو یکجائی طور پر لکرگس کے نام سے وابستہ کر دیا ہے) اب اگر ہم اسپارٹا کے قدیم دستور سلطنت کو لیں، (اور "ایفرون" یعنی ناظروں کی اس مجلس کو نظر انداز کر دیں جسے بہترین استاد نے بالاتفاق اضافۂ مابعد قرار دیا ہے) تو ہم اس کی اہم ہیئتوں کو ویسا ہی پائیں گے جیسا کہ فریمین نے قدیمی ہندی جرمانی نظم حکومت کی نسبت بیان کیا ہے۔ اور بالخصوص جمعیت کے اختیارات کے اعتبارات سے اس کو ٹیسیٹس کے بیان کردہ نظم حکومت کے ساتھ اس سے زیادہ نمایاں مشابہت حاصل ہے جتنی ہومر کے بیان میں کہیں مل سکتی ہو۔ بادشاہ کا یہ فرض تھا کہ وہ مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ بدر کامل کے دن شہریوں کو یوروتاس کی وادی میں ایک مقررہ جگہ پر جمع کرے، (میں نے یہاں اسپارٹا کی دہری بادشاہت کی خصوصیت کی تجرید کر لی ہے، کیونکہ اس وقت ہمیں اس بحث میں الجھنا نہ چاہیے) جرمانی جمعیت کی طرح یہ جمعیت بھی مسلح آزاد لوگوں کے فوجی اجتماع کی حیثیت رکھتی تھی۔ صلح و جنگ کے فیصلے، معاہدے، اور سلطنت کے دوسرے اہم معاملات تصفیہ کے لئے اس کے سامنے بالکل اسی طرح پیش ہوتے تھے جس طرح ٹیسیٹس کی بیان کردہ جرمانی جمعیت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ دونوں میں سے کسی صورت میں بھی معمولی آزاد اشخاص مباحثہ میں حصہ نہیں لیتے تھے مگر جمعیت کو یہ اختیار ہوتا تھا کہ پیش شدہ تجاویز کو قبول کرے یا رد کر دے، اور تھیوسیڈائڈیس کے زمانہ تک (جیسا کہ خود اس مورخ نے بیان کیا ہے) جرمانی جمعیت کی طرح اسپارٹا کی جمعیت کا فیصلہ بھی باضابطہ اظہار رائے کے ذریعہ سے نہیں بلکہ شور کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ تمام شہادتوں کو یکجا کرنے کے بعد ہم معقول حد تک یہ فرض کر سکتے ہیں کہ سرداروں اور عام آزاد اشخاص کے درمیان روا جاً اختیار کی جو تقسیم تھی وہ یونان کے مختلف حصوں میں بہت کچھ مختلف تھی اور جہاں نسبتاً زیادہ ابتدائی معاشری حالات باقی رہ گئے تھے (جیسا کہ اس کوہستانی قطعہ میں تھے جہاں سے فاتح ڈوریائی قوم آئی تھی)، وہاں عام آزاد اشخاص کی خود مختاری اور جمعیت احرار کی مجموعی قوت زیادہ متمدن حصص کے بہ نسبت بڑھی ہوئی تھی اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رکھنا بھی اہم ہے کہ سرداروں کا فوجی ساز و سامان اور ان کا طریق جنگ کیا تھا، کیونکہ قدیم تاریخ میں ارتقا کا جس قدر دور شامل ہے اس تمام دور میں فوجی ساز و سامان اور تنظیم کے اختلافات کا سیاسی اختلافات پر اہم اثر پڑتا تھا۔ چنانچہ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ہومر کے اعاظم رجال کے مانند جہاں کہیں یونانی سردار و امرا جنگی گاڑیوں پر بیٹھ کر لڑتے تھے، وہاں ان کی سیاسی فوقیت قلیل الارتباط عام غول پر قطعاً اس سے زیادہ تھی جتنی ان ٹیوٹنی سرداروں کو حاصل تھی جو اپنے ہم قبیلہ اشخاص کے ساتھ میدان جنگ کو پیدل جاتے تھے، لیکن میرا یہ خیال نہیں ہے کہ جنگ کا یہ طریقہ یورپ کے یونانیوں میں کبھی زیادہ وسعت کے ساتھ شائع رہا ہو[1] کیونکہ جنگی گاڑیاں اس قسم کے کوہستانی ملک کے لئے جیسا کہ یونان خاص کا بیشتر حصہ ہے بالکل ہی ناموزوں تھیں۔ بہر صورت ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ڈوریائیوں نے پیلوپونیز میں اپنے فتوحات زیادہ تر اس پیدل فوج کے ذریعہ سے حاصل کئے جو ازمنۂ تاریخی میں ان کی جنگ سازی کا ایک خاص بازو تھا۔ اور اس طرح عام ڈوریائی آزاد اشخاص کے ساتھ جو فوجی اہمیت وابستہ ہو جاتی ہے اس کا میلان یہ رہا ہوگا کہ ان کی سیاسی حیثیت برقرار رہے۔ دوسری طرف بڑے بڑے پتھروں کی عظیم الشان دیواروں، سونے کے خزائن و دفائن سے پر شاندار قبروں اور میکے نائی اور ٹرینز کے محلات کے کھنڈروں کو ہم معقول حد تک اس امر کی شہادت قرار دے سکتے ہیں کہ ڈوریائیوں کے حملوں کے قبل پیلوپونیز کے یونانی سردار وقار و طاقت میں سینٹس کے جزائر یہ اور یونان کے زیادہ درشت تمدنی حصص کے سرداروں کی نسبت بہت بڑھے ہوئے تھے۔

عدالتی فرائض کی نسبت، قدیمی جرمانی نظم حکومت اور قدیم ترین معلومہ یونانی نظم

---

[1] اس کے آثار موجود ہیں کہ زمانۂ قدیم میں یہ طریقہ بیوتیا اور یوبیا میں رائج تھا۔

حکومت کے درمیان قطعی تخالف معلوم ہوتا ہے۔ جرمانی نظم حکومت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنازعات حقوق اگر آپس کی جدال، مصالحت یا ثالثی سے طے نہ ہو جائیں تو انصاف کے اعلان کا حق خاصتہ "آزاد اشخاص" کو حاصل ہوتا تھا خواہ وہ قومی طور پر مجتمع ہوں یا مقامی طور پر۔ بادشاہ یا مقامی سردار کا فرض یہ ہوتا تھا کہ وہ سماعت مقدمہ کے وقت صدارت کرے اور فیصلہ کا نفاذ کردے لیکن ہومر کے بیان کردہ یونان میں فیصلہ عام اہل شہر کے درمیان اگورا میں ہوتا تھا مگر اس کی شہادت نہیں ہے کہ معمولی مقدمات میں آزاد اشخاص عام طور پر فیصلہ میں شرکت کرتے تھے تاہم، مقدونیہ کے متعلق جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ موت کے مقدمات میں جمع شدہ آزاد اشخاص آخری فیصلہ کرتے تھے جیسا کہ روما میں اس وقت ہوتا تھا جب سزایافتہ شخص مرافعہ کرتا تھا۔ عام بناؤں پر اغلب یہی ہے کہ اور جگہوں کی طرح یونان میں بھی مسلح لوگوں کا وہ قدیمی اجتماع جس سے سیاسی جمعیت بنتی تھی، فوجداری کے اہم معاملات کے لئے اول اول عدالتی جماعت بھی ہوتا تھا۔

موسن نے قدیمی رومانی دستور سلطنت کا نقشہ جس طرح کھینچا ہے جب ہم اس پر مختصر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہم آزاد اشخاص کے قدیمی نظم حکومت کے تین عناصر کو قطعی اور نمایاں طور پر ممیز دیکھتے ہیں، سب سے اول بادشاہ[1] دوسرے مجلس "آباء" (اکابر) جسے رواجاً یہ حق تھا کہ بادشاہ کو صلاح دے اور جب بادشاہ کا انتقال ہو جائے تو شاہی اختیار کی آخری امانت دار وہی مجلس ہوا تیسرے جمعیت، جسے قدیمی ہوٹنی یا اسپارٹونی جمعیت کے ساتھ کم از کم تین اصولی مشابہتیں تھیں۔ (۱) معینہ دنوں پر اس کا انعقاد ضرور ہوتا تھا۔ (۲) جارحانہ جنگ "قانون عامہ" یا ملکی تعلقات اور مروجہ قاعدے کے تغیر وغیرہ کے ایسے زیادہ اہم قومی معاملات کے متعلق اس کی منظوری لی جاتی تھی۔ (۳) جمعیت کو صرف "ہاں" یا "نہیں" کہنا ہوتا تھا، جو تجاویز پیش ہوتے تھے ان کے متعلق عام شہریوں کو تقریر کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

---

[1] رومانی اور یونانی بادشاہوں کے درمیان بعض نمایاں اختلافات موجود ہیں۔ رومانی بادشاہ کو دیوتاؤں کی نسل میں ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ اس کی نامزدگی یا تو اس کا پیشرو کرتا تھا یا سینات کا مقرر کردہ "ہنگامی بادشاہ" کرتا تھا اگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روما کے بادشاہ کا انتظامی اختیار یونان کے دیوتائی بادشاہوں سے بہت بڑھا ہوا تھا اور یہ رومانیوں کی خصلت کے اس مزید تشدد و انضباط کے عین موافق تھا جس کا ثبوت ہمیں پدری اختیار کے خانگی قانون کی سختی میں بھی ملتا ہے۔

یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ جن مقدمات میں موت کی سزا تجویز ہوتی تھی ان کی بابت رواجاً رومانی جمیعت کے روبرو مرافعہ ہوتا تھا۔

یہ خیال میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ جس نظم حکومت کا یہ سرسری خاکہ کھینچا گیا ہے، وہ خصوصیت کے ساتھ ہندی جرمانی تھا۔ درحقیقت ہمسٹر اسپنسر کی رائے[1] کے بموجب یہ حکمرانی کی ایک ایسی شکل تھی جسے ہم بعض اہالی ملایا اور پالینشیا، شمالِ امریکہ کے سرخ رنگ باشندوں، ہندوستان کے پہاڑوں کے دڑاوڑی قبیلوں اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں میں بھی پاتے ہیں، لیکن یہاں ہمیں زیادہ وسیع مقابلے سے سروکار نہیں ہے۔ ہمسٹر اسپنسر نے خصوصیت کے ساتھ یہ اضافہ کیا ہے کہ "حکومتی تنظیم کا اس کے سوا کسی اور طرح شروع ہونا ممکن نہیں ہے" کیونکہ اول اول کوئی مقتدر قوت اس مجموعی مرضی کے سوا نہیں ہوتی جس کا اظہار جمع شدہ غول میں ہوتا ہے"

لیکن اس کے قبل کہ ہم اس ضرورت کی تصدیق کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سیاسی نظم معاشرت کے بدو و آغاز کے متعلق ایک ایسے مقبول عام نظریہ کی جانچ کریں جس سے اس ضروری اور مقتدر قوت کے سرانجام پانے کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ میرا مقصود نظریۂ ابوّت سے ہے جس سے قدیم نظم معاشرت میں ارتباط کی ابتدائی قوت کی حیثیت سے بچوں میں والدین کی اطاعت پیدا ہوتی تھی اور آگے چل کر یہی عادت اس سردار کی اطاعت کا موجب ہوتی تھی جو اپنے عشیرے کا باپ سمجھا جاتا تھا، میں چاہتا ہوں کہ آیندہ کے خطبہ میں اس نظریے کی جانچ کروں۔

---

[1] ادارات سیاسیہ (Political Institutions) باب پنجم نقرہ ۴۶۴۔

خطبۂ سوم

نظریۂ ابوّت

۱۔ میں یہاں خطبۂ سابقہ کے نتائج کا خلاصہ مختصراً بیان کرتا ہوں، سابق ترین شواہد تحریری سے قدیم قوم کی جو کیفیت یونان و روما میں اور (کسی مشترک سردار کے ہونے کی حد تک) جرمانی قبائل میں ظاہر ہوتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی فرائض تین مختلف الترکیب اعضا میں منقسم تھے، بادشاہ یا سردار اعلیٰ، ماتحت زعما یا اکابر کی مجلس اور کامل الحقوق شہریوں کی جمعیت، جس کی نسبت میں کہہ چکا ہوں کہ وہ آزاد و مسلح اشخاص کا فوجی اجتماع ہوتا تھا۔ جن مختلف صورتوں کا ہم نے مقابلہ کیا ہے ان میں یہ تینوں اعضا کم و بیش یکساں پائے جاتے ہیں، اور ان تینوں میں فرائض کی تقسیم جس طرح کسی ایک صورت میں ہوئی ہے دوسری صورت میں بھی کم و بیش وہی بات موجود ہے تاہم جزئیات میں ہمیں اہم اختلافات نظر آتے ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس ابتدائی درجہ میں ہمیں ان نظمہائے معاشرت کے ساتھ تقسیم فرائض کی وہ قطعیت و تعیین منسوب نہ کرنا چاہیے جو زیادہ متمدن قوموں کے نظمہائے حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔

خطبات کے اس سلسلے کا خاص کام یہ ہے کہ یہ نظمِ حکومت جس ارتقا سے ہو کر گزرا ہے اس کے بعد کی رفتار کا قدم بقدم پتہ چلائے، جس قدر تمدن آگے بڑھتا جاتا ہے رفتار صاف ہوتی جاتی ہے۔ اور گزشتہ معاشری و سیاسی حالات کے جو شواہد تحریری ہمارے پاس ہیں وہ زیادہ قطعی و قابل اعتماد ہوتے جاتے ہیں مگر اس موجودہ خطبے میں آگے نظر ڈالنے کے بجائے اس تاریک تر زمانہ پر نظر ڈالنا اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم قیاسات کی مدد سے کس حد تک ایک اغلب بیان اس رفتار کا مرتب کر سکتے ہیں جس سے قدیم نظم حکومت تک رسائی ہوئی۔

زمانۂ جدید کے سیاسی خیال کے سابق تر مدارج میں نظم معاشرت کے بدو و آغاز کے مسئلہ پر بہت بحث ہوئی ہے کیونکہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ اس سے کوئی عملی اہمیت پیدا ہوتی ہے،

مگر اب کوئی بھی یہ اہمیت اس کی جانب منسوب نہیں کرتا۔ لوگوں نے اپنے کو ایک منظم معاشرت میں پاکر اور عادتاً کسی حکومت کی اطاعت کرنے کے باعث سوال یہ کیا کہ یہ اطاعت کیوں واجب ہوئی؟ اور توقع یہ کی کہ اس کا جواب کسی ایسے نظریئے میں مل جائے گا (جس سے یہ واضح ہوتا ہو) کہ اس اطاعت کی ابتدا کیونکر ہوئی یعنی یہ رائے قائم کرلی کہ حکومتی اقتدار کی ابتدا کا علم ہو جانے سے یہ متعین ہو جائے گا کہ بنی نوع انسان کے خاص خاص حصص سے حکمرانوں کو اس وقت حصول اطاعت کا جو دعوی ہے اس کا جواز ثابت ہو جائے گا، مگر حکومت کے ابتدائی منبع اور موجودہ فرض اطاعت کے درمیان تعلق کا یہ گمان اب عام طور پر مردود قرار پاگیا ہے۔ اس امر پر غور کرتے وقت کہ کیوں ہم کسی قائم شدہ حکومت کی اطاعت کرتے ہیں، ہم عام طور پر اطاعت و مقاومت کے اغلب نتائج کی جانچ کرتے ہیں یعنی ایک قائم شدہ نظم کو توڑنے کی برائیوں کو جور و زیادتی کی برائیوں کے مقابل رکھکر دونوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ پس اس طرح لاک اور فلمر کا تنازع ہمارے لئے تاریخی دلچسپی سے زائد نہیں رہ گیا ہے۔ لاک کا دعوی یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار سابق الحریت افراد کی آزادانہ مرضی سے ماخوذ ہوا ہے اور فلمر یہ دعوی کرتا تھا کہ یہ اقتدار اس فطری اقتدار سے ماخوذ ہے جو باپ کو اپنے لڑکوں اور لڑکوں کے لڑکوں پر ہوتا ہے۔ پس اب ہمارے لئے آسان ہے کہ ہم ان متبادل قیاسات کی اغلبیت کو علمی بے لوثی کے ساتھ جانچیں۔

۲۔ لیکن، قیاسات کے اس دھندلے گوشے میں قدم رکھنے سے قبل یہ بہتر ہوگا کہ اس ابتدائی اقتدار کے مسئلہ کے متعلق (جہاں تک کہ وہ تاریخ کے نسبتاً کم مبہم حصص سے معلوم ہو سکتا ہے) جو کچھ بھی علم حاصل ہو سکے ہمارے ذہن میں محفوظ ہو، ہمیں اس بات پر قیاس دوڑانے کی ضرورت ہے کہ ازمنۂ قبل التاریخ میں سیاسی نظم معاشرت کی ابتدا کس طرح سے ہوئی، اس کے صحیح قیاس کا بہترین موقع حاصل کرنے کے لیئے یہ بہتر ہوگا کہ ازمنۂ تاریخی میں نئے سیاسی نظمہائے معاشرت کے بنانے کے جو طریقے واقعی معلوم ہیں، وہ ہمارے پیش نظر ہوں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ازمنۂ تاریخی میں نئی سلطنتیں کبھی تو اجتماع سے بنی ہیں اور کبھی تقسیم سے، اور ان دونوں صورتوں میں کبھی رضامندی سے ایسا ہوا ہے، اور کبھی جبر سے۔ ازمنۂ تاریخی میں تقسیم کچھ کم کثرت سے واقع نہیں ہوئی ہے خاصکر ارتقا کے ان

سابق تر مدارج میں جبکہ وہ کارروائی جس نے بعد میں استعماریت کی صورت اختیار کی، ایک بھدی شکل میں اس طرح جاری ہوئی کہ نئے مستقروں کی تلاش میں جہاں گرد غول کے غول روانہ کئے جاتے تھے مگر جب کوئی نیا نظم معاشرت تقسیم کے ذریعہ سے بنتا ہے تو ظاہر ہے یہ اس قسم کے کسی سابق الوجود نظم معاشرت سے ماخوذ ہوتا ہے، اس لئے یہ صاف ظاہر ہے کہ تقسیم وہ طریقہ نہیں ہو سکتا جس طریقہ سے سیاسی نظامہائے معاشرت ابتداً غیر سیاسی طریقوں سے بنے۔

اجتماع کی صورت دوسری ہے اور اس لئے اس پر زیادہ خاص نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ فاتح یا مفتوح جماعت کو جب تہذیب کا ایک خاص درجہ حاصل ہو چکتا ہے تو اس کے بعد نئی سیاسی جماعتوں (کے وجود میں آنے) کا ایک نہایت ہی اہم سبب قوت یا فتح کے ذریعہ سے ہوتا ہے، لیکن ارتقا کے ادنیٰ ترین مدارج کے وحشی قبائل اگرچہ برابر ایک دوسرے سے برسر جنگ رہا کرتے ہیں مگر وہ محض فتح کے ذریعہ سے ارتباط (یا امتزاج) نہیں پیدا کرتے مفتوحین کا یا خاتمہ کر دیا جاتا ہے یا وہ بھگا دئے جاتے ہیں مگر انھیں جذب نہیں کیا جاتا، کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہوتا ہے کہ جو مرد گرفتار ہوتے ہیں، ان کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے اور عورتیں غالباً لونڈیاں بنائی جاتی یا گھر کا کام کرنے کے لئے بچالی جاتی ہیں۔ پس ہمیں یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ملتی کہ سیاسی نظمہائے سلطنت کی نہایت ہی قدیم تکوین میں فتح بھی ایک عنصر کی حیثیت رکھتی تھی اور اس امر کا تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ غیر سیاسی عناصر سے سیاسی نظمہائے سلطنت اس طریق فتح سے وجود میں آئے ہوں۔

دوسری طرف ہم ازمنۂ تاریخی میں متعدد صورتیں ایسی پاتے ہیں جن میں زیادہ تر رضامندانہ اجتماع سے ایک نیا سیاسی مجموعہ ان عناصر سے بن گیا جن میں پہلے سے ایک قسم کی سیاسی تنظیم موجود تھی اگرچہ اکثر یہ تنظیم کم ترقی یافتہ ہوتی تھی۔ ہم اس کارروائی کا وقوع تاریخ کے اول ترین حصے میں بھی دیکھتے ہیں اور آخر ترین حصے میں بھی۔ اکثر وبیشتر ارتقا کے ابتدائی مدارج میں اس قسم کا اتحاد جنگ کے مقصد سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور اولاً اتنے ہی زمانہ تک رہتا ہے جب تک کہ جنگ جاری رہتی ہے، چنانچہ، (جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں) سیزر سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں جرمانی قبائل میں مشترکہ سردار صرف جنگ کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ امن کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے علیحدہ علیحدہ سردار رکھتے تھے جو عدل وانصاف کا انتظام کرتے اور اختلافات کو طے کرتے تھے، اور اس صورت

حالات کے تشابہات بہت آسانی کے ساتھ ہر حصے میں مل سکتے تھے۔[۵۱]
لیکن اس مرحلے میں جنگ اس قدر شدت اور کرات و مرات سے واقع ہوتی رہتی اور اسقدر شدید ہوتی تھی کہ اتحاد کا نفع اس کے دوام کا باعث بن جاتا تھا۔ ٹیسیٹس نے جن جرمانی قبائل کا ذکر کیا ہے ان سب کے متعلق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اندرونی ارتباط کے اس کامل درجے کو حاصل کر لیا تھا، اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان میں قومی جمعیتیں ہوتی تھیں جن میں چھوٹے قطعات کے سرداروں کا انتخاب ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب ہم ان جرمانیوں سے گزر کر جنھیں سیزر اور ٹیسیٹس جانتے تھے ان جرمانیوں تک پہنچتے ہیں جنھوں نے چار صدی بعد زوال پذیر شہنشاہی کو روند ڈالا تو ہم تغیر کے اسی جانب میں مزید ترقی دیکھتے ہیں۔
لیکن یہ یقینی ہے کہ صرف جنگ اور غیر قوتوں کے مقابلے میں مدافعت ہی کی غرض سے (بہ الفاظ اسپنسر) یہ "توحد" وقوع میں آتا تھا۔ اگر جماعتیں زبان اور رسم و رواج میں یکساں ہوتی تھیں تو تہذیب و تمدن کی وجہ سے جب طبائع و حسیات کی یکسانی کا احساس بڑھتا تھا تو مجموعی جماعتوں کے اندرونی تعلقات میں زیادہ مکمل نظم قائم کرنے کی خواہش ہی اس ضرورت کے لئے کافی ہوتی تھی۔ یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب ہم ان غیر معمولی صورتوں پر غور کرتے ہیں جن میں حالات نے غیر ملکی جنگ کو نسبتاً ایک شاذ و نادر واقعہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آئیسلینڈ میں قریب قریب ہی مختلف جمعیتیں تھیں اور ہر جگہ جدا جدا سردار تھے۔ ان ہم جوار سرداروں اور ان کے حوالی میں تنازعات برپا رہتے تھے اور قانون غیر متیقن تھا یہی باعث ہوا کہ وہ سب ایک جماعت میں مبدل ہو گئے اور سنہ ۹۳۰ء میں "الفیوٹ کا دستور سلطنت" وجود میں آیا جس سے کل جزیرے کے لئے ایک مرکزی جمعیت (Thing) یعنی "جمعیت عام" (Althing) قائم ہو گئی اور ایک مفتی قانون مقرر ہو گیا جو ایک ہی قانون کا اجرا کرے۔
۴۔ پس کسی نئی سلطنت کی تکوین کے متعلق تمام تاریخی طریقوں میں سے رضامندانہ ارتباط ہی وہ طریقہ معلوم ہوتا ہے جو اس صورت پر قابل اطلاق ہو کہ کسی ایسی شے سے جو سیاسی نظم معاشرت نہ ہو ایک سیاسی نظم معاشرت کی ابتدائی تکوین وقوع میں آئے۔ لہٰذا لاک کے پیرووں اور ان کے مخالفین کے درمیان جو نہایت ہی اہم تاریخی مسئلہ زیر بحث ہے اسے

[۵۱]۔ مقابلہ کیجئے، اسپنسر، "ادارات سیاسیہ" Political Institutions فقرہ ۴۵۱، صفحہ ۲۶۹

اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آیا سیاسی نظمہائے معاشرت ابتداً اس طرح بنے تھے کہ فطری خاندانوں کے ایسے سرگروہوں نے جو اجتماع باہمی کے قبل ایک دوسرے پر حکومت کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے، انھوں نے برضامندی اجتماع قائم کر دیا تھا یا یہ کہ یہ نظامہائے معاشرت اس طرح بنے تھے کہ ایک ایک خاندان اپنے قرابتداروں کی بزرگ تر جماعتوں میں وسیع ہوتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ان افراد یا خاندانوں کی فوقیت مسلم ہوتی گئی جو خصوصیت کے ساتھ اولیں اجداد کی نمائندگی کرتے تھے۔

اس مسئلے پر کچھ روشنی اس طرح پڑ سکتی ہے کہ ہم اس قدیم ترین نظم معاشرت کی اندرونی ہئیت کی جانچ کریں، جس کا حال ہمیں یونان، روما اور جرمانیہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ پس میں اس بیان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اس ہئیت کے متعلق مین نے اس شہادت کی بنا پر پیش کیا ہے جو مطابقی اصول قانون اور خاص کر قانون روما کے مطالعے سے ماخوذ ہے۔ مین کے قول کے بموجب ابتدائی زمانوں میں نظم معاشرت واقعاً اور نیز ان لوگوں کی نظروں میں جن سے وہ نظم مرکب ہوتا تھا، خاندانوں کا مجموعہ تھا نہ کہ افراد کا، لہذا "قدیم قانون" اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ شخصیات کے ایک نظم کے لئے موزوں ہو سکے۔ وہ جن مجموعات یعنی جن آبائی یا خاندانی گروہوں سے بحث کرتا ہے انھیں وہ دائمی و ناقابل فنا سمجھتا ہے[1]" یہ خیال رکھنا چاہئیے کہ روما کے قدیم ترین قانون کا جس حد تک ہمیں تاریخی علم ہے، اس میں یہ مجموعات نہایت قطعی مفہوم میں خاندانوں کی حیثیت سے مسلم ہیں بزرگ خاندان کا اقتدار صرف اسکی بیوی، اس کے بچوں کی اور ان بچوں کی اولاد تک وسیع ہوتا تھا۔ ان لوگوں پر وہ درحقیقت ایسا مطلق العنانہ اقتدار عمل میں لاتا تھا کہ اس کے سوا کسی اور رکن خاندان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی قسم کا قانونی وجود رکھتا تھا، وہ نہ صرف املاک کا (جس میں اس کی اولاد کی پیدا کردہ املاک بھی شامل تھی) مالک مطلق ہوتا تھا بلکہ اپنے لڑکوں کو سزا دیسکتا تھا یہاں تک کہ انھیں قتل بھی کر سکتا تھا، انھیں فروخت کر سکتا یا تبنیت کے ذریعے سے منتقل کر سکتا تھا اور جس طرح چاہے ان کا نکاح کر سکتا اور طلاق دلا سکتا تھا۔ خاندان کے اندر اس کامل اقتدار کے دوش بدوش ایسی ہی وسیع ذمہ داری بھی تھی۔ بزرگ خاندان اپنے

[1] قدیم قانون (Ancient Law) باب پنجم صفحہ ۱۲۹

لڑکوں کے نقصان کے لئے جوابدہ تھا اگر وہ اس جوابدہی سے اس طرح خلاصی حاصل کر سکتا تھا
کہ نقصان کے پورا کرنے کے لئے خود اس زیاں کار کو حوالہ کر دے۔ جس طرح زندگی میں ایک
رومانی باپ کے اختیار کی یہ وسعت زمانۂ جدید کے والدین کے اختیار کے بہ نسبت ایک خود مختار
حکمران کے اختیار سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد اپنی جائداد پر
اس کے اختیار کی نمایاں کمی کی بھی ایک مثال نہیں مل سکتی ہے، وہ ابتدائً یہ نہیں کر سکتا تھا
کہ وصیت کے ذریعے سے اپنی جائداد اپنے لڑکوں کے سوا کسی اور کے لئے چھوڑ جائے،
وہ مرنے کے بعد اپنی جائداد کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار اس سے زیادہ نہیں رکھتا تھا جتنا زمانۂ
جدیدہ کی سلطنت کا کوئی بادشاہ اپنے زیر حکومت ملک کے ہست و نیست کا اختیار رکھتا ہے

لیکن جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد کیا وقوع میں آتا تھا تو
ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شہادت سے اس مسئلے کے دو جوابات خیال میں آتے ہیں۔ ہمیں جس
قدیم ترین رومانی قانون کا علم ہے اس میں باپ کے مرنے کے بعد جو نتائج متصور رہیں، جب
ان پر ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ باپ کے انتقال کے بعد خاندان شکست
ہو جاتا تھا اس کے وہ لڑکے اور وہ بے باپ کے پوتے جو جسمانی طور پر خاندان قائم کرنے
کے قابل ہوتے تھے یعنی خاندان کے وہ مرد جو حد بلوغ کو پہنچ چکے ہوتے تھے وہ خود مختار فرد
ہو جاتے تھے اور عورتیں جو شوہروں کے زیر اقتدار نہیں ہوتی تھیں، وہ اپنی عدم قابلیت
کی وجہ سے اپنے قریب ترین مرد رشتہ داروں کے تحت میں ہوتی تھیں[۴۱]

لیکن وراثت کے قدیم ترین رومانی قانون کی جانچ سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ
ارتقا میں ایک درجہ وہ آیا جب باپ کے انتقال کے بعد خاندان شکست ہو جانے کے بجائے
باہم مربوط رہتا تھا۔ مین[۴۲] کے بموجب وراثت کا قدیمی رومانی تخیل دو متوفی کی جملہ قانونی
حیثیت کی جانشینی" کا تھا۔ رومانی قانون میں وراثت سے متعلق تمام متروک و قدیم فقروں سے

۴۱۔ بعد میں جب کہ وصیتوں نے رشتہ داروں کے ابتدائی حقوق کو باطل کر دیا تو باپ کے
انتقال کے بعد غیر منکوحہ عورتیں ان متولیوں کی حفاظت میں دیدی جاتی تھیں جن کا
تقرر وصیت کی رو سے ہوتا تھا۔

۴۲۔ قانون قدیم، (Ancient Law) باب ششم صفحات ۱۸۱، ۱۹۰، ۱۹۱۔

یہ اظہار ہوتا ہے کہ مورث سے وارث کی جانب جو کچھ منتقل ہوتا تھا وہ خاندان تھا، خاندان سے مطلب ان تمام حقوق و فرائض کا مجموعہ تھا جو اقتدار ابوی میں جمع تھے اور اس سے پیدا ہوتے تھے"۔ اس لئے مین کا خیال یہ ہے کہ ابتدائی وصیت "ایک طرح پر یہ اعلان کرنا تھا کہ موصی کے بجائے سرداری کسے ملیگی" (راست وارث نہ ہونے کی صورت میں) غیر وصیت شدہ وراثت کے لئے قدیمی قانون میں جو رشتۂ قرابت تسلیم کیا جاتا تھا وہ صرف "عصبات" یعنی ان رشتہ داروں کا دعوی تھا جن کی قرابت خالصۃً مردوں کے واسطہ سے ثابت ہو اور یہ ہمیں اس زمانہ تک پیچھے لیجاتا ہے جب ایک بیٹا اپنے باپ کے انتقال کے بعد بھی بعض اہم اعتبارات سے اس خاندانی گروہ سے متعلق رہتا تھا جس خاندان سے اس کے بھائی بلکہ اس کے بعید تر قرابت دار متعلق ہوتے تھے۔ وراثت سے ان تمام ذوی الارحام کا خارج کر دینا جو اپنا رشتہ صرف عورتوں کے وسیلے سے قائم کر سکتے ہوں، یہ اس وقت تک ناقابل تصریح ہوگا جبتک کہ ہم یہ فرض نہ کرلیں کہ عورتیں (خواہ وہ باپ کے انتقال کے بعد ہی عقد کیوں نہ کرلیں) خاندان کو اس مفہوم میں چھوڑ دیتی تھیں جس مفہوم میں مرد نہیں چھوڑتے تھے۔

مزید برآں، ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ رومانی قانون کے "دوازدہ الواح" میں وراثت کے حقوق معلومہ قرابتداری کے حدود سے متجاوز ہوکر اس قبیلے یا عشیرے کے ارکان تک بھی پہنچتے تھے جس سے متوفی کا تعلق ہوتا تھا۔ اس سے ہم اس جانب آتے ہیں کہ مین نے جو قدیم نظم معاشرت کو خاندانوں کا مجموعہ قرار دیا ہے اس میں بہت اہم ترمیم کی جائے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ روما ایتھنز، اسپارٹا، غرض ہر اس جگہ جہاں کی قدیم قوم و ملت کا ہمیں صحیح علم ہے، اصلی خاندانوں کی درجہ بندی بڑی بڑی جماعتوں میں ہوتی تھی اور خاندان سے ان کی مشابہت صرف اس حد تک ہوتی تھی کہ ان کا ارتباط باہمی مشترک قرابتداری کے مفروضہ خیال سے ہوتا تھا، ہم سہولت کی غرض سے انھیں رومانی لفظ " Gentes " (عشایر) سے ممیز کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے (Gens) عشیرے کو مین خاندان کی خیالی وسعت کہتا ہے[1] عشیرے کے ارکان عشیرے کی حیثیت سے خون کے تعلق (جدی رشتہ داری) کا قطعی سراغ نہیں لگا سکتے تھے مگر وہ ایک مشترک نام استعمال کرتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو

---

[1] بلی ہذا گروٹ (حصۂ دوم باب نہم میں) اسے وسعت یافتہ اور ایک گونہ "خیالی برادری" کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔

ایک ہی مورث اعلیٰ کے اخلاف یا شاخ اخلاف سمجھتے تھے اور ایک ہی سی نیم خانگی قسم کے رسوم قربانی ادا کرنے سے وہ ایک مذہبی رشتے کے ذریعے سے بھی متحد ہوتے تھے اور ابتدائی زمانہ میں باہمی حقوق و فرائض کے ایک پیچیدہ رشتے میں بھی جکڑے ہوتے تھے یا یہ حقوق و فرائض ویسے ہی ہوتے تھے جیسے صریحی قرابتداری سے پیدا ہوتے ہوں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایتھنز کے عشیرے کے ارکان، وراثت املاک کے باہمی حقوق سے مربوط تھے، امداد، مدافعت، اور تلافیٔ نقصانات میں ایک دوسرے پر ذمہ داریاں عائد تھیں، بعض معینہ صورتوں میں (خاصکر جہاں کوئی یتیم لڑکی یا وارثہ ہو) ایک دوسرے سے عقد کرنے کے باہمی حقوق و فرائض تھے اور بعض صورتوں میں مشترکہ جائداد کی ملکیت بھی ہوتی تھی[۱]۔

اتحاد کے یہ روابط اس قدر مضبوط ہیں کہ جس قدیمی نظم معاشرت میں یہ پورے زوروں کے ساتھ جاری ہوں، اس کا تصور کرتے وقت ہم یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ طبعی خاندانوں کے مجموعے کی بہ نسبت زیادہ نمایاں طور پر عشیروں کا مجموعہ تھا، اور یہ قیاس بھی غیر اغلب نہیں ہے کہ روما کے ابتدائی سیاسی نظام سلطنت میں عشیروں کی اس طرح کی تقسیم کی نمائندگی ہوتی تھی، وہ "آبا" (Patres) جن سے مجلس سینیات مرکب تھی وہ اولاً قدیم عشیرات شرفا کے سرگروہ ہوا کرتے تھے۔

بعد ازاں، روما اور ایتھنز دونوں جگھوں میں خود عشیرات، زیادہ وسیع اتحادات "براوری" میں کم و بیش اسی قسم کے روابط سے وابستہ تھے اور پھر یہ وسیع تر گروہ قبائل میں مجتمع تھے۔

پس اگر ہم یہ تصور کریں کہ قدیمی قوم گروہوں کے ویسے ہی زینہ بہ زینہ سلسلے سے مرکب تھی جیسا کہ بیان ہوا یعنی ہر ایک گروہ کے اندر اتحاد کا رشتہ عام نسب کے اعتقاد یا روایت پر تھا جس کی نمائندگی و تصدیق ایک عام مورث اعلیٰ کی پرستش کے مقدس رسوم سے ہوتی تھی تو اس صورت میں اگر میں یہ کہوں کہ نظریۂ ابوّت خود بخود پیدا ہو جاتا ہے (تو کچھ بیجا نہ ہوگا)، جیسا کہ مین نے کہا ہے[۲]: "گروہوں کو ہم یہ خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ یہ گروہ ان مجموعی دائروں کے نظم کے مثل تھے جو بتدریج ایک ہی نقطے سے پھیلتے ہوئے بن گئے ہوں"۔ منشا یہ ہے کہ ابوی خاندان ترقی پذیر ہو کر اور باہم مربوط رہ کر عشیرہ بن جاتا تھا اور اسی طرح عشیرے سے قبیلے کے

---

[۱] ملاحظہ ہو گروٹ، حسب بالا

[۲] قدیم قانون (Ancient Law) باب نہم صفحہ ۱۲۸ و باب ہفتم صفحہ ۲۳۴

وسیع تر اتحاد میں ترقی کر جاتے تھے اور اگرچہ یہ محض ایک قیاس ہے مگر مین کا خیال ہے کہ "یہ محض ہوائی قیاس نہیں ہے" کہ ابوی خاندان سے ترقی کر کے جو خود مختار گروہ اس طرح بن جاتا تھا اس پر علی العموم "قدیم ترین سلسلے کے بزرگترین مرد" کی حکمرانی ہوتی تھی جو "تمام آزاد قرابتداروں کے مشترک مورث اعلیٰ" کی نمائندگی کرتا تھا[1]

۴۔ اس رائے کی جانچ کرنے میں تین سوالات کا ایک دوسرے سے ممیز کرنا مناسب ہوگا، ۱۔ کسی قدیم جماعت (ملت) کے ارکان جس رابطہ سے وابستہ ہوتے تھے آیا وہ رابطہ ابتداً خاندان یعنی دانستہ قرابت اور مشترک نسب کا نوع تھا۔ ۲۔ مفروضہ قرابتداروں کا وہ گروہ جس سے ہماری حد معلومات کے اندر نہایت ہی ابتدائی سیاسی نظم معاشرت مرکب ہوتا تھا، آیا وہ ایک ایسے خاندان سے وسعت پذیر ہوا تھا جو ایک ہی مرد کی اولاد سے بنا ہو۔ ۳۔ آیا اس قسم کے گروہ کا سردار علی العموم ابتدائی خاندان کے مورث اول کے نمائندے کی حیثیت سے اقتدار عمل میں لاتا تھا۔

میرے خیال میں پہلے سوال کا جواب اعتماد کے ساتھ اثبات میں دیا جا سکتا ہے اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ تاریخ سے جس قدیم ترین دور کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، اس دور میں انسان گروہوں میں رہتا تھا جن کا اکمل رابطۂ اتحاد بہر نوع قرابت ہی تھا۔ فی الواقع، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونانیوں اور رومانیوں کے معاملے میں جن گروہ اندر گروہ سے جماعت (ملت یا کم از کم یہ کہ شہریوں کا قدیم مجموعہ) مرکب معلوم ہوتی ہے، ان میں سے کسی گروہ کے جملہ ارکان کے درمیان، روایتی محفوظ نسب ناموں کے ذریعوں سے بھی قرابت کا عام طور پر پتہ نہیں چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر عناصر کو تبنیت کی رسم کے ساتھ یا اس رسم کے بغیر ہی قرابتداروں کے اتحاد میں داخل کر لیا جاتا تھا، بایں ہمہ یہ امر اس خیال کا مانع نہیں ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس گروہ کو یہ سمجھا جائے کہ وہ ایک مشترک مورث اعلیٰ کے اخلاف سے تھے۔ جہاں کسی جماعت کے ارکان کی نسبت یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب قرابتدار نہیں ہیں وہاں بھی یہ ہوتا تھا کہ اپنے کو قرابتدار ہی متصور کرنے سے وہ اسے ایک طبعی و قرین عقل امر سمجھ سکتے تھے کہ وہ باہم سیاسی اتحاد میں متحد رہیں

[1] "قدیم ادارات کی تاریخ" Early History of Institutions خطبۂ سوم صفحہ ۹۴

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تصور کے موثر ہونے میں اس طرح پر زور مدد ملجاتی تھی کہ ان خیالی قرابتداروں کو اس گروہ کی خانگی پرستش میں شامل کرلیا جاتا تھا۔ قرابتداری کی اس قسم کی مصنوعی وسعت کی کوئی شال ہمیں قدیم جرمانیوں میں نہیں ملتی مگر سیزر کے بیان میں جب ان کی پہلی جھلک ہمیں نظر آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جنگ اور زمین کی کاشت و تصرف کے لئے ہم جنس گروہوں میں متحد تھے، اور اگرچہ ان تمام صورتوں میں ان ہم جنس تقسیموں کی اہمیت اس وقت کم ہوتی جارہی تھی جب کہ ان پر تاریخ کی روشنی پڑتی ہے تاہم اس امر کو صفا طور پر ظاہر کرنے کے لئے کافی شہادت موجود ہے کہ قدیمی سیاسی نظم معاشرت کا اندرونی اتحاد خاندانی ہی کے نمونے پر خیال کیا جاتا تھا، اس کے قدیم ترین عناصر وہ گروہ تھے جو اسی طریق پر بنتے تھے اور ان جماعتوں کا جو اولیں علم ہمیں ہوتا ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جماعت کو زیادہ وسیع افسانہ دار قرابت کا احساس و ادراک تھا جو اسے قرب وجوار کی جماعتوں کے ساتھ متحد کرتی تھی۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدیمی قبائل کے متحد ہونے کے لئے شرط اولیں کے طور پر ایک مشترک مورث اعلیٰ کا سلسلہ ضروری تھا، تاہم یہاں بھی بنیاد اتحاد کے طور پر قرابت کا خیال اس قدر فائق و غالب معلوم ہوتا ہے کہ اتحاد کے بعد ایک مشترک مورث کا اعتقاد پیدا ہی ہوجاتا تھا۔

۵ ۔ پس ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ سیاسی نظم معاشرت کی قدیم ترین صورت نسبتاً ایک چھوٹی جماعت ایسے شخصوں کی تھی جو اپنے کو قرابتدار سمجھتے تھے، اور یہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں اس قسم کا نظم معاشرت ایک ہی خاندان کے توسیع سے پیدا ہوا ہو مگر میک لینن اور دوسرے مصنفوں نے جو شہادتیں مہیا کی ہیں کہ غیر متمدن لوگوں میں ایسی قرابتداری عام طور پر رائج ہے جس کا سلسلہ صرف عورتوں کی طرف سے ملتا ہے اور شادی کے ایسے رواج ہیں جو ابوی طریق سے بہت ہی مختلف ہیں، تو اب ایسی شہادت کے بعد میں اسے قطعی اغلب بھی نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی سیاسی نظم جس کا علم ہمیں تاریخی طور پر ہو اس نے واقعاً اس طرح پر ترقی کی ہو۔ اتنا کم از کم غیر اغلب نہیں ہے کہ جس گلہ نما گروہ یا گروہوں سے یہ نظم معاشرت پیدا ہوا ہو اس میں اجتماع و تقسیم کی درمیانی کارروائیاں کتنی ہی کچھ کیوں نہ ہوئی ہوں گروہ ایک ایسے درجے سے ہوکر گزرا تھا جس میں عورتوں کے وسیلے سے قرابت تسلیم کی جاتی تھی، اور اگر ایسا تھا تو بدرجۂ اقل یہ بھی غیر اغلب نہیں ہے کہ جب یہ نظم اس درجے پر پہنچا جس میں خاندانی اتحاد کے رابطے کے طور پر باپ

کی جانب سے قرابت رائج ہوئی تو اس وقت وہ نظم متعدد خاندانوں سے مرکب تھا جو قطعی طور پر اپنا سلسلۂ نسب کسی ایک ہی مرد مورث اعلیٰ سے نہیں ملا سکتے تھے، اگرچہ مردوں کے ذریعے سے قرابت کے جدید الغلبہ خیال کے اثر کی وجہ سے یقین کرنے لگتے تھے کہ ان کا کوئی ایسا مورث اعلیٰ رہا ہوگا۔ عرب قبائل میں اس قسم کے تغیر کی شہادت رابرٹسن اسمتھ نے اپنی کتاب "قدیمی عرب میں قرابتداری و مناکحت" Kinship and marriage in Early Arabia میں دی ہے۔

یہاں مجھے یہ خیال ظاہر کر دینا ہے کہ مین نے اپنی ایک بعد کی کتاب[1] میں، میک لینن کی شہادت کے ایک بڑے حصے کی اہمیت کو قبول کر لیا تھا، اور اپنے نظریے کو اس شہادت کا لحاظ کرتے ہوئے دوبارہ بیان کیا تھا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ "یہ امر ظنِ غالب سے زیادہ ہے کہ روئے زمین پر بنی نوعِ انسان کے ظہور پذیر ہونے کے بعد سے، نسل انسانی کے بیشمار حصوں کو مختلف اوقات میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کی شدید قلت سے تکلیف اٹھانا پڑی ہے۔" اس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "اُس سے لوگ اس جانب جائیں گے کہ دونوں جنسوں کے اس تناسب کی مناسبت سے ادارات قائم کریں" اور "اس قسم کے ادارات کا میلان یہ ہوگا کہ مردوں اور عورتوں کو ایسے گروہوں میں ترتیب دیا جائے جو ان گروہوں سے مختلف ہوں جن میں نظریۂ ابوت کے بموجب ابتداً ان کا اتحاد ہوا تھا۔" اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ "یہ کہنا غیر ممکن ہوگا کہ بنی نوع انسان کے کس حصے کو دونوں جنسوں کے اس عدم تناسب سے نقصان پہنچا ہے، لیکن پھر بھی وہ اس پر مصر ہے کہ نظریۂ ابوت سے بنی نوع انسان کی قدیمی گروہ بندی کا اظہار ہوتا ہے" اور میک لینن نے جس عجیب واقعے کی طرف توجہ دلائی ہے اس سے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک عارضی خلاف معمول امر تھا جو اولیں گروہ بندی اور بعد کے اس ابوی خاندان کے درمیان حائل ہو گیا تھا جس کا پتہ قدیم الذکر قانون سے چلتا ہے، اور اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ میک لینن کے اصول کو ڈارون کی سند کی مدد سے پلٹ دیا ہے مگر ڈارون نے اس مسئلے کی جانب علم الحیوان کی نظر سے توجہ کی ہے[2]۔

---

[1] "قدیمی قانون و رواج" Early Law and custom باب ہفتم صفحات ۲۱۴، ۲۱۵۔ جو لوگ اس موجودہ تحقیقات پر کچھ بھی توجہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اس باب کو پڑھنا چاہئے معلوم ہوتا ہے کہ مین پر تنقید کرتے وقت اسپنسر کو اس باب سے آگاہی نہ تھی۔

[2] "شجرۂ انسان" (Descent of man) حصۂ سوم باب بستم۔

بندروں کے جو عادات ہمیں معلوم ہیں، ڈارون نے انھیں سے یہ استدلال کیا ہے کہ قدیم انسان کی نسبت جبکہ وہ بندروں سے قریب ترین درجہ میں تھا، یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اس قسم کے تعلقات عقد رکھتا تھا جو ان تعلقات کی بہ نسبت جنکی جانب میک لینن نے توجہ دلائی ہے ابوی خاندان سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔ یعنی ہر شخص کی ایک بیوی ہوتی تھی اور اگر وہ قوی ہوتا تھا تو متعدد بیویاں ہوتی تھیں جنھیں وہ تمام دوسرے لوگوں سے رقیبانہ طور پر محفوظ رکھتا تھا اور اس اثر کے تحت میں زندگی بسر کرتا تھا جو تمام شعوروں میں سب سے زیادہ قوی اور تمام ادنیٰ حیوانات میں مشترک ہے، یعنی بچوں کی محبت۔ یہاں تک وجوہ موجود ہیں کہ بعض صورتوں میں مابعد ہیمونیت کی اس قدیم ترین حالت میں مستقلاً ایک بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو اس کی جانب منسوب کیا جائے۔ ڈارون کے استدلال کی قوت سے انکار کرنے کے بغیر میری رائے ہیں، ہم یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ میک لینن اور ڈارون نے مین کو وحشیوں کی زندگی کے مقابلے کی جانب جو رہبری کی اس کے اثر سے مین کے نظریۂ ابوت کی آخری شکل میں معتد بہ تغیر ہو گیا ہے۔ جیسا کہ یاد ہوگا کتاب "قانون قدیم" میں ابوی خاندان کی ایک اصلی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ بزرگ خاندان کے سب سے زیادہ عمر مرد کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے بالغ لڑکوں پر اسی طرح مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا تھا جس طرح کہ وہ گھر کی عورتوں اور چھوٹے بچوں پر حکومت کرتا تھا اور اس تصور سے "ان غیر متمدن لوگوں پر اپنے والدین کی جو خاموش اطاعت لازم آتی ہے اس کا ذکر ایک" اولیں واقعہ "کے طور پر کیا گیا ہے[سلہ]۔ مگر مین نے اپنی کتاب "قدیم قانون و رواج" میں جس طرح کے ابوی خاندان کو دکھایا ہے اس میں اس اولین واقعہ کا تصور دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس خاندان کے متعلق وہ (صفحہ ۱۹۲) کہتا ہے کہ "نیم وحشیوں سے بڑھا ہوا بلکہ انتہا درجے کا وحشی تھا" (صفحہ ۲۰۹) "جنسی رقابت" "قوت کے زور سے پوری ہوتی تھی، اور یہی وصف اس کی تعریف کا کام دے سکتا ہے" "زبردست شخص کی قوت" اس کی تکوین کی وجہ خاص تھی" (صفحہ ۲۱۵) لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کے گروہ میں جس کی بنا جنسی رقابت اور جسمانی قوت پر ہو، کونسی وجہ ہوسکتی تھی کہ ایک جوان بیٹا جو پوری جوانی کے زور میں ہو، باپ کے اقتدار کامل کا مطیع رہے۔ مین یہ خیال ظاہر

سلہ۔ قانون قدیم (Aneient Law) باب پنجم صفحہ ۱۳۶ -

کرتا ہے کہ باپ کی دانائی کے احترام کی وجہ سے یہ ہوتا تھا کہ "سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ عاقل مرد حکمرانی کرتا تھا" (صفحہ ۱۹۸) لیکن اگرچہ نیم وحشی اس دانائی کا جو علی العموم عمر کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے، اس سے زیادہ احترام کرتے ہیں جتنا تمدن کے زیادہ ترقی یافتہ مدارج کے لوگ کرتے ہیں تاہم اگر فرض کیا جائے کہ نہایت قوی حیوانی خواہشوں کے ہوتے ہوئے یہ احترام لوگوں کو اقتدار مطلق کا تابع بنا دے گا تو یہ خیال اس احساس کی جانب اس سے کچھ زیادہ منسوب کر دیتا ہے جس کی تائید شہادت سے ہوتی ہے اور مجھے بندروں اور دوسرے جانوروں کی نسبت جو کچھ معلومات ہیں ان سے اس کی مطلق تائید نہیں ہوتی۔ (مثلاً) مجھے یہ معلوم ہے کہ "گوریلے (نسناس) کے ایک جھنڈ میں ایک ہی نر دکھائی دیتا ہے، جب نر بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اقتدار کے لئے جنگ ہوتی ہے اور جو سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے وہ باقی تمام نروں کو مار کر یا بھگا کر خود اس غول کا سردار بن جاتا ہے" یہ تمام باتیں بہت غیر پدرانہ معلوم ہوتی ہیں مختصر یہ کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عشرتی خاندان جس میں ایک مرد سرگروہ اپنی بیویوں اور کم عمر بچوں پر حکومت کرتا ہو، یہی انسانی نظم معاشرت کی وہ ابتدائی اور قدیم حالت تھی جس کا تصور ہم زمانۂ سلف میں کر سکتے ہیں، تو میں اس خیال کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ "قدیم قانون" کا بیان کردہ ابوی خاندان قدامت کے اعتبار سے اس درجہ پر تھا اور نہ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ دیکھتا کہ اس قسم کا خاندان "عشرتی خاندان" سے تنزل کر کے فوراً ہی پیدا ہو گیا تھا۔ یہ دونوں ہر ایک اس خصوصیت کے اعتبار سے جو ارتقار سلطنت کے متعلق ہماری موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے سب سے اہم ہے۔ غیر متشابہ ہیں، تحقیقات ہمیں یہ کرنا ہے کہ کس وجہ سے بالغ اشخاص ایک شخص واحد کی اطاعت کرتے ہیں۔

۶۔ پس اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسائل متذکرۂ بالا میں سے اختلاف آرا کا مرکز تیسرا مسئلہ ہے یعنی سیاسی اقتدار کا تعلق پدری اختیار سے۔ مین کی رائے کے بموجب باپ یا اس کے جانشین کا اختیار قدیمی نظم معاشرت کی ہیئت ترکیبی کے لئے ایک ایسا ضروری و لابدی امر ہے کہ جماعتوں کو باہم وابستہ کرنے کے رابطے کی حیثیت سے قرابتداری کی نسبت یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ قرابتداری اور عام اقتدار کی اطاعت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اقتدار اور یک جدی ہونے کا خیال باہم ممزوج ہو گیا ہے[1] اگرچہ یہ دونوں امور کسی

[1] ڈاکٹر میورج حسب اقتباس ڈارون، "ہبوط انسان" (Descent of man) حصۂ سوم باب ہفتم

ہیج سے ایک دوسرے کو مغلوب نہیں کرتے ۔ چنانچہ سب سے چھوٹے گروہ یعنی خاندان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ آیا جو لوگ اس میں شامل ہیں انھیں زیادہ ممیز طور پر قرابتدار سمجھنا چاہئے یا یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اس شخص کے جو اس قرابت کا منبع تھا غلامانہ یا نیم غلامانہ توابع ہیں پدرانہ اختیار کے ساتھ قرابتداری کا یہ خلط ملط ان وسیع تر گروہوں میں بھی نمایاں ہے جو خاندان کی وسعت سے پیدا ہوتے ہیں بعض صورتوں میں قبیلے کی تعریف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ وہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی ایک سردار کے تابع ہوں پس یہ اغلب ہے کہ جہاں کہیں بھی قدیم سرداری مضبوط و مستحکم تھی، وہاں خیالات کا یہ امتزاج پیدا ہو جاتا تھا مگر سردارانہ اقتدار کی اس وسعت کی نسبت یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدیم سیاسی نظمہائے معاشرت کی یہی معمولی حالت تھی، اور اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ کوئی قبیلہ (عفریتی خاندان سے نہیں بلکہ) کسی واقعی پدری خاندان سے ترقی کر کے بنا تھا، تو بھی اس سے یہ نتیجہ نہ نکلے گا کہ اس کے سردار کو اس کا اختیار محض اس وجہ سے حاصل تھا کہ اس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ بہ حیثیت خلف اکبر کے وہ اس خاندان کے باپ کی "نمائندگی" کرتا ہے جس نے بڑھتے بڑھتے قبیلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نمائندگی کا یہ تصور مجھے اس سے زیادہ مصنوعی و نازک معلوم ہوتا ہے کہ ارتقا کے ایسے قدیم زمانہ میں اسے اتنی قطعی قوت حاصل ہو گئی ہو، اور یہ تو یقینی ہے کہ ازمنۂ مابعد کی جن صورتوں کا علم ہمیں تاریخی طور پر حاصل ہے اور جن کی جانب مین نے اشارہ کیا ہے جہاں قرابتداروں کے گروہ کم و بیش ابوی خاندانوں سے ترقی کر کے مشترکہ املاک رکھتے تھے (خواہ یہ املاک خود مختار گروہوں کی حیثیت سے نہ ہو بلکہ کسی وسیع تر سلطنت کے جزو کے طور پر ہو)، وہاں ہم پدری اختیار کا اس قسم کا انتقال نہیں دیکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے اکثر صورتوں میں (مثلاً ہندوؤں کے مشترکہ خاندان میں)، یہ برتاؤ تھا کہ سب سے قدیم سلسلہ کا سب سے زیادہ معمر مرد اگر کامل قوائے دماغی رکھتا ہو تو وہی علی العموم کل معاملات کا سرگروہ بنا دیا جاتا تھا مگر جیسا کہ مین[۱] نے قبول کیا ہے وہ محض منتظم ہوتا تھا حکمران بزرگ نہیں ہوتا تھا اور اگر وہ اپنے فرائض کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا تو اہل خاندان میں سے کوئی زیادہ لائق شخص انتخاب کے ذریعے سے اس کی جگہ مقرر ہو جاتا تھا۔ یہ انتخاب کا بعینہ وہی اصول ہے جو بدرجۂ اقل شاہی خاندان

---

[۱] قانون قدیم (Ancient Law) باب پنجم صفحہ ۱۳۶ -

کے حدود کے اندر) ٹیوٹنی بادشاہ یا سردار اعلیٰ کے تقرر کی نسبت (جہاں اس قسم کے سردار اعلیٰ کا وجود ہو) عام طور پر قبول شدہ معلوم ہوتا ہے۔

غرض جہاں کہیں ہمارے تصور کے بموجب خاندان کا ادارہ باپ دادا کی حکومت کے تحت میں مستحکم طور پر نظم معاشرت کے اندر قائم ہے وہاں بھی ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ سرداری کے تعین کے لئے شخصی قابلیت کی بنا پر انتخاب کا اصول مردوں کی وراثت کے اصول کے ساتھ ملا ہوا ہے علیٰ ہذا، اس کے ثابت کرنے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ اس قسم کے نظمہائے معاشرت میں جسمانی یا دماغی یا دونوں قسم کا شخصی تفوق سردار کے عہدے کی برقراری کے تعین میں زبردست عنصر تھا چنانچہ، ہومر کے بیان کردہ یونان میں لیرٹیس اور پیلیوس نے کبر سنی کے باعث سرداری ترک کر دی تھی، اور ہم بوجہ موجہ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی شخصی فوقیت خاصکر فوجی قابلیت بیشمار صورتوں میں نئی سرداری کی اصل وجہ ہوا کرتی تھی۔ ٹیسیٹس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں میں قائد جنگ اپنی بہادری کی وجہ سے منتخب ہوتا تھا، اور ہمیں اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ قدیم جماعتوں میں اکثر یہی صورت رائج تھی اور ایک کامیاب جنگی سردار جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد اپنی سرداری قائم رکھتا تھا۔ فوجی شجاعت و جنگی مہارت کے علاوہ اور فوقیتوں پر بھی لحاظ کیا جاتا تھا مثلاً مخصوص ربانی عنایت یا دیوتاؤں پر اثر ڈالنے کے ذرائع حاصل ہونے کا خیال، بقول اسپنسر قبیلہ کے دوا بتلانے والے شخص کو سرداری تک ترقی کر جانے کا نادر موقع حاصل ہوتا تھا۔ قدیم رومانی تاریخ میں توما کے قصے سے اس قسم کی ترقی کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔

پس من کل الوجوہ، میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ارتقا کی رفتار جس کے ذریعے سے مستقل موروثی بادشاہی قائم ہوئی، اس رفتار میں (جہاں کہیں بھی پر زور دماہرانہ قیادت کی ضرورت خصوصیت سے محسوس ہوئی ہو) قوی ترین شخص کے پسند کرنے کا اصول مختلف اعتبارات سے بیٹے کو باپ کا طبعی جانشین تسلیم کرنے کے میلان سے متحد و متصادم ہو گیا تھا، اور اس میلان کا ان جگہوں میں زیادہ قوی ہونا اغلب تھا، جہاں ذاتی املاک کی وراثت قطعی طور پر اخلاف کو ملتی تھی۔ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ابوی خاندان میں باپ کا اختیار سیاسی اختیار کا دلیں نمونہ تھا مگر اس میں شک نہیں کہ خاندان کے ابوی طرز کے مستحکم قیاس سے قبائلی سرداری کے استقرار و استحکام میں بہت بڑی مدد ملی۔

خطبۂ چہارم

خلاصۂ نظریۂ اصل

تقلیب از شاہی ابتدائی

اصلِ اجتماعِ سیاسی کے نظریۂ ابوتی کے متعلق مخالف و موافق شہادتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں جن نتائج تک پہونچا ہوں، انھیں میں نے اپنے آخری خطبے میں آپ کے روبرو پیش کردیا ہے جن کا مجمل سا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ ایک ناقابلِ انکار اور اہم حقیقت ہے کہ ہمیں جن ہندی جرمانی قوموں سے بالتخصیص بحث و واسطہ ہے، انکی سیاسی جماعتیں جب اپنی تاریخی حیثیت سے پہلی بار ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسے گروہوں کی صورت میں منتظم تھیں جن کی بنا حقیقی یا فرضی قرابت پر تھی کم از کم اتنا تو ضرور ہی تھا کہ جماعت کا اصلی عنصر اسی طریقہ پر مرتب و منظم ہوا تھا، خواہ اس عنصر اصلی کے گرد اور دوسرے عناصر مجتمع ہوکر اسے جس قدر چاہتے بڑھا دیتے۔[ع۱]

(۲) تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی جماعت کو (مین کی رائے کے موافق) سب سے معمر بزرگ خاندان کی مطلق العنانہ نگرانی میں خاندانوں کا مجموعہ ہونے کے بجائے ایسے عشیرات کا مجموعہ سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا جن میں سے ہر ایک عشیرے میں کئی کئی خاندان شامل ہوں۔ مشابہ یہ ہے کہ

ع۱۔ یہ امر ہمیشہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اگرچہ تام و کمل ارتباط کی بنا قرابت ہی پر تھی، مگر اصلی وجہ ارتباط (بالخصوص جنگ کے وقت میں) اتحاد کی ضرورت و آسانی پر اس درجہ مبنی ہوتی تھی کہ اس زمانہ میں اس کا پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔ علیٰ ہذا القدیم زمانوں میں جو گروہ اس طرح ممزوج ہوکر ایک ہوجاتے تھے وہ اس امتزاج کے قبل اکثر و بیشتر قرابت دار ہی ہوتے تھے، جیسا کہ روما کے رہنے والوں اور دوسری لاطینی قوموں کے درمیان واقع ہوا، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ بیشمار واقعات ایسے بھی تھے جنہیں اجنبی گروہ جذب کرلئے جاتے تھے۔ مین نے اس پر نظر ڈالی ہے، مگر غالباً اس پر کافی زور نہیں دیا ہے۔

قانون قدیم کی مدد سے جو قدیم ترین صورت حالات ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک عشیرے کے اندر خاندانوں کی جو تقسیمیں ہوا کرتی تھیں ان کی بہ نسبت خود عشائر کی تقسیمیں زیادہ نمایاں ہوتی تھیں۔ جرمنی اور غالباً اطالیہ و یونان میں بھی ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ابتدائی قبیلہ قرابتدار کے گروہوں میں منقسم تھا جن کی زمینیں زیادہ تر مشترک ہوتی تھیں اور وہ ملکر کاشتکاری کرتے تھے روما اور ایتھنز دونوں جگہ ہمیں عشائر (Gentes) یا گینے (Yeny) کے نام سے اس قسم کے گروہوں کا پتہ چلتا ہے، جنکی بنیاد بالضرور قرابتداری کے تخیل پر قائم تھی اور جو اندرونی طور پر اشتراک عبادت، کسی ایک ہی سردار کی کم و بیش اطاعت، وراثت، املاک کے حقوق باہمی، اور مصیبت، موالنست اور رفع فساد کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ذمہ داریوں کی بنا پر خود سے متحد تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آخری روابط ایک ہی خاندان کے ارکان یا کسی بڑے گروہ کے قریبی رشتہ داروں کے درمیان زیادہ قوی تھے۔ تاہم یہ روابط تمام عشیرے کو وابستہ رکھنے کے لئے پوری طرح موثر تھے، اور مختلف عشائر میں جو حد فاصل تھی ان میں سب سے زیادہ نمایاں خط یہی تھا۔

(۳) لیکن پھر بھی میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ہم عشیرے کی سرداری کی نسبت یہی سمجھیں کہ اس کا ماخذ بالعموم پدرسری یا ابوتی خاندان کے بزرگ خاندان کی خانگی نگرانی پر مبنی تھا، اور خاندان پھیل کر عشیرے کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا تو یہ نگرانی سب سے مقدم شاخ اکبر کے سب سے بڑے بیٹے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھی، کیونکہ میرے نزدیک ہم یہ فرض نہیں کر سکتے ہیں کہ خاندان کی یہ پدرسری یا ابوتی صورت ازمنۂ قدیمہ میں ہمیشہ مسلسل قائم رہی تھی۔ چنانچہ میک لینن اور دوسرے افراد نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایک ایک عورت کے متعدد شوہر ہونا اور غیر متیقن وعارضی تعلقات ازدواجی کی وجہ سے صرف عورتوں کے وسیلے سے قرابت کے پتہ چلانے کا رواج، یہ دونوں باتیں وسعت کے ساتھ رائج رہچکی ہیں اور یہ صورت مختلف نسلوں اور مختلف ملکوں میں پیش آتی رہی ہے، جس سے ہندی جرمانی قومیں بھی خارج نہیں ہیں۔ حیوانات کی تشبیہوں سے جس قسم کے ابتدائی خاندان کا نقشہ پیش نظر ہو سکتا ہے اس سے اس توجیہ کو کچھ مدد نہیں ملتی، کیونکہ حیوانات کے خاندان کی بنا شہوانی رقابت اور جسمانی طاقت پر ہے، ان میں سب سے زوردار نر اپنی ماداؤں اور ان کے بچوں پر حکومت کرتا اور ان کی نگرانی رکھتا ہے، لیکن عشیرۂ انسانی کے انتظام کے معاملے میں خاص طور پر قابل غور یہ ہے کہ کیوں بہت سے بالغ انسان کسی ایسے انسان کی

اطاعت کرتے ہیں جو جسمانی طور پر ان سے زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ جن صورتوں میں ابوتی خاندان قائم ہو گئے، اور پھر پھیل کر عشیرے بن گئے ہوں ان صورتوں میں بھی "بیٹے کے باپ کا نمائندہ ہونیکا" گونہ مصنوعی و نازک خیال اس امر کی تشریح کے لئے کافی نہیں معلوم ہوتا کہ خاندان جب پھیل کر ایک گروہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں موروثی سرداری کیوں قائم ہو جاتی ہے، خاصکر اس قسم کے ان گروہوں میں جنھیں ہم زیادہ ترقی یافتہ سلطنتوں کے اجزا کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہاں تو بالیقین سرگروہ سلطنت کی طرف نیم پدرانہ اختیارات نسلاً بعد نسل منتقل نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک منتظم کار ہوتا ہے۔ بزرگ خاندان نہیں ہوتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ عشیرے کو جس مفہوم میں میں نے لیا ہے، اس میں پدر سری خاندان کا قیام منصب سرداری کو موروثی بنا دینا بھی ضرور بالضرور ایک اہم عنصر ہوتا تھا۔ سردار کی کوشش یہ ہوتی ہوگی کہ اپنی جائداد کی طرح اپنی حیثیت کو بھی اپنے اخلاف کی طرف منتقل کر دے، اور اس کا یہ فعل دوسروں کی نظر میں ایک طبعی امر معلوم ہوتا ہوگا۔ اگر اس کا بیٹا اس کام کے لئے موزوں ہوتا ہوگا تو سب لوگ اس پر رضامند ہو جاتے ہونگے اور منصب سرداری خاندان کے اندر انتخابی ہوتا ہوگا، جیسا کہ ایک گونہ آیرستانی قبائل کا حال ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ سردار کا اختیار "اقتدار پدری" کا کامل تسلسل تھا، اور اگرچہ ایسا خیال کرنا قرین عقل ہے کہ عشیرے کا سردار تمام مشترکہ املاک کے لئے منتظم کی حیثیت رکھتا ہو، مگر اس کے ساتھ ہی اس خیال کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ اسے ان املاک پر یا عشیرے کے دوسرے ارکان پر اختیار مطلق بھی حاصل ہوتا ہو۔

اگر ہم اس امر پر زیادہ تعمق نظر سے غور کریں کہ جن جن قوموں کے معاشری ارتقائے قدیم ترین مدارج پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، ان قوموں میں سردار یا بادشاہ کے فرائض اس زمانہ میں کیا رہے ہوں گے تو میری دانست میں مذکورۂ بالا رائے تسلیم کر لی جائے گی۔ جائداد مشترکہ کے انتظام اور الوہیت کے ساتھ فرضی تعلق کو علحدہ کر دینے کے بعد یہ فرائض زیادہ تر حربی وعدالتی تھے۔ سردار کو قانون نہیں بنانا پڑتا تھا۔ کیونکہ ارتقا کی اس منزل میں قانون صرف رواج کی صورت میں ہوتا تھا جس کے بدلنے کا کسی فرد واحد یا کسی جماعت افراد کو کوئی قطعی اختیار نہیں ہوتا تھا، اور ازمنہ مابعد میں جن امور کو اندرونی عاملانہ فرائض کی حیثیت سے ممیز کیا جاتا ہے انھیں ارتقائے سیاسی کے اس ابتدائی زمانہ میں نہایت ہی معمولی حالت میں فرض کرنا پڑتا ہے عشیرہ یا قبیلے کو دوران جنگ میں کسی قائد کی اور دوران امن میں کسی عادل و منصف کی ضرورت

ہوا کرتی تھی۔ لیکن جیسا کہ مین کا دعویٰ[1] ہے قدیم ترین قانون اور رسوم قانونی کے جو آثار باقی رہ گئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ منصف کا معمولی کام (پنچایتی نوعیت کا ہوتا تھا۔ اسے خاندانوں کے ان تنازعات کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا جنھیں وہ خود اپنی مرضی سے اس کے سامنے پیش کرتے تھے اور خاصکر خونریز فسادات کا صلح و آشتی کے ساتھ طے کرا دینا اسی کا کام ہوتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ حربی و عدالتی فرائض کے لئے بہت ہی مختلف اوصاف کی ضرورت ہے۔ عام طور پر کوئی سن رسیدہ شخص جو عشیرے کے رسم و رواج کا ماہر ہو بہترین منصف ثابت ہوگا مگر جنگ کی رہبری کے لئے بھی وہی سب سے زیادہ موزوں شخص نہ ہوگا۔ اس لئے سرداری کا انحصار جہاں تک خوبی کار پر ہو ہمیں اسی قدر یہ توقع رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں فرائض اکثر ایک دوسرے سے الگ ہو جائینگے اور جیسا کہ مسٹر ٹائلر[2] کہتے ہیں واقعاً بھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ وحشی ملکوں میں مجلسی سردار اور جنگی سردار ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ نیزہ و سنان کی قوت جب ایک مرتبہ قائم ہو جاتی ہے تو پھر وہ بڑھتی ہی جاتی ہے"۔

۲۔ ان مفروضوں کو چھوڑ کر ہمیں اب اس "ابتدائی نظم حکومت" کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جسے میں اپنے مقررہ شروط و قیود کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ وہ حکومت کے اس عام طرز کے طور پر قبول کر لی جائے گی جس کا تعلق یونانیوں، رومانیوں اور جرمانیوں کے اس زمانہ کے قبائلی حالت سے ہے جسے معلومات تاریخی میں بہت ہی ابتدائی منزل قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان وسیع فرقوں کو مرعی رکھا جائے جو اختلاف ازمنہ و امکنہ کے باعث پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اس طرح ارتقائے سیاسیہ کے ہر ایک چشمہ کا عقب کی طرف پتہ لگاتے چلے جائینگے تو آخر ایک حد پر پہنچکر ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ سب چشمے ایک دوسرے سے بہت ہی ملتے جلتے واقع ہیں۔ پس اب ہمیں ہر ایک چشمے کے علٰحدہ علٰحدہ بہاؤ کی طرف چلنا چاہئے خطبہ موجودہ اور آئندہ کے پانچ خطبوں میں ہمیں زیادہ تر یونانی نظم حکومت کے ارتقا سے واسطہ پڑے گا۔ مگر اس پر بحث شروع کرنے کے قبل میں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ازمنہ جدیدہ کی سلطنتوں کی تاریخ کے بالمقابل یونان کے ارتقائے سیاسیہ کے ہیولوں پر غور کرتے ہی ایک خیالی نفع اور ایک

---

[1] قانون قدیم۔ باب دہم

[2] ملاحظہ ہو ٹائلر کی تصنیف علم الانسان باب شانزدہم۔ صفحہ ۴۳۱

حقیقی نقصان پیش آتا ہے۔ نفع تو یہ ہے کہ عمومی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے مثالیں کثرت سے موجود ہیں، البتہ واقفیت درکار ہے، لیکن یہاں یہ یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں صرف یونان خاص ہی کا خیال نہ کرنا چاہئے کیونکہ تمدن یونانی کے مرحلہ ابتدائی کے زمانہ میں یونانی تارکان وطن بحر ایجین کے جزیروں میں بھر گئے تھے، جن میں کریٹ کا سا بڑا جزیرہ بھی شامل تھا اور ایشیائے کوچک کے مغربی سواحل پر بھی پھیل گئے تھے۔ ان مقامات میں انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آزاد جماعتیں قائم کرلی تھیں۔ جو رفتار تمدن کے ساتھ ساتھ شہری سلطنتیں بن گئیں۔ زمانہ مابعد میں یونانی نوآبادیاں نظم حکومت کے اس طرز کو اور بھی دور دراز مقامات تک لیگئیں، انھوں نے اسے بحر ایڈریاٹک کے سواحل تک پہنچایا، اور جنوبی اطالیہ کو "یونان کبیر" بنادیا، سسلی کے بہت بڑے حصہ پر پھیل گئے۔ شمال میں کریمیہ تک پہنچ گئے، مشرق میں بحر یوکسین (بحیرۂ اسود) کے سواحل کو گھیر لیا۔ جنوب میں لیبیہ (طرابلس) میں داخل ہوگئے۔ انتہا یہ ہے کہ مغرب میں مارسیلز تک جا پہنچے۔ اس سے بآسانی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آزاد شہری سلطنتیں سینکڑوں کی تعداد میں وجود پذیر ہوگئی تھیں، اور ان کے نظمہائے حکومت کا باہمی مقابلہ، عام نتیجہ اخذ کرنے کے لئے زرخیز زمین مہیا کردیتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر وبیشتر سلطنتوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت ہی خفیف وجزوی قسم کے ہیں۔ جن دساتیر کا ہمیں کسی قدر کامل علم حاصل ہے وہ صرف اسپارٹا اور ایتھنز کے دساتیر ہیں۔ دوسری سلطنتوں کے متعلق میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم غالباً ان کے نہایت ہی اہم آئینی تغیرات سے آگاہ ہیں، لیکن اکثر حالتوں میں ہم اتنا بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ یونانی شہری سلطنتوں کی حکومت کی صورتوں میں جو تغیرات ہوئے ان کی بابت قابل اطمینان طور پر صرف چند ہی وسیع تعمیمات حاصل ہوسکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسپارٹا واتھنز کو نمونہ قرار دے کر ہم کہاں تک ان سے عام نتائج اخذ کرسکتے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ ہم قدیم تاریخ کے متعلق کسی حد تک ایسا کرسکتے ہیں کہ اسپارٹا کو ایک ایسی ملت کا نمونہ قرار دیں جس میں ایک فاتح قبیلہ ایک مفتوح ملت پر بہمہ وجوہ حاوی ہوگیا ہو، اور فاتح ایک ایسی حکمران جماعت بن گئے ہوں جس نے تمام سیاسی حقوق کو اپنے قبضہ میں کرلیا ہو اور دوسری طرف اٹیکا کو ایک ایسی ملت کا نمونہ سمجھیں جو قبائلی حالت سے گزر کر شہری سلطنت کی صورت اختیار کرتے وقت "مجتمع ہوگئی ہو" اور فتح کے کسی اثر کا اس میں پتہ نہ چلتا ہو۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایتھنز کو ایک ایسا نمونہ سمجھنا چاہئے جس سے ایک بڑی حد تک

پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کی یونانی عمومیت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ ایک حد تک طبعی نقل وتقلید کے اثر سے ہوا بجائے خود اور یہ نتیجہ تھا اس کا کہ چھٹی صدی کے اواخر (یعنی ۵۱۰ ق م) میں خود سر حکمرانوں کے نکال دینے اور خاصکر پانچویں صدی کے ربع اول میں ایرانی حملوں کے کامیابی کے ساتھ روک دینے کے بعد ایتھنز کی حیثیت ومنزلت میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ بحری شہنشاہی کی وجہ سے ایتھنز کو ایک گونہ دار الصدر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی جس نے اسے دوسرے شہروں سے بہت کچھ ممیز کر دیا تھا۔ ایتھنز کی شان وشوکت کی بڑی وجہ اس کی یہی شہنشاہی حیثیت تھی۔ اور اس کی سیاسی زندگی کے کمال کا یہ زور اس بنا پر تھا کہ اسے اپنی شہنشاہی پر حکمرانی کا کام انجام دینا پڑتا تھا، اور پھر دوسری طرف مالی طور پر اسے اپنے محکوم شہروں کی امداد سے تقویت پہنچتی تھی، مگر جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں اسے پیش نظر رکھتے ہوئے بھی، ہر طرح پر اغلب یہی ہے کہ پانچویں اور چوتھی صدیوں میں جن یونانی سلطنتوں نے عمومیت کی طرف قدم بڑھائے ان پر بہت قوی اثر ایتھنز کی مثال کا تھا اور ان کا میلان یہی تھا کہ ایتھنز کی نقل کی جائے، لیکن اسی طرح یہ فرض کر لینا بڑی غلطی ہوگی کہ اسپارٹا یونانی عدیدیات کا نمونہ تھا۔ اسپارٹا کے دستور کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آپ اپنی نظیر تھا اور اگرچہ اہل اسپارٹا دوسرے مقامات میں عمومیت کے مقابلہ میں عدیدیات کی پشت پناہی کرتے تھے، مگر وہ ان وسائیر سلطنت کی حمایت نہیں کرتے تھے جو خود انہیں کے دستور سلطنت کے ہم مثل تھے۔

۳۔ اب ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ جن نسلوں کے متعلق ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، ان کے ابتدائی مدارج ترقی میں قبیلے کی اعلیٰ سرداری یعنی بادشاہی کی جانب کس طرح قدم بڑھے۔ چونکہ قدیم نظم حکومت میں فرائض حکومت کی سہ گانہ تقسیم بادشاہ، (یعنی سردار اعلیٰ) سرداران ماتحت اور مجلس احرار کے مابین ہوا کرتی تھی، اس لئے اس سہ گانہ تقسیم کی وجہ سے یہ خیال کرنا ایک طبعی امر ہے کہ حکومت کی وہ تین قسمیں جنھیں پانچویں اور چوتھی صدی کے اہل یونان عام طور پر بادشاہی، عدیدی یا اعیانی اور عمومی حکومتوں کے نام سے ممیز کرتے تھے، وہ مختلف اوقات میں اپنے عناصر میں سے کسی ایک عنصر کے غالب ہو جانے سے ظہور پذیر ہوتی تھیں۔ اور یہ قیاس بھی طبعی ہے کہ ان کا غلبہ یکے بعد دیگرے، واحد، متعدد، اور اکثر کی ترتیب میں ہوا کرتا تھا بادشاہی جب آزاد ہو جاتی تھی تو اس کے خلاف تحریک پیدا ہو جاتی تھی

جس سے اختیار سرداران ماتحت میں سے امرا کے ہاتھ میں آجاتا تھا اور جب اپنی باری میں چند اشخاص کی یہ حکومت بھی مردم آزاری پر اتر آتی تھی تو اسی طرح متغیر ہوکر حکومت میں زیادہ عمومیت پیدا ہو جاتی تھی۔

دوسری صدی قبل مسیح کے مورخ پولی بیوس نے دساتیر سلطنت کی طبعی ترتیب کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ درحقیقت یہی ہے پولی بیوس نے یونان پر رومانیوں کے تسلط کو قائم ہوتے دیکھا تھا اور اس وجہ سے ان یونانی مصنفوں کی طرح جنھیں آزاد یونان سے شخصی دلچسپی تھی، اس کی نگاہیں بالتخصیص روما کی طرف لگی ہوئی تھیں روما نے (۱۴۶ق م میں) یونان کو جب پہلی مرتبہ زیر کیا ہے، اس واقعہ کو اس نے بچشم خود دیکھا تھا اور اس سے قبل بحالت جلاوطنی وہ سترہ برس کا زمانہ اطالیہ میں بسر کر چکا تھا، اس لئے ارسطو کے برعکس، جس کی رائے کا ذکر میں بعد کو کروں گا، پولی بیوس نے نظم حکومت کے ارتقا کے متعلق جو عام نتیجے اخذ کئے ہیں وہ روما کے اس غلبے کے زمانے میں لامحالہ روما و یونان دونوں کے تجربے کی بنا پر قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی تعمیم کے مطابق، نظم حکومت کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ طبعی طور پر مدارج ذیل سے گزرتا ہے۔ شاہی میں جب خرابیاں رونما ہوتی ہیں تو وہ اسے خودسری کے غار میں گرا تی ہے۔ پھر اس خودسر حکمران کی عیش پرستی اور بے حجابانہ بداطواری اسے بدنام ومبغوض بنا دیتی ہے اور اعیانی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ پھر جب یہ حکمران جماعت مال و دولت کی طمع اور بدمستی وعیش پرستی میں غرق ہو جاتی اور دونوں صورتوں میں ظلم وستم پر اتر آتی ہے تو یہ اعیانی حکومت اپنی باری میں عدیدیت کی ذلیل سطح پر آجاتی ہے، اور عوام میں اس جور وستم کے خلاف مقاومت وانتقام کا جوش پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے عمومی سلطنت قائم ہو جاتی ہے، پھر جب عوام بھی اپنی باری میں سرمست وبے قید ہو جاتے ہیں تو عمومیت انارکی وحامیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے یہاں تک کہ پھر کوئی بادشاہ قوم پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہی دور پھر شروع ہوتا ہے۔

ابتدائی مراحل اور خاصکر جائز بادشاہ اور اعیانیت کے درمیانی زمانے میں متعلق الوہیئن بادشاہ کے غلبہ کی بابت یہ خاکہ روما کی تاریخ سے قطعی مطابقت رکھتا ہے، اور پولی بیوس نے بھی صاف لفظوں میں اسے ظاہر کیا ہے گو روایات میں ہر طرح کا عدم تیقن ہے، پھر بھی ہمیں صاف یہ نظر آسکتا ہے کہ روما میں زمانہ مابعد کی بادشاہی سابق بادشاہی کی بہ نسبت زیادہ جابرانہ اور زیادہ مردم آزار تھی، اور بادشاہوں سے جب ایک مرتبہ گلو خلاصی حاصل ہو گئی تو

پھر وہ واپس نہیں آئے۔ جس شدت وغضب کے ساتھ بادشاہی کا خاتمہ ہوا تھا اس کی وجہ سے عوام کے دلوں میں بغض ونفرت کی جو یاد قائم ہوگئی تھی اسے ان مجسٹریٹوں نے جو بادشاہوں کے بعد حکمران رہے تھے کامیابی کے ساتھ برقرار رکھا۔ بقول موم سن رومانی عوام پر "بادشاہ" کا لفظ وہی اثر رکھتا تھا جو پاپائیت کے لفظ کا انگریزی عوام پر پڑتا ہے سلطنت روما جبتک شہری سلطنت رہی، بادشاہی کا کہیں ذکر بھی سننے میں نہیں آتا تھا۔ روما جب بڑھ کر ایک ملکی سلطنت بن گیا اور ایک شہنشاہی اس کے تابع ہوگئی اس وقت بادشاہی پھر قائم ہوئی کیونکہ اس جثہ عظیم کو باہم مربوط رکھنے کے لئے بظاہر ایک ایسے ہی کارکن کا ہونا لازمی معلوم ہوتا تھا۔

اسی قسم کے ایک دو شدید رد وبدل کا ذکر ہم یونان میں بھی سنتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ انہیں میں سے ایک واقعہ کا پولی بیوس پر خاص اثر پڑا، اور غالباً روما کے واقعات کے ساتھ ملکر یہی اس کا باعث ہوا کہ اس نے مذکورۂ بالا تعمیم قائم کی۔ یہ اکائیہ کی ایک روایت ہے۔ اکائیہ شمال پیلوپونیز میں ملک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو یونان کی شہری سلطنتوں کے درخشاں دور میں بہت ہی گمنام سا تھا، لیکن بعد کو تیسری صدی قبل مسیح میں، اکائیائی لیگ کے عنصر اولین کی حیثیت سے بہت ہی اہم بن گیا ہم یونانی تاریخ کے اوائل میں اہل اکائیہ کا لفظ ہومر کی زبان سے عام اہل یونان کے لئے استعمال ہوتا سنتے ہیں، اور آخر زمانہ میں عہد نامہ جدید کے اندر اکائیہ کا لفظ دیکھتے ہیں، مگر درمیانی زمانہ میں ان کا مذکور بہت ہی کم سننے میں آتا ہے۔ بہرحال پولی بیوس[عہ] یہ کہتا ہے کہ اکائیہ میں بادشاہی کا خاتمہ اس وجہ سے ہوا کہ لوگ آخری بادشاہ کے بیٹوں سے ناراض ہوگئے تھے کیونکہ وہ قانون کے مطابق نہیں بلکہ خودسری کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اور اس لئے لوگوں نے حکومت کو "عمومیت" میں بدل دیا۔ اس بیان سے اس عام قاعدہ کے ظاہری استثنا پر کیا اہم اثر پڑتا ہے کہ بادشاہی کے بعد اعیانی حکومت قائم ہوتی ہے اس پر میں ابھی آگے چلکر گفتگو کرونگا۔ اس وقت میں اس کا ذکر صرف اس غرض سے کرتا ہوں کہ شاہی حکومت کی ظالمانہ جبر وتعدی کے انقلابی طور پر بدل جانے کی یہ ایک مثال ہے۔

عہ۔ تاریخ پولی بیوس جلد دوم ۴۱۔

اسی قسم کے رد و بدل کی دو ایک اور مثالیں بھی سننے میں آتی ہیں[۱]۔ لیکن اگرچہ اپنی نامکمل واقفیت کی وجہ سے ہم تیقن کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے[۲]، تاہم میرا خیال ہے کہ ان مثالوں کو فی الجملہ مستثنیات سے سمجھنا چاہیئے۔ تھیسز، تھیبس[۳] اور ارگوس[۴] میں شاہی طاقت کا انتزاع بالیقین باامن طریق پر بیان کیا جاتا ہے، اور میرے خیال میں ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ تغیر کم و بیش پر امن ہی تھا یا کم از کم یہ کہ عدیدیت میں بدل جانے کے بعد بھی حکومت شاہی خاندان ہی کے اندر رہی۔ وہاں مطلق العنانی کے خلاف یہ تغیر جبر و زیادتی کے ساتھ نہیں ہوا تھا اس کی متعدد مثالیں ہمیں معلوم ہیں۔ کورنتھ میں بکیائی خاندان، یعنی سوس اور ایرتھرائے (واقع ایشیائے کوچک) میں بازیلیائی خاندان متی لنہ (واقع لبسوس میں)، پنتھی لیائی خاندان اور لاریسہ (واقع تھسلی میں) الیوپائی خاندان کی مشہور عدیدات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ان تمام صورتوں میں جب مدت دراز کی شاہی کا خاتمہ ہوا ہے تو حکومت کے اہم عہدے بدستور شاہی خاندان ہی کے اندر محدود رہے[۵]۔ اس کا مقابلہ روما سے خاندان ٹارکیوئن کے اخراج کے ساتھ کیجیئے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ دونوں میں جو فرق ہے اس کے اعتبار سے اول الذکر کو شاہی کے عدیدیت میں بدل جانے کی باامن صورت گننا چاہیئے۔

بس میرا خیال یہ ہے کہ ہم ان شواہد سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یونان میں شاہی کا عدیدیت میں بدل جانا اکثر تدریجا واقع ہوتا تھا۔ اور اس میں انقلابی زیادتیوں سے کوئی بڑا صدمہ نہیں پہنچا تھا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یونانی نظم سیاسی کا جو پہلا ہی تذکرہ سننے میں آتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیمی طرز کی بادشاہی رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر استحقاق خاص کی صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ (ابتدائی طرز کی بادشاہی میں بادشاہ کے فرائض قانون و رواج سے محدود تھے

۱۔ ساموس، پلوٹارک، باب ۵، شاہیہ مگارا، پئوسانیاس جلد اول باب ۴۳، اور آرکیڈیا، پئوسانیاس ہشتم باب پنجم ۱۲، اگرچہ ارکیڈیا کے ان بادشاہوں کے اختیار کی وسعت و نوعیت بہت ہی مشکوک ہے۔

۲۔ پئوسانیاس جلد نہم باب پنجم ۱۶۔

۳۔ پئوسانیاس جلد دوم باب نوزدہم۔

۴۔ شاہی خاندان کے لفظ کو وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

دو سو سے زائد لوگوں کا ایک وسیع خاندان۔

اور رواجاً مجلس خاص اور جمعیت بھی ان فرائض میں شریک تھیں) ہومر کے تحریرات میں جب ہم "ایلیاڈ"[عہ ۱] سے گزر کر "اوڈیسی" پر پہنچتے ہیں تو یہ قدیمی بادشاہی زوال پذیر نظر آتی ہے، اور جیساکہ میں کہہ چکا ہوں اس حد پر پہنچکر بادشاہ کے لئے "بازی لیوس" کا لقب بھی استعمال ہوتا ہے، حالانکہ یہی لفظ ایلیاڈ میں ہمیشہ بزرگ قوم یا اس کے بیٹوں کے لئے استعمال ہوا ہے[عہ ۲] مگر جب ہم اوڈیسی تک پہنچتے ہیں تو بازی لیوس میں بادشاہ کے بجائے سردار کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ حالت نظم کے ابتدا ہی میں ظاہر ہوگئی ہے، اور اس فقرہ کا حوالہ پہلے ہی دیا جاچکا ہے، جہاں ٹیلے ماکوس نے یہ کہا ہے کہ اتھاکا کے اکائیوں کے بہت سے سردار "بازی لیس" ہیں، حالانکہ (جیساکہ بعد میں ظاہر ہوا) اس جزیرے میں صرف ایک ہی شہر تھا اور اس کے کل باشندے ایک ہی خاندان سے تھے اور ان کی ایک ہی مجلس ملکی تھی۔ اس کے بعد پھر جب اوڈی سیوس اپنے سفر میں بھٹک رہا کے پر فضا ساحل پر جا ٹھیرا، جہاں ہمزہ فینقی رہتے تھے (اور جن کی حالت انتہائی مرفہ الحالی و خوش باشی کی بیان کی گئی ہے) تو ہم ان کے سردار اعلیٰ الکی نواس کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ یہاں بارہ ذی شان سردار ہیں جو اس قوم پر حکومت کرتے ہیں، اور میں خود تیرہواں ہوں[عہ ۳] اس سے یہ ظاہر ہے کہ بادشاہی عدیدیت کی طرف تبدیل ہو رہی تھی[عہ ۴]

اگرچہ روما کی بہ نسبت یونان میں بہت ہی کم کوئی ایسا ثبوت ملتا ہے جس سے یہ واضح ہو کہ عدیدیت کا وقوع پذیر ہونا شاہی طاقت کی ظالمانہ توسیع کے بالمقابل تحریک کا نتیجہ تھا تاہم یونانی نظم حکومت کے ارتقا میں شاہی مطلق العنانی کو اہم منزلت حاصل تھی۔ لیکن وہ عدیدیت

عہ ۱۔ خطبہ دوم صفحہ ۱

عہ ۲۔ "اوڈیسی" جلد ہشتم ۳۹۱۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ فینقیہ میں بازی لیوس ماتحت بادشاہ تھے جو جدا جدا اضلاع پر حکومت کرتے تھے اور ان میں کسی قدر اتحاد باہمی کی صورت وقوع پذیر ہوگئی تھی۔

عہ ۳۔ اس تغیر کی صورتیں حسب ذیل معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) کبھی تو ایک ہی سردار بالعموم ایک برس کیلئے منتخب ہوتا تھا، اور اس کے فرائض خاصکر مذہبی فرائض گھٹا دئے جاتے تھے۔ (مقابلہ کیجئے ارسطو کی "سیاسیات" سوم ۹ ۸)

(ب) کبھی سرداروں کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ مقابلہ کیجئے کا یم (ڈپلومارک صفحہ ۳۶)، اس (کلاز ۲۵۳)۔ مٹلین (کلاز ۲۲) جیساکہ گلبرٹ کہتا ہے میرا یہ خیال نہیں ہے کہ اس میں سرداری پجاری کے فرائض تک محدود تھی۔

کے بعد واقع ہوئی ہے نہ کہ اس کے قبل اور جتنی صورتیں ہمیں فی الواقع معلوم ہیں ان سب میں یہ شاہی طریق ایک بے قاعدہ و غیر آئینی مطلق العنانی ہی کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس بادشاہی کو یونانی لفظ تیرانس (خودسری) سے ہی تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی نوعیت اس کے اسباب، اور اس کے ارتقا پر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بعد کے ایک خطبہ میں بحث کروں گا۔ سردست صرف اس خیال سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یونانی اور رومانی دساتیر کے ارتقا میں جو نہایت اہم فرق ہے وہ واضح ہو جائے۔ مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونانی ارتقا کی ترتیب میں مطلق العنان بادشاہی کا درجہ کم رواج قدیم شاہی اور عدیدیت کے مابین نہیں تھا، بلکہ عدیدیت اور عمومیت کے درمیان تھا، روما کی طرح یہاں تیرانس (خودسر) کسی قدیم سلسلہ کا بادشاہ نہیں ہوتا تھا جو قدیم قانون و رواج کی حد سے تجاوز کر کے اپنے اختیار کو آزادانہ طریق پر استعمال کرتا ہو بلکہ وہ کوئی بلند حوصلہ رہبر قوم ہوتا تھا جو عامۃ الناس کی تائید و امداد سے شاہی اختیار کو جفاکار عدیدیوں کے ہاتھوں سے نکال لیتا تھا۔

۴۔ ارتقائے سیاسی نے یونانی، رومانی و جرمانی انداز پر جو تین مختلف راہیں اختیار کی ہیں ان کے عام تبصرے کی تکمیل ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ یونان و جرمنی میں جو نمایاں فرق ہے اب اپنی توجہ اس کی طرف منعطف کریں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم جرمانی تاریخ میں، یہ تحریک شاہی کی طرف مائل تھی، جو لیس قیصر نے جرمانی قبائل کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنوز ان میں بادشاہی کی تنظیم نہیں ہوئی تھی مگر بتدریج اس کا رواج ہر جگہ ہو گیا، اور ایک مرتبہ مقبول ہو جانے کے بعد اسے حیرت انگیز استقامت حاصل ہو گئی، کیونکہ وہ ازمنہ وسطی سے گزر کر دور جدید تک بھی برابر قائم ہے، برخلاف اس کے یونان میں اس کے متعلق جو کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں اس کی رفتار دوسری ہی جانب ہے، ہومر کے زمانے اور اس قدیم ترین تاریخی دور کے مابین جسے واقعی، تاریخی زمانہ کہہ سکتے ہیں یونان خاص کی اکثر و بیشتر سلطنتوں میں بادشاہی، عدیدیت کی صورت میں بدل گئی تھی۔ چند مستثنیات میں سے ایک استثنا اسپارٹا تھا، جس کی نسبت میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہاں قدیم ادارات مصنوعی طور پر محفوظ رکھے گئے تھے، لیکن یہاں بھی بادشاہ کی حیثیت موروثی سپہ سالار اعظم کی سی ہو گئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا تھی۔؟
اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس وقت اہل

جرمنی ہنوز ارتقا کی زیادہ ابتدائی حالت میں تھے، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ یونان میں تہذیب جس روش پر چل رہی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی مربوط سلطنتوں کو ترقی حاصل ہو اور آخر الامر اعلیٰ درجے کی متمدن سلطنتوں میں اس روش نے شہری خصوصیت پیدا کر لی۔ اور "شہر و سلطنت" کا مفہوم ایک ہو گیا۔ برخلاف اس کے جب جرمانیوں نے رومانی شہنشاہی کے اثر میں آ کر تہذیب و تمدن کی طرف قدم بڑھائے تو اس وقت ایک مہذب "دستور" کا مفہوم (جس سے وہ اس طرح روشناس ہوئے تھے) یہ تھا کہ سلطنت ایک وسیع قطعۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہو، اور بلاد اس کے اندر ایک مربوط نظم سیاسی کے عناصر ماتحت کے طور پر داخل ہوں، اور جب شہنشاہی روما کا شیرازہ بکھر چلا اور نئی سلطنتیں بننے لگیں جن میں شہنشاہی کے مفتوح و نیم وحشی اجزا مرتب و مربوط قوموں کی شکل اختیار کرتے جاتے تھے تو ان صدیوں میں "ملکی سلطنت" کا یہی خیال ان کے ارتقا پر غالب و حاوی تھا۔

ازمنۂ جدید کی سلطنت کے عناصر کی حیثیت سے "شہر و دیہہ" کے فرق کے جو اہم اثرات ہیں ہم ان کے خوگر ہو گئے ہیں، مگر ہم اس فرق کی وسیع تاریخی اہمیت پر ہمیشہ پوری طرح غور نہیں کرتے۔ قدیم یورپ کے تمدن کی تاریخ ایک ایسی معاشری زندگی کی تاریخ ہے جس کا مرکز شہر تھا، اور جہاں سے تمدن کی شعاعیں نکل کر مضافات و دیہات پر دھندلا سا عکس ڈالتی تھیں۔ برخلاف اس کے، ازمنۂ جدید کے یورپ کی قرون وسطیٰ (نشاۃ جدیدہ) کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسی فاتح نسل کے عادات نے اس تمدن میں بہت کچھ فرق کر دیا تھا جو بالتخصیص دیہاتی زندگی بسر کرنے کی شائق تھی، اور متمدن ہو جانے کے بعد بھی اس نے مدتوں اپنی خصوصیت کو قائم رکھا تھا۔

پس یونانی سیاسیات اور ازمنۂ جدید کی یورپی سیاسیات میں یہ ایک نہایت ہی حقیقی فرق ہے کہ بلند ترین تمدن پر پہنچے ہوئے یونانیوں کا سیاسی مطمح نظر دراصل شہری سلطنت رہا ہے اسی فرق سے بہت سے دوسرے فرق پیدا ہو گئے ہیں، یہ حالت یونانی تاریخ کے اعلیٰ ترین تمدن کے زمانے کی تھی اور کم از کم مقدونوی غلبہ تک تو یہی حالت تھی۔ اس دور کے یونانی ایسی بربری اقوام نیز وسیع ایرانی شہنشاہی کے حالات سے بھی بالضرور واقف رہے ہوں گے، جہاں ایک حکومت وسیع ممالک پر حکمرانی کرتی تھی پھر بھی ان کے ذہن میں اس خیال کا آنا دشوار تھا کہ کوئی ایسی قوم و ملت جس کی سیاسی زندگی ایک ہی شہر کے اندر مرکوز نہ ہو وہ کسی قسم کا

اعلیٰ سیاسی نظم و نسق قائم کر سکتی ہے[۱]۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں شہر کے حدود سے متجاوز ایک طرح کا قوی احساس موجود تھا، وہ ان روابط کو مانتے تھے جو ایک دوریانی کو دوسرے دوریانی سے یا ایک "ہیلنی" کو دوسرے "ہیلنی" سے وابستہ کرتے تھے، لیکن ایک اچھے شہری میں خاص اپنے شہر کے متعلق حب الوطنی کے جو جذبات موجزن ہوتے تھے ان کے مقابلے میں یہ حسیات بالعموم کمزور سے ہوتے تھے انھیں حسیات کا یہ اثر تھا کہ وہ مذہبی رسوم و تقاریب میں دوسرے یونانیوں (Hellenes) کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے، اور جنگ کے موقع پر غیر ملکی دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرتے تھے، اور شاید ایسے معاہدے بھی قائم کر سکتے تھے جن میں دوام و قیام مدنظر ہوتا تھا مگر بایں ہمہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا سیاسی اتحاد قائم کریں جس میں خاص اپنے شہر کی تفردی حیثیت کے قربان کر دینے کا احتمال ہو۔ اس عام بیان کے خلاف مستثنیات اگرچہ بہت سے ہیں لیکن زیادہ تر وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ ان یونانیوں میں پائے جاتے تھے جو سیاسی و معاشری ارتقا میں سربر آوردہ سلطنتوں سے پیچھے تھے، یا شدائد زمانہ نے مجبور کر دیا تھا کہ دل خوش کن خیالات کو خیرباد کہہ کر واقعات پر کاربند ہوں، ایک طرف (بقول فریمین[۲]) "ساحل اکائیہ کے قابل تعریف مگر گمنام قصبات ایتولیہ کے قزاق اور اہل اکارنانیہ، فوکس وغیرہ کے ایسے ہیلینی جماعت کے بعض کم ترقی یافتہ ارکان میں (جہاں تک پیچھے ہٹ کر ان کی تاریخ سے سراغ ملتا ہے) نظم حکومت کے کچھ ابتدائی اجزا ایسے پائے جاتے ہیں جن سے بخوبی نہیں اس امر کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کا شمار متفقی دولت عامہ میں کیا جائے۔ دوسری طرف، یونانی تاریخ سے بہت سے ایسے شہروں کے حالات معلوم ہوتے ہیں جن میں یونانی تہذیب پوری طرح دائر و سائر تھی۔ پھر بھی وہ دوسرے شہروں کی حکومت کے مطیع ہو گئے تھے، لیکن یہ اطاعت زیادہ تر بادل ناخواستہ تھی اور اس میں ایک طرح کی پستی کا احساس پایا جاتا تھا۔ بہرحال یونان کے عروج و اقبال کے زمانے میں متمدن یونانیوں کی نسبت عام طور پر یہی کہنا صحیح ہے کہ ان میں کا کوئی فرد قومیت کے وسیع حلقوں کا

---

[۱] ۔ اگرچہ ایک اعتبار سے اسپارٹا ایک شہر نہیں بلکہ پانچ متصل دیہات کا مجموعہ تھا تاہم اس میں ایک ہی شہر ہونے کے سیاسی خصوصیات موجود تھے اسکی ایک ہی مشترک جمعیت ملی تھی اور آپس میں بہت گہرا ربط ضبط قائم تھا

[۲] ۔ "تاریخ حکومت وفاقیہ" باب دوم صفحہ ۱۶ (طبع ثانی)

کیسا ہی کچھ احساس کیوں نہ رکھتا ہو مگر اس کا شہر ہی وہ سیاسی کائنات تھی جس کی نسبت وہ نہایت پر زور طور پر یہ سمجھتا تھا کہ وہ خود اس کا ایک جزو ہے۔ خواہ اس کا یہ شہر واقعتاً ایتھنز یا اسپارٹا کے تابع ہو گیا ہو، مگر اپنے اس شہر ہی کی آزادی اس کا دین و ایمان تھی۔

یونان کے منتہائے خیال کے متعلق اس رائے کا پر زور اظہار افلاطون و ارسطو کے ایسے فلاسفہ کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں جلیل القدر ارباب فکر اور مسائل میں ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف الرائے کیوں نہوں مگر اس ایک خیال پر دونوں متفق ہیں کہ سیاسی جمعیت کا منتہائے خیال ایک واحد شہر ہی ہے جس کے ساتھ مضافات کا اتنا حصہ شامل ہو جس سے اس کے باشندوں کے مادی ضروریات پورے ہو جائیں۔ ان کے ذہن میں یہ نہیں آتا تھا کہ ایک آزاد و متمدن ملت پر اگر فی الواقع اچھی حکمرانی کی ضرورت ہے تو پھر اس کا انتظام ایک شہر سے زیادہ حلقے میں کیوں کر ہو سکتا ہے۔

جن مختلف اسباب کے جمع ہو جانے سے یہ نتیجہ پیدا ہوا انہیں ہم اچھی طرح سے ممیز کر سکتے ہیں۔

(۱) دیہات سے علحدہ ہو کر قصبے یا شہر کے نشو و نما کا اولین سبب بالضرور اقتصادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بنا یہی ہے کہ مجموعۃً دیہات کی بہ نسبت زیادہ لوگ جو ایک دوسرے سے متصل عمارات میں رہتے اور تجارت و صنعت میں مشغول ہوتے ہیں، ان میں مبادلے کی آسانی پیدا ہو جاتی ہے مگر

(۲) قصبے کے اندر جس طرح عادتاً ایک دوسرے کے تجربہ و خیالات سے افادہ و استفادہ کے طرح طرح کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ، وسعت معاشرت اور باقاعدہ تقاریب سے دل کھول کر لطف اٹھانے کی عام خواہش جس خوبی سے پوری ہو سکتی ہے وہ بات دیہات میں نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ شہری تہذیب دیہاتی تہذیب سے بہت آگے بڑھ جاتی ہے، خاصکر چھاپے کی دریافت کے قبل تو یہ حالت بہت قوی تھی۔ پس لامحالہ یونانی یہی سمجھتے تھے کہ شہروں کے ساتھ مہذب زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، کیونکہ شہر ہی میں وہ بازار، واقع تھے جہاں لوگ روزانہ جمع ہوتے تھے، وہیں نقش و نگار سے آراستہ مندر اور طاق و رواق تھے، وہیں موسیقی اور نظم خوانی کے لئے تھیٹر تھے اور وہیں ورزشوں کے لئے اکھاڑے تھے۔

لیکن جس توضیح و تشریح کی ضرورت ہے، یہ سب باتیں اس کا ایک جزو ہیں۔ ساری دنیا میں یہی ہوا ہے کہ تہذیب نے شہروں ہی کے اندر نشو و نما پائی ہے۔ یونان کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ وہاں شہر (ایک دوسرے سے) آزاد تھے، اور ان کی قومی زندگی پُر زور د مربوط تھی، اور طبعی حالات کے متعلق میں اس سے پہلے ہی توجہ دلا چکا ہوں کہ اس آزادی کے پیدا کرنے میں اس کا بھی بڑا دخل تھا۔ یہ طبعی حالت کیا تھی؟ یہ یونان کی ساخت ارضی تھی۔ خشکی کے راستے سے مختلف مقامات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا، اور سمندر کی طرف سے وسائل آمد و رفت میں آسانی پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی قبائل کی طبیعتوں میں دو خصلتیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔ ایک طرف تو وہ غیروں سے آزاد رہنا چاہتے تھے اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے اندر اعانت باہمی اور مجموعی عزت و برتری کا پاس و لحاظ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ یہ وہی خصائل ہیں جو ان تمام کوہستانیوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں ذہنی بیداری پیدا ہو گئی ہو اور بحر آشنا قوم کے انواع و اقسام کے تجربات انھیں حاصل ہو گئے ہوں۔

(۳)۔ یونانیوں میں سیاسی ارتقا کو شہری زندگی کے ساتھ منسوب کرنے کا جو میلان تھا اس کے لئے (اس آزادی کے مان لینے کے بعد) ہم ایک تیسری اہم وجہ یہ قرار دے سکتے ہیں کہ چار دیواری سے گھرے ہوئے شہر، دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے بڑا کام دیتے تھے اس سے شہری زندگی، دیہاتی زندگی کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ پر لطف اور زیادہ بلند ہو جاتی تھی بلکہ زیادہ محفوظ بھی ہو جاتی تھی۔ دیہات والے جب کسی حملہ آور دشمن سے میدان میں جم کر لڑ نہیں سکتے تھے تو انھیں یا تو دشوار گزار پہاڑوں میں پناہ لینا پڑتی تھی، یا چھوٹے چھوٹے حصاروں میں ابتری کے ساتھ بند ہو جانا پڑتا تھا، جہاں ان کی معمولی زندگی کے کاروبار نہیں ہو سکتے تھے، لیکن شہری زندگی کی کیفیت یہ تھی کہ جنگ پیلوپونیز کے دوران میں ایتھنز کی شہری زندگی پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی، خواہ یہ دیکھنا کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہوتا ہو کہ لاکے ڈیمون والے کسی کے جو کے کھیت اور پھلوں کے درخت کاٹے ڈالتے ہوں، اور ٹھنڈی راتوں میں نکل کر نگہبانی کا کام انجام دینا ہوتا ہو۔[1]

[1] لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ تمام بڑے بڑے شہروں کا دیواروں سے محفوظ کئے جانے کا عام رواج

اس کے بعد جب یونانیوں کے دلوں میں بتدریج سلطنت کی مجموعی حیثیت کا وہ تصور قائم ہوا جس میں افراد بمنزلہ اجزا کے ہوں اور جس کے مقاصد کے لئے ہر ایک فرد واحد کے مقاصد و اغراض جائز طور پر نثار کئے جا سکتے ہوں اور جس کی مرضی کے مقابلے میں (جس کا اظہار دستور سلطنت قوانین کے ذریعہ سے ہوتا تھا) تمام اعلیٰ و ادنیٰ حکام کی مرضی پست و فروتر ہو، اسی زمانے میں شہر کی نسبت یہ خیال پیدا ہوا کہ شہر اسی باطنی سیاسی نظم کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ زیادہ وسیع سلطنت میں یہ اہلیت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ وہ ان مدنی فرائض کو موثر طور پر انجام دے سکے کیونکہ اس قسم کی سلطنت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ تمام باشندے ایک جمعیت میں جمع ہو سکیں، اور ایک نقیب کے اعلان سب سن سکیں "جو زیادہ بلند آواز نہ ہو" اور پھر وہ کیوں کر ایک دوسرے کے خصائل و شمائل سے واقف ہو سکتے تھے، حالانکہ عدالتی معاملات کے تصفیوں اور حسب لیاقت عہدوں کے تقسیم کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔[۱]

پس جہاں ایک طرف شہر کے مادی اتحاد، اور اس کی وجہ سے ہر طرح کے شغل معیشت کا اجتماع سلطنت کے تصور کے ارتقا اور اس کے لوازمہ عادات و جذبہ حب الوطنی کو ترقی دیتا تھا، وہیں دوسری طرف شہری زندگی کے ساتھ سیاسی زندگی کیسا تھ اس لاینفک طریق سے وابستہ ہو جانے نے شہری ملت کی نسبت اس یونانی خیال کی تکمیل کر دی تھی کہ انسانی اجتماع کی یہی سب سے اعلیٰ و آخری صورت ہے، شہری ملت سے مراد وہ لوگ تھے جو ایک ضلع کے اندر رہتے ہوں جس کا مرکز ایک شہر ہو۔

۵۔ یہ بھی خیال رہے کہ دیہاتوں سے قصبوں اور چھوٹے قصبوں سے بڑے قصبوں (شہروں) کی طرف منتقل ہونے کی کارروائی اکثر نیم لازمی سی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایتھنز و روما کے حالات میں قصوں اور افسانوں کے غبار میں جو دھندلے سے نشانات نظر آتے ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ابتدائی بادشاہوں کی حرص و طمع سے اس کارروائی میں پر زور مدد ملی، کیونکہ اس سے ان کے اعزاز و دولت میں اضافہ ہوتا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بتدریج ہوا۔ چنانچہ خود ایتھنز کا اکروپولس، پی سسترا ٹوس کے تحت میں حصار بند بنایا گیا۔

[۱] "ارسطو، سیاسیات" حصہ چہارم (۷)، فقرہ ۴۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی متفرق جماعتوں کے اندر جو شہری سلطنت بن جانے کی طرف مائل ہوں تمدنی زندگی کا یہی ارتقاز یادہ تر اس امر کا موجب ہوا کہ یونان کے سیاسی اوارات میں شاہی کا تبدل ہوا اور اس سلسلے کے دوسرے مدارج بھی طے ہوتے رہیں۔ جرمانی قبائل کے حالات کا جہاں تک ہمیں علم ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی چند صدیوں میں بادشاہی کا شیوع وارتقاز یادہ تر اس وجہ سے ہوا کہ اسے قومی اتحاد کے واسطہ وعلامت کے طور پر کارآمد سمجھا جاتا تھا، اسی کے برعکس ہیلینی (یونانی) جماعتوں کی قلت اور اجتماعی جائے قیام نے اس واسطہ کو بیکار اور اس علامت کو بے اثر بنا دیا ہوگا۔

یونان میں عدیدیت کی ابتدا کے متعلق گروٹ نے جو وجہ بیان کی ہے اس کا ماحصل یہی ہے[۱] چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جب موروثی بادشاہ کی شخصی کمزوریاں محسوس ہونے لگیں "تو پھر قوم کے حالات گردوپیش میں کوئی امر ایسا نہیں تھا کہ مرئی وموثر اتحاد کے لئے اس اعزاز کا قائم رکھنا ضروری ہوتا۔ ایک واحد شہر اور ایک چھوٹی سی قریب قریب رہنے والی قوم کے لئے یکجائی بحث ومباحثہ اور عام ضوابط پر (جس کے ساتھ ہنگامی و ذمہ دار حکام بھی مقرر رہوں) بغیر کسی دقت کے عمل کرنا ممکن تھا" بس اس طرح ان ماتحت سرداروں کو جو اولاً بادشاہ کی مجلس شوریٰ کے خدمات انجام دیتے تھے یہ موقع ملگیا کہ وہ بادشاہ کو زیر کر کے انتظامی فرائض کو خود اپنے درمیان میں تقسیم کرلیں۔ البتہ جمعیت عامہ کا انعقاد مثل سابق کبھی کبھی کرتے رہے ہوں، اور عملی اعتبار سے یہ مجلس سابق ہی کی طرح بیکار رہی ہو۔ یونانی سلطنتوں میں اسپارٹا کے سوا عام طور پر جو تغیر واقع ہوتا رہا اس کی حقیقت بس یہی تھی۔ بادشاہی منسوخ کردی جاتی، اس کے بجائے عدیدیت قائم ہوجاتی، ایک مجلس مجموعی طور پر بحث ومباحثہ کرتی، عام معاملات کا کثرت رائے سے فیصلہ کرتی اور اپنی ہی جماعت میں سے چند اشخاص کو عارضی وجوابدہ منتظموں کی حیثیت سے منتخب کردیتی تھی۔ قدیم بادشاہی کے معدوم ہوجانے کے بعد ہمیشہ عدیدیت ہی کو عروج حاصل ہوتا تھا، عموحی تحریک کا زمانہ ابھی بہت دور تھا اور اس انقلاب سے قوم (یعنی آزاد اشخاص کی جماعت عام) کی حالت میں فوری طور پر اچھا یا برا کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا۔"

---

[۱] ملاحظہ ہو "تاریخ یونان" حصہ دوم باب نہم۔

یہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں عل کہ میرے خیال میں گروٹ ابتدائی زمانہ کی مجلس جمعیت ملکی کی اہمیت کو کسی قدر گھٹا کر ظاہر کرتا ہے اور اس کا یہ کہنا کہ قدیم بادشاہی کے بعد ہمیشہ "عدیدیت" ہی قائم ہو جاتی غالباً ضرورت سے زیادہ وسیع ہے۔ ہم ابھی ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ پولی بیوس یہ کہتا ہے کہ اکائیہ کے شہروں میں شاہی کے بزور برطرف کر دینے کے بعد فوراً ہی عمومیت قائم ہو گئی اور یہ خیال بآسانی ذہن میں آسکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے ممالک جن میں فتوحات نے برہمی نہ پیدا کی ہو اور جو حرفتی و تجارتی ترقی کی عام شاہراہ سے علیحدہ ہوں ان میں اور جگہوں کی بہ نسبت باشندوں کے اندر دولت و طرز ماند و بود میں مساوات زیادہ مدت تک قائم رہتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بادشاہی کو زوال ہوتا تھا تو از خود ایک معقول عمومیت قائم ہو جاتی تھی۔ میرا گمان ہے کہ آرکیڈیا کے بعض قصبوں میں بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی، لیکن جب عمومی حیثیت سے گفتگو کی جائے تو بے تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یونان میں سیاسی نظم معاشرت جب قدیم بادشاہی کی منزل سے گزر کر آگے بڑھا تو پھر اس نے ابتدائی عدیدیت ہی کی منزل میں قدم رکھا۔

اس امر پر نظر کرنا چاہیے کہ یہ ارتقا مختلف سلطنتوں میں بہت ہی مختلف اوقات میں واقع ہوا) تھیوسیڈائڈس کے وقت میں کسی شہری سلطنت کے اندر جس میں ہیلینی (یونانی) تمدن پورے زوروں پر ہوتا کوئی بادشاہ باقی نہیں رہ گیا تھا، مگر یہی مورخ (اپنی تاریخ جلد اول باب سوم میں) وسط پانچویں صدی میں تھسلی کے بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے اور ہیروڈوٹس (جلد ہفتم ۱۴۹) سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایرانی جنگ کے وقت ارگوس میں موروثی بادشاہ موجود تھے، حالانکہ اس سے بہت ہی قبل اتھنز میں یہ نام نہاد بادشاہ حکام اعلیٰ کی مجلس کا محض ایک منتخب شدہ رکن رہ گیا تھا۔ کورنتھ اور کالکس جو تجارتی مرکز تھے اور جنھوں نے آٹھویں صدی کے نصف آخر میں اپنے لوگوں کو نوآبادیاں قائم کرنے کے لیے بھیجا تھا ان کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھیجنے والی ایک تجارتی عدیدیت تھی، روایت کے مطابق، اتھنز میں بھی اسی صدی کے وسط میں یہی کارروائی جاری ہو چکی تھی۔

عل ۔ خطبہ دوم

اس تغیر کا پتہ سب سے زیادہ قطعیت کے ساتھ ایتھنز میں چل سکتا ہے، اور وہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کارروائی بہت ہی تدریجی طریق سے انجام پاتی تھی۔ پہلے تو شاہی منصب سے ایک جزو اس طرح علیحدہ کیا گیا کہ بادشاہ سے علیحدہ ایک پولیمارخ یا سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد ایک تیسرا آرخن یا حاکم مقرر ہوا، جو آخر کار حکومت کے داخلی معاملات کے لئے خاص عاملانہ حاکم ہو گیا، اور اب شاہی منصب موروثی نہ رہا۔ اس کے بعد ان تینوں کے عہدے کی میعاد دس برس کی مقرر ہو گئی۔ پھر حاکم اعلیٰ کا عہدہ جو اب تک شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا، تمام یوپاتریوں یا امرا کے لئے عام ہو گیا، آخر کار (سنہ ۶۸۳ ق م میں) عاملانہ فرائض نو حاکموں کے درمیان تقسیم کر دئے گئے جن کی میعاد ایک برس کی ہوتی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان تغیرات کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس اثنا میں اکابر کی مجلس نے جو قدیم ترزمانہ میں بادشاہ کے ساتھ فرائض حکومت میں شریک تھی، رفتہ رفتہ اپنے اختیارات بڑھا لئے، کیونکہ جب حاکم اعلیٰ کا عہدہ انتخابی ہو گیا تو اس انتخاب میں بالطبع اسی جماعت کے لوگ منتخب ہونے لگے۔ اس کے بعد جب عہدے کی میعاد ایک برس کی ہو گئی اور مجلس کی خالی شدہ جگہیں بالطبع انھیں لوگوں سے پُر کی جانے لگیں جو حاکم رہ چکے ہوں تو پھر یہ سمجھنا آسان ہے کہ کیونکر اس مستقل جماعت نے اپنے حقوق و اختیارات کو سال بسال کے مقرر شدہ حکام سے بڑھا لیا ہو گا۔ جب تغیر کی یہ کارروائی مکمل ہو چکی ہو گی تو پھر حکومت نے بادشاہی کے بجائے قطعی طور پر عدیدیت کی صورت اختیار کر لی ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ تغیر کی اس کارروائی کی نوعیت اور اس کا آخری نتیجہ مختلف ملتوں میں مختلف رہا ہو گا لیکن بادشاہی کم و بیش ہر جگہ غائب ہو گئی تھی۔ غالباً یہ تغیر ایک جماعت سے دوسری جماعت میں نقل و تقلید سے شائع ہوا تھا۔ جب ایک شہر نے اپنے بادشاہ کو ہٹا دیا تو اس کے ہمسایہ کو بھی ایسا ہی کرنے کا شوق پیدا ہوا ہو گا۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں بادشاہوں کے کبر، ظلم اور کمزوری نے عجلت پیدا کر دی ہو گی اور کہیں ان کی قابلیت اور حکمرانی نے اس میں تاخیر کر دی ہو گی مگر نتیجہ اس قدر عام و یکساں ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے زیادہ، مشترک اسباب کی طرف منسوب نہ کیا جائے، اور میرا خیال یہ ہے کہ اس کی وجہ زیادہ تر اس سیدھے سادے اعتقاد کو قرار دے سکتے

ہیں کہ جس ملّت نے بہ تدریج اپنے تمدن و اجتماع کو اس درجہ بڑھا لیا
ہوگا کہ اس کا اتحاد و انتظام بادشاہ کے بغیر قائم رہ سکتا تھا، اس کے لئے
ایک "عطیہ نواز بادشاہ" بیکار کا بار ہو گیا ہوگا۔

خطبۂ پنجم

یونانی شہری مملکتوں میں ابتدائی عدیدیت

سابقہ خطبہ میں ہم یونان کے اندر عدیدیت کی رفتار پر غور کر رہے تھے اور بادشاہ کے ساتھ امرا کے تعلقات کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے تھے، لیکن یہ میں کہہ چکا ہوں کہ بادشاہی کے بعد جو عدیدیت قائم ہوئی وہ مختلف حالات میں مختلف نوعیت کی تھی۔ بعض صورتوں میں حکومت کے خاص اختیارات شاہی خاندان یا عشیرے ہی کے اندر باقی رہ گئے تا آنکہ تیرانس (خودسری) کا دور آگیا۔ (بر سبیل تمثیل) کورنتھ میں یہی صورت پیش آئی جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ بکیائی خاندان نے وہاں آٹھویں صدی قبل مسیح کے نصف آخر اور ساتویں صدی کے اول میں نوے برس حکمرانی کی۔ موروثی بادشاہ کی جگہ کے لئے خاندان میں سے ہر سال ایک شخص منتخب کر لیا جاتا تھا، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور بھی متعدد شہری سلطنتوں کے متعلق ہم یہ سنتے ہیں کہ وہاں اسی قسم کے شاہی خاندان عدیدانہ طور پر حکمرانی کرتے تھے یہاں تک کہ تیرانس (خودسری حکومت) کا زمانہ آگیا۔

دوسری صورتوں میں جہاں تک ہمیں علم ہے شاہی کے زوال پذیر ہونے کے بعد اختیار حکومت چند خاندانوں کے اندر منقسم ہو جاتا تھا مثلاً ایتھنز میں یوپاتری خاندان کا لکس اور ایبرتیریا (یوبیہ) میں ہپہپوتا کے اسی قسم کے خاندان تھے۔

اب ہمیں اس امر پر توجہ کرنا چاہیے کہ ابتدائی دستور کے تیسرے عنصر

یعنی مسلح آزاد اشخاص کی مجلس میں اگر کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے؛ اس امر کے فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس طرف اختیار میں اگر کوئی تغیر ہوا ہو تو اس سے شاہی کے اختیار میں لازماً کمی واقع ہوئی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس موقع پر (جیسا کہ ہومر نے اشارہ کیا ہے)، شاہی کا خاتمہ ہونے کے قبل اکثر صورتوں میں دولتمند زمینداروں کا غلبہ مکمل ہو جاتا تھا، بادشاہ نظم معاشرت کی اس عدیدانہ عمارت کا صرف کلس تھا، پھر بھی یہ سمجھنا آسان ہے کہ بادشاہی کی تنسیخ سے اس مجلس کے اندر حکمران خاندانوں کا غلبہ کیونکر اور بھی زیادہ قوی ہو جاتا تھا اور مجلس کی نسبت ہم گروٹ کے ہم خیال ہو کر یہ قیاس قائم کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے قدیم فرائض کے مماثل کچھ فرائض کے ساتھ برقرار رکھی جاتی تھی، لیکن ماتحت سرداروں یا بزرگوں کے ساتھ بادشاہ کے تعلق میں جو کچھ بھی تغیر ہوا ہو اس سے بالکل علیحدہ ہو کر ہم دوسرے اسباب بھی ایسے دریافت کر سکتے ہیں جو اس مجلس میں عدیدانہ خصوصیت پیدا کرنے کا کام دے رہے تھے یہ اسباب مختلف نوعیت کی سلطنتوں میں کسی قدر مختلف تھے۔

لیکن اس سے پیشتر ضرورت یہ ہے کہ عدیدیت کے متعلق جو کسی قدر موہوم و پریشان سے خیالات قائم ہو گئے ہیں انھیں صاف کر دیا جائے۔ ارسطو نے عدیدیت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ چند دولتمندوں کی حکومت ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ ارسطو کے قریب زمانہ میں عدیدیت و عمومیت کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہی تھا کہ حکمرانی آیا چند دولتمندوں کو حاصل ہو یا آزاد شہریوں کی جماعت عام کو، لیکن صرف یہی ایک طریقہ نہیں ہے جس کے وسیلے سے عدیدیت یعنے قلت کی حکومت پیدا ہو سکتی ہے یا پیدا ہوئی کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ (غلاموں کو خارج کرنے کے بعد بھی) شہریت کے حقوق نہ رکھنے والوں کی تعداد کے مقابلہ میں ان حقوق کے رکھنے والوں کی کل جماعت ایک قلیل التعداد، بہت ہی قلیل التعداد جماعت ہو۔

عدیدیت[1] کا یہ دہرا تصور اس یونانی مملکت کی حالت سے بہت اچھی طرح سے

---

[1] فریمین نے ابتدائی نظم حکومت کے تین عناصر پر جہاں بحث کی ہے وہاں عدیدیت کا یہ دہرا تصور اس کی نظر سے رہ گیا ہے۔ اس نے ابتدائی دستور کی صورت یہ قرار دی ہے کہ۔

واضح ہو سکتا ہے جس کا دستور قدیم ترین معلومہ دور کے خصوصیات کا بہترین نمونہ ہے، یہ مملکت، اسپارٹا کی مملکت ہے جو یونان میں مدبدیت کی پشت پناہ تھی۔ اہل اسپارٹا میں پیشہ ور جنگجویوں کی ایک جماعت تھی، ایرانی جنگ کے وقت ہر وڈوٹس ان کی تعداد آٹھ ہزار بتاتا ہے اور ارسطو کا بیان ہے کہ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں ان کا شمار دس ہزار تک تھا۔ یہ گویا ایک جنگجو قبیلہ تھا جو اسپارٹا میں فتوحات حاصل کرنے کے باعث لقونیہ و مسینیہ میں مالکان اراضی کی حیثیت سے دائمی طور پر قائم ہو گیا تھا۔ ان میں سخت تعلیم و تربیت، قواعد اور نیم اشتراکانہ ضوابط کا ایک مختص نظم قائم تھا، تاکہ ان میں معاشرت کی سادگی اور فوجی شجاعت و مہارت برقرار رہے۔ ان کا گذارہ زمین کی پیداوار پر تھا جس کی کاشت ہیلوت (غلامان وابستہ اراضی) کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور جن کی تعداد ان جنگجویوں سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ ایرانی جنگ کے دوران میں معرکہ پلاتیہ کے وقت ایک ایک اسپارٹی کی خدمتگری کے لئے سات سات "ہیلوت" تھے۔ یہ غلام زمین سے وابستہ تھے مگر ان سے مطلوب صرف یہ تھا کہ وہ زمین کی پیداوار سے ایک معینہ مقدار داخل کردیا کریں، اور اسی اراضی کے اور باشندے جو شخصی طور پر آزاد ہوتے تھے اور جن کی تعداد ان غلاموں سے سہ چند تک اندازہ کی جاتی تھی وہ بھی سیاسی حیثیت سے انھیں اہل اسپارٹا کے تحت میں تھے۔

جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں[1] یہ "ابتدائی نظم حکومت" ہی اُن کا اولیں دستور تھا۔ اس میں صرف خفیف سی ترمیم کرلی گئی تھی۔ دو بادشاہ ہوتے تھے۔ اس دوئی کا سبب محقق نہیں ہوتا مگر اغلب وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتداً دو جماعتیں متحد ہوئی ہوں گی ان بادشاہوں کی نسبت ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ابتداً انھیں ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بادشاہ
مجلس سرداران
آزاد جنگجویوں کی مجلس
برابر ہے محض
شاہی عناصر کے
عدیدانہ عناصر ،،
عمومی ،، ،،

[1] خطبہ دوم

فرائض تفویض تھے جو ہومر کے بیان کردہ بادشاہوں کے ہوا کرتے تھے، جس زمانہ کا حال ہمیں سب سے زیادہ معلوم ہے اس میں ان کی اہمیت زیادہ تر اس وجہ سے تھی کہ وہ موروثی سپہ سالار تھے، اگرچہ خاص مذہبی امتیازات اور نمایاں مخصوص اعزاز اور بعض عدالتی فرائض بھی انھیں حاصل تھے۔ دوسرے، اکابر کی ایک مجلس مینیات تھی، جس میں ساٹھ سے اوپر کی عمر کے لوگ شامل ہوتے تھے، جن کا انتخاب عمر بھر کے لئے ان شہریوں کی مجلس کی طرف سے ہوتا تھا جنھیں رائے دینے کا کامل حق حاصل تھا، یہ انتخاب ایک عجیب طرح کے انتخاب بذریعہ آواز سے ہوتا تھا جس کا رواج قدیم سے چلا آتا تھا اور جس سے غلبہ کا اندازہ وہ عہدہ دار کرتے تھے جو اس غرض سے متعین ہوتے تھے مگر وہ ایسے موقع پر ہوتے تھے کہ انھیں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس کے لئے یہ شور تحسین بلند ہو رہا ہے۔ تیسرے، تیس برس سے زائد عمر کے کامل الحقوق شہریوں کی عام مجلس تھی جنھیں سینائیوں اور اعلیٰ حکام کے انتخاب کا حق حاصل تھا اور شاذونادر جب کبھی کوئی نیا قانون بنانا پڑتا تھا تو ان کی منظوری درکار ہوتی تھی علیٰ ہذا جنگ، صلح اور معاہدوں کی توثیق بھی ان کی منظوری پر مشروط تھی[1] عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کامل الحقوق شہریوں کی یہ مجلس ابتداً فاتح قبیلے کے تمام اخلاف پر مشتمل تھی، مگر ضیافتہائے عام کے اخراجات کے لئے (جس میں ہر ایک کامل الحقوق اسپارٹی کے لئے شرکت لازمی تھی) چندہ دینے کی شرط ایسی تھی جس کی وجہ سے زیادہ غریب لوگ اس سے خارج ہو گئے تھے اور جس قدر وقت گزرتا گیا یہ اخراج زیادہ اہم ہوتا گیا۔

جمعیت ملی کے اختیارات کی ایک نمایاں تحدید کا بیان کرنا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تحدید لاکرگس کے ایک صدی بعد ہوئی تھی، وہ تحدید یہ تھی کہ جس صورت میں کہ قوم نے کسی غلط روش پر چلنے کا فیصلہ کیا ہو تو مجلس سینایت کو بشمول حکمرانان یہ چاہئے

---

[1] ہیروڈوٹس جلد ۶، ۵۶ کا یہ کہنا کہ "بادشاہوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جس ملک سے چاہیں جنگ کریں اور کوئی دوسرا اسپارٹی اس میں کسی طرح سے مارج نہیں ہو سکتا تھا" میرے خیال میں اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا منشایہ نہیں ہے کہ بادشاہوں کو اعلان جنگ کا حق حاصل تھا بلکہ اعلان جنگ کے بعد مہم کی کارروائی کو وہ جسطرح چاہیں جاری رکھ سکتے تھے، یا یہ کہ ہیروڈوٹس سے ایک معمولی غلطی ہو گئی۔ مقابلہ کیجئے تھیوسیڈیڈس جلد اول۔ ۲۰ نیز ہیروڈوٹس جلد سوم ۲۶، پنجم ۴۲، ششم ۱۰۶۔

کہ وہ ان کے فیصلہ کو بدل دے[۱] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے[۲] کہ اس تحدید نے مجلس کے فیصلہ کو محض نمائش بنادیا ہوگا، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ بظاہر اس سے کسی تجویز کے متعلق منظوری دینے سے انکار کردینے کے اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا اور اس طرح وہ ہر مجوزہ تغیر کو روک سکتے تھے، پس ماحصل یہ ہوا کہ سینیات کو بھی مجلس کی کارروائی کے روک دینے کا مساوی اختیار حاصل ہوگیا تھا!

یہ تو اصلی و ابتدائی دستور تھا مگر اس کے بعد ہی "ایفور" یا نگرانکاروں کی ایک جماعت کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ان کا انتخاب سال بسال کسی ایسے طریق سے ہوتا تھا جس کا ہمیں صحیح علم نہیں ہے۔ لیکن افلاطون اس کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ انتخاب قریب قریب قرعہ اندازی کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً ان لوگوں کا تقرر کوتوالی کی خدمات بجالانے کے لئے ہوا تھا اور دوسرے حکام اپنے ادائے فرائض میں غفلت کریں یا اپنے اختیارات کو بیجا استعمال کریں تو اس کا روکنا بھی ان کا کام تھا مگر بتدریج ایفوروں نے اپنے اختیار کو بڑھالیا اور اندرونی معاملات کے سب سے اعلیٰ عاملانہ حاکم بن گئے، اور جنگ میں بھی انھیں ایک معقول حد تک اقتدار حاصل ہوگیا۔ ان کے اختیار کی نوعیت و وسعت، اور اس اختیار کے عملدرآمد میں رازداری اور بے رحمانہ سختی وینس کی "مجلس عشرہ" کے حالات سے کچھ عجب مشابہت رکھتی ہے۔ ان کا کام یہ تھا کہ بدبل اہل اسپارٹا، اور بددل غلامان زرعی و تابعین سب کے مقابلہ میں نظام سلطنت کو برقرار رکھیں۔ وہ اسپارٹا کے ہر شخص کو گرفتار و قید کرسکتے، یہاں تک کہ حکام کو بھی معطل کرسکتے تھے اور تین بار طلب کئے جانے پر بادشاہ بھی ان کے روبرو حاضر ہونے پر مجبور تھے، اور کاشتکاران وابستۂ اراضی، اور لقونیہ کے ماتحت شہروں کے باشندوں کی زندگی و موت تک کا انھیں اختیار حاصل تھا۔

اس موجودہ دور جدید میں کسی کو بھی اس امر میں شبہ نہیں ہوسکتا کہ اسپارٹی

---

[۱] پلوٹارک، لکرگس حصہ ۶، ۷۔

[۲] ملاحظہ ہو، اسپنسر کی "ادارات سیاسیہ" ۴۸۸ ماخوذ از گروٹ حصہ دوم باب ششم لیکن گروٹ کی رائے وہی ہے جو مین نے دی ہے۔

حکومت عدیدی یا اعیانی حکومت تھی (یہ دونوں اصطلاحیں تقریباً ہم معنی متصور ہوتی ہیں، افلاطون وارسطو نے ان میں جو بیّن فرق قائم کیا ہے کہ اول الذکر "چند دولتمندوں کی حکومت" تھی، اور ثانی الذکر "ذی لیاقت اصحاب کی حکومت" وہ یہاں مقصود نہیں ہے) لیکن ایسا کیوں تھا اس کی وجہ بیان کرنے میں بڑا اختلاف رائے ہے (۱) ایک وجہ یہ ہے کہ اہل اسپارٹا اپنے کثیر التعداد غلامان زرعی اور رعایا کے مقابلہ میں بہت کم تعداد میں تھے (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اہل اسپارٹا ہی ایسے تھے کہ ان کی کثیر تعداد پر ان کی قلیل تعداد حکمران تھی؟ میرے خیال میں پہلا جواب تو ایسا ہے کہ معمولی طور پر کوئی یونانی یہ جواب نہ دیتا۔ اہل یونان اپنے یہاں کے "ہیلوت" کو بالعموم ایسا ہی سمجھتے تھے جیسا دوسرے شہروں میں غلام ہوتے تھے، اور ارسطو نے تو اسپارٹا کے سیاسی نظام پر بحث کرتے وقت لقونیہ کے غیر اسپارٹی باشندوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، اور اگر ہم اسپارٹی ملّت کے محض اندرونی سیاسی تعلقات کو دیکھیں تو ان میں صاف عدیدانہ خصوصیت نظر آنے کے بجائے ایک گونہ مشکوک ومتلون کیفیت نظر آتی ہے۔ کوئی وقت ایسا ہی رہا ہوگا جب "حقیقی طاقت مجلس سنیات کے ہاتھوں میں رہی ہوگی"[عہ] لیکن ارسطو کے وقت میں یہ صاف عیاں تھا کہ اصل اختیار نگرانکاروں کی مجلس یعنی ایفوروں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ بیشک ارسطو سیناتی عہدے کو بڑی عزت و وقعت کا منصب بیان کرتا اور اسے "قابلیت کا انعام" قرار دیتا ہے مگر اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ظاہر کرتا کہ اس کے ساتھ عدالتی فرائض شامل تھے۔ اس کے برخلاف "مجلس ایفوران" کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "نہایت ہی اہم معاملات کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا اور اسے بہت ہی وسیع اور مطلق العنانہ طاقت حاصل تھی"، اور اگرچہ اسی موخر الذکر خیال کی بنا پر گروٹ اسپارٹی حکومت کو ایک "ایسی تنگ، بے باک عدیدیت قرار دیتا ہے جس کی مکمل اطاعت لازم ہوتی ہو" لیکن ہم ارسطو کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یونان کے سیاسی ارباب دانش کی نظر میں اس اقتدار کے متعلق جو ایفوروں کو اہل اسپارٹا پر حاصل تھا "عدیدانہ حکومت" کا لفظ استعمال کرنا کم از کم مشکوک ضرور معلوم ہوتا تھا۔ ایفور کا

عہ۔ دیکھئے بنچلی، نظریہ سلطنت کتاب ششم باب ۲، ۱)

عہدہ تمام کامل الحقوق شہریوں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ انتخاب کے طریقے کا حال اگرچہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہے لیکن یہ متیقن ہے کہ اس میں اس قدر عمومیت تھی کہ دولت اور معاشرتی حیثیت سے اس معاملہ میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ (ارسطو کو یہ شکایت ہے کہ اس میں "غریب و ایمان فروش" امیدوار تک قبول کر لئے جاتے تھے) ارکان مجلس کی میعاد صرف ایک برس کی ہوتی تھی اور جب وہ اپنے عہدوں سے علیحدہ ہوتے تھے تو دوسرے حکام کی طرح وہ بھی جوابدہی کے ذمہ دار تھے۔ اسی وجہ سے ارسطو کی رائے یہ ہے کہ جب الفوروں کو غلبہ حاصل ہو گیا، تو دستور سلطنت آہستہ آہستہ اعیانیت سے بدل کر عمومیت کی صورت میں آ گیا علے، یعنی جہاں تک کامل الحقوق اسپارٹی شہریوں سے حکمرانی کا تعلق تھا اس کی ہیئت فی الواقع یہی ہو گی۔

پس جس حد تک اسپارٹا کی نسبت یہ سمجھنا صحیح و درست ہو سکتا ہے کہ وہ صریحی و دائمی طور پر عدیدانہ اصول کو نمایاں کر رہا تھا اور جیسا کہ ارسطو نے تسلیم کیا ہے اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ یونان کے اور مقامات کے متعلق اہل اسپارٹا کی حکمت عملی یہی تھی کہ عدیدیت کو ترقی دی جائے اسی حد تک اس عدیدیت کی وجہ اس تعلق کو قرار دینا پڑے گا جو اہل اسپارٹا کی تمام جماعت کو بہ حیثیت "حکمرانان چند" کے اپنے سے بہت بڑی تعداد کی رعایا کے ساتھ تھا۔ اس نقطہ نظر سے الفوروں کے طریق حکمرانی کی نسبت بلا شک و شبہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک نمایاں عدیدانہ تنظیم تھی۔ میری مراد یہ ہے کہ وہ اس امر کے لئے پوری طرح موزوں تھی کہ انقلابات کے مقابلہ میں ایک قلیل التعداد حکمران جماعت کو قائم رکھ سکے خواہ یہ انقلاب ان کی رعایا کی طرف سے برپا ہو یا ان ہی کے بددل ارکان کی طرف سے ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ان دونوں نقطہائے نظر کا فرق صاف طور پر سمجھ لیا جائے۔ اگر ہم اسپارٹا کی نسبت یہ سمجھیں کہ اس کے تمام دور تاریخی میں عدیدیت ہی جاری رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہو گی کہ اسپارٹا کے آزاد جنگجویوں نے سیاسی اقتدار میں اپنا حق زائل کر دیا تھا بلکہ فی الواقع اپنے غلامان زرعی اور تفویضہ کے ماتحت شہروں کے آزاد باشندوں کے مقابلہ میں قلیل التعداد حکمرانوں کی حیثیت میں

علہ۔ ملاحظہ ہو ارسطو کی سیاسیات کتاب مسباب نہم۔ نیز مقابلہ کیجئے کتاب ششم (چہارم) باب نہم۔

آ گئے تھے۔ صرف اسی نقطۂ نظر سے تمام دور ہائے تاریخی میں اسپارٹی حکومت صاف طور پر عدیدانہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعد کے زمانہ میں خود اہل اسپارٹا کے اندر کامل الحقوق شہریوں کی حیثیت قلت کی ہوگئی تھی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ باقاعدہ تربیت کی شرط کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ ضائع ہوگئے تھے اور اس لئے خود کامل الحقوق شہری کل اہل اسپارٹا کے مقابلے میں قلیل التعداد ہوگئے تھے۔

۲۔ اگرچہ اسپارٹا کے لائی کرگس والے ادارات بجائے خود نادر تھے، اگر اس قسم کی عدیدیت جس میں ایک فاتح قبیلے کے مسلح آزاد اشخاص کی ابتدائی مجلس کثیر التعداد مفتوحین کے درمیان "معدودے چند" کی صورت اختیار کرلے، یہ صورت نادر و نایاب نہیں تھی۔ اس کی ایک صاف مثال یہ ہے کہ ارگوس میں دوریانیوں نے مفتوح اہل اکایہ کے ساتھ جو تعلق قائم کیا وہ اس تعلق سے بہت مشابہ تھا جو اسپارٹا کے دوریانیوں میں رائج تھا۔ یہاں بھی فاتحین نے غلامان زرعی کو اپنی ملک بنالیا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ ان کو "ہیلوت" کے بجائے "جمنیتیس" کہتے تھے، ماتحت قصبوں یا دیہاتوں کے گروہ اسی طرح پر تھے اُن دیہاتوں کے باشندوں کو مدنی آزادی تو حاصل ہوتی تھی مگر سیاسی آزادی سے وہ محروم تھے۔ علیٰ ہٰذا اکریٹ کے قصبوں میں بھی ہمیں نظم معاشرت کے یہی تینوں مدارج ملتے ہیں، دوریانی فاتح، غلامان زرعی، آزاد دیگر ماتحت اہل صوبہ۔

اسپارٹا کی طرح کریٹ کے ادارات میں بھی اہم معاملات کے لئے آزاد جنگجوؤں کی مجلس کی منظوری ضروری تھی مگر ارسطو یہ کہتا ہے کہ اس کے وقت میں اس مجلس کو کچھ حقیقی اختیار نہیں حاصل تھا اور اس میں کچھ بھی استبعاد نہیں ہے کہ دوسرے مقامات میں بھی دوریانیوں کے فتوحات کے نتائج اولاً ایسے ہی ہوئے ہوں گے۔ یونان کے دوسرے حصص میں بھی جہاں کے سیاسی نظم معاشرت کی انتہائی حد فتح پر منقضی ہوئی تھی (اور جنکا حال تاریخی طور پر ہمیں معلوم ہے)، وہاں بھی جہاں تک ہمیں علم ہے، اول میں نہیں تو آخر میں یہی ہوا کہ ایسی ہی حکومت قائم ہوگئی جو بالکلیہ، سربرآوردہ خاندانوں یا خاندانوں کے ایک چھوٹے سے مجموعے کے ہاتھ میں آگئی تھسلی کا یہی حال تھا، جہاں مختلف شہروں میں

عـــہ۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق (الف)۔

اقتدار و اختیار ان امرا کے خاندانوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنا سلسلہ نسب ہرقل سے ملاتے تھے۔ تھیبس بلکہ عام طور پر بیوتیہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ان کے متعلق ہم جو کچھ سنتے ہیں اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عدیدانہ حکومت زمیندار خاندانوں کی ایک موروثی جماعت کے اندر سختی کے ساتھ محدود تھی اور یہ جماعت امتداد زمانہ کے ساتھ اور تنگ و محدود ہوتی جاتی تھی۔ اسی طرح دور یانیوں کی نسبت بھی ہم یہ سنتے ہیں کہ وہاں سیاسی اختیار اپیڈورس کے ۱۸۰ آدمیوں کے درمیان محدود تھا۔ اسی قسم کی تحدید ایلس میں بھی پائی جاتی ہے۔

مگر صرف فتوحات ہی ایک ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ جماعت جو قبیلے کے آزاد جنگجویوں کے مجموعے کے مرادف ہوتی تھی قسم کی عدیدانہ حیثیت پیدا کر لیتی تھی کیونکہ عام طور پر یونانیوں کی شہری سلطنتوں میں حق شہریت کا انحصار بالعموم وراثت پر ہوتا تھا۔ غیر ملکیوں کے جو لڑکے مملکت کے اندر پیدا ہوتے تھے وہ بالعموم غیر ملکی ہی رہتے تھے۔ حق شہریت میں ان کا داخلہ خاص مراعات کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ بجز اسکے کہ تغیر کے نازک وقتوں میں اس کا لحاظ نہ کیا جائے[1]۔ پس اس مفہوم میں ہر ایک یونانی جماعت جب وہ ایک مختصر سی ابتدائی حالت سے ترقی کر کے ایک فراخ و مرفہ الحال شہر کی وسعت پیدا کر لے تو اس کی تنظیم و ترتیب بہت آسانی کے ساتھ عدیدانہ ہو سکتی تھی۔ شہر کی مرفہ الحالی کی وجہ سے آزاد غیر شہریوں کو شہر میں آکر رہنے کی رغبت ہوتی تھی اور ان کا شمار ان شہریوں سے بڑھ جاتا تھا جن کی تعداد وراثت کے ذریعے سے محدود ہوتی تھی۔

میرا قیاس یہ ہے کہ نوآبادی کی تاریخ کے نہایت ہی ابتدائی مدارج میں عدیدانہ حکومت اسی طریقے پر وجود میں آئی ہوگی۔ قدیم ترین آبادکاروں نے زیادہ تر اپنی مقبوضہ زمین کو برابر کے حصوں میں تقسیم کر لیا ہوگا کیونکہ ابتدائی آبادکاروں کا باہم مجتمع ہونا مفاہمت پر ہوا ہوگا۔ جب نوآبادی کی مرفہ الحالی و وسعت میں ترقی ہوئی ہوگی تو ان

---

[1] ۔ لامحالہ اس معاملہ میں وہ لوگ جدید یورپ سے متعارض تھے کیونکہ اس زمانہ میں بالعموم یہی ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں کی اولاد جس ملک میں پیدا ہوتی ہے اسی کی شہری سمجھی جاتی ہے۔

"حصہ داران اراضی"[۱] کے خلاف نئے شہریت کے حقوق کو اپنے لئے مخصوص رکھا ہوگا اور شہر کی مرفہ الحالی سے جو تاجر بتدریج وہاں آباد ہونے کی طرف مائل ہو گئے ہوں گے ان کو اور اپنے زرعی غلاموں کو اس حق سے علیٰحدہ رکھا ہوگا اور اس طرح آہستہ آہستہ حکومت نے عدیدانہ صورت اختیار کرلی ہوگی[۲]۔

اس کے برخلاف ایتھنز کی طرح کی وہ شہری سلطنتیں جن کا ہمیں تاریخی علم ہے، اور جو "امتزاج واتحاد باہمی" کے ذریعے سے قائم ہوئی ہیں یعنی چھوٹے چھوٹے قصبے جن کی جداگانہ ہستی بدستور قائم تھی، سیاسی طور پر متحد ہو گئے تھے، ان کی نسبت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتحاد ہی بجائے خود اس کا سبب ہوا ہوگا کہ ابتداءً جو اختیار عام اہل شہر کی طرف سے عمل میں آتا تھا، اب وہ ان بڑے بڑے ذی املاک اشخاص یعنی قدیم خاندانوں اور ارباب دولت کے ہاتھ میں آجائے جنھوں نے فی الواقع مرکزی قصبے میں اپنی بود و باش اختیار کر لی ہو۔ عملاً صرف یہی لوگ پورے سیاسی مفہوم میں شہری رہ گئے ہونگے کیونکہ اگرچہ چھوٹے چھوٹے صاحبان املاک باضابطہ طور پر مجلسوں سے خارج نہیں کردئے گئے تھے مگر ان کو شرکت کا موقع بھی بہت کم ملتا رہا ہوگا۔

پس قیاس یہی چاہتا ہے کہ ایک سے زائد طریقے ایسے تھے کہ آزاد اشخاص کی قدیم مجلس کی سیاسی حیثیت میں کسی قسم کا باضابطہ تغیر کئے بغیر رفتہ رفتہ سیاسی اقتدار ملت کے آزاد اشخاص کی ایک نسبتاً قلیل التعداد جماعت کے ہاتھ میں مجتمع ہوتے گئے ہوں۔

---

[۱] "گاموروئی" یا "گیوموروئی" سرقوسہ اور ساموس میں یہ لوگ عدیدی تھے لیکن ایتھنز میں انکی نوعیت عدیدی نہ تھی۔

[۲] ہمارے زمانہ میں عدیدیت کی اس طرح نشو و نما حاصل کرنے کی ایک مثال ٹرانسوال موجود ہے۔

میرا گمان یہ ہے کہ اس قسم کا عمل "اپولونیا" (واقع ساحل بحر آیونیہ) اور تھیرا میں بھی واقع ہوا ہوگا تھیرا کی نسبت ارسطو "سیاسیات" میں، یہ کہتا ہے کہ لازماً دولتمند نہیں مگر محض آزاد شہریوں کی ایک قلیل جماعت تھی جو کثیر التعداد جماعت پر حکمرانی کرتی تھی۔ مدنی اعزاز پران خاندانوں نے اپنا قبضہ جمالیا تھا جن کا دعوی یہ تھا کہ وہ مقدم طبقہ امراء سے ہیں کیونکہ وہی نو آبادیوں کے اولین بانی تھے۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے وہ معدودے چند تھے اور رعایا بہت زیادہ تھی"۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چلکر تشریح کروں گا۔ ابتدائی شہریوں کے اکثر اخلاف کے ہاتھوں سے زمین کے نکل جانے اور نتیجۃً کامل مدنی حقوق کے زائل ہو جانے کی وجہ سے حکمران طبقہ کی تعداد علی العموم گھٹتی جاتی تھی۔

۲۔ لیکن اس کے سوا ایک اور بھی اہم سبب تھا، جس کا اکثر صورتوں میں پتہ چل سکتا ہے اور جس کی نسبت ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ بہت وسعت کے ساتھ شائع تھا۔ یہ سبب کا میلان ایک ایسی اقتصادی صورت پیدا کر دینے کی طرف تھا جو عدیدیت کے حق میں مفید تھی یعنی جائداد کی عدم مساوات کا بڑھا دینا۔ میرے خیال میں اس امر کے لیے ضمنی قسم کی کافی شہادت موجود ہے کہ ابتدائی زمانے میں یونان کے اندر زمین کی کاشت اولاً زیادہ تر مجموعی طور پر ہوتی تھی، یعنی چراگاہ مشترک ہوتے تھے، اور ملت کے ہر ایک فرد کو زمین کے کم و بیش مساوی قطعات دیدئے جاتے تھے اور غالباً اول اول عارضی طور پر ان کے قبضے میں ہوتے تھے، سرداروں کے لیے خاص طور پر بڑے قطعات مخصوص کئے جاتے تھے اور کبھی کبھی ان بہادروں کو بھی ایسے قطعات دئے جاتے تھے جنھوں نے ملت کی کوئی خاص خدمت انجام دی ہو۔

چراگاہوں کی نسبت یہ امر واقعہ کہ ابتدائی زمانے میں قیمتوں کا اندازہ مویشیوں کے ذریعے سے ہوتا تھا قطعی ہے کیونکہ اس کی وجہ قرار دینا مشکل ہے کہ جب تک چراگاہیں مشترک نہوں مویشی کیونکر مبادلے کا آسان ذریعہ قرار پا سکتے ہیں۔ قابل زراعت زمینوں کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہومر کی نظمیں جس زمانہ میں لکھی گئی ہیں اس زمانہ میں ان میں تغیر ہو رہا تھا۔ "الیاڈ" میں جہاں ہم مشترک قابل کاشت زمین کا ذکر پڑھتے ہیں وہیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ دولتمندوں کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی زمینداری کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ دولتمند کی صفت یا تو بھیڑ بکریوں کا بہت بڑا گلہ رکھنا بیان کی جاتی ہے، یا یہ کہا جاتا ہے کہ "اس کے پاس سونا بہت ہے، یا تانبا بہت ہے۔" اوڈیسی میں بھی کسی بڑے زمیندار کی نسبت جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "اس کے بہت سے قطعات ہیں۔" یہ تعریف ہمیں اس زمانہ تک پیچھے لیجاتی ہے جب زمینوں کے ٹکڑے مختلف قطعات میں خاندانوں کے درمیان تقسیم ہوتے تھے، یہ ضرور ہے کہ یہ قطعات بالکل ہی مساوی نہیں ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں اسپارٹا اور دوسرے مقامات میں عام ضیافت کا قدیمی دستور بھی غالباً حقیقی یا فرضی قرابتداروں کے گروہوں کی یکجائی ملک ارضی کی یادگار تھا۔

مکمل قبضہ تخصیصی کے بعد بھی، ارسطو کی تحریر سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسپارٹا کے مانند بہت سی ایسی سلطنتیں تھیں جن میں کچھ مدت مزید تک زمینوں کے قطعات

کی خرید و فروخت یا تو بالکل ممنوع تھی یا اسے روکا جاتا تھا، صرف مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ملتی تھی۔ بچہ بھی مختلف وسعت کے خاندانوں کے اندر وراثت کی تقسیم سے عدم مساوات کا پیدا ہو جانا لازمی تھا اور جب خرید و فروخت کی اجازت کی صورت ہو تو اس کا اثر اور بھی تیز ہو جاتا ہو گا۔

پس اب سولن کے دستور کو روما و جرمنی کے مماثلات کے سلسلہ میں ملا کر ہم بہت اچھی طرح یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ زمین کی شخصی ملک کے پوری طرح پر ترقی کر جانے کے بعد بھی کچھ دنوں تک مدنی حقوق اور ذمہ داریاں ایک خاص مقدار کی زمین کی ملکیت کے ساتھ وابستہ رہیں، آزاد لوگ جن کے پاس زمینیں نہ تھیں اور جنھیں اجرت پر مزدوری کرنا پڑتی ہو وہ اپنے خرچ پر جنگ میں شریک ہونے کے فرض سے بری کر دئے جاتے تھے اور غالباً اسی جہت سے آزاد اشخاص کی مجلس میں ان کا حق شمول بھی باقی نہ رہتا ہو گا۔ بہر صورت بڑے بڑے زمینداروں کی سیاسی طاقت مقبوضات کی ترقی کے ساتھ بڑھتی رہی ہو گی، اور جب تک جنگ میں سواروں کی اہمیت کو فوقیت حاصل رہی اس طاقت کا خاص طور پر نمایاں ہونا لازمی تھا، اور زمانہ قدیم میں ہر جگہ یکساں طور پر تو نہیں مگر پھر بھی وسعت کے ساتھ یہی حالت تھی[ؑ۱]۔ اسپارٹا کے سوا اور ہر جگہ پیدل سپاہی ایک مدت تک ایک بے ترتیب غول سمجھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ نسبتاً دولتمند رہے ہوں گے وہی اپنے ساتھیوں کے لئے سواروں کا سامان مہیا کر سکتے ہوں گے، پس جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے، اب ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ بادشاہوں کے دور کے بعد یونان میں جو دستوری حکومت اول اول قائم ہوئی تھی وہ کیوں زیادہ تر نائٹوں (مبارزوں) کے تحت اقتدار میں آجاتی تھی[ؑ۲]۔ نائٹ وہی زمیندار تھے جو خود اپنے خرچ

ؑ۱۔ مجھے یہاں یہ بیان کر دینا چاہئے کہ جب فن جنگ نے ترقی کی سواروں کا یہ تفوق بھاری بھاری زرہ پوش پیدلوں کی طرف منتقل ہو گیا اور پھر اور آگے چلکر قدیم طرز کے سپاہیوں کو یہ دیکھکر حیرت ہونے لگی کہ لڑائیوں کی ہار جیت ہلکے ہتیار رکھنے والے سپاہیوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ جنگ آزمائی کی اسی صورت کی ترقی نے شہری جھگڑوں میں زیادہ غریب شہریوں کو اہم فائدہ پہنچا دیا۔

ؑ۲۔ "سیاسیات"، کتاب ششم (چہارم)، ۱۳۔ دیکھو ضمیمہ، تعلیق (ب)

سے سواروں کے رسالے مرتب کرتے تھے، لیکن میرا قیاس یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے زمیندار جو اپنے خرچ سے پیدل سپاہیوں کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے اور قدیم خاندان کے شرفاد یوپاتری) کے مقابلے میں ایتھنز میں حصہ داران اراضی (گیو موروئی کہلاتے تھے) انھیں آزاد شہریوں کی مجلس میں شریک ہونے اور انتخابات میں حصہ لینے کا حق باقی رہتا تھا اگرچہ عہدوں اور اصلی قوت کا مرکز شرفا ہی ہوتے تھے۔

ارسطو کا خیال یہ ہے کہ یہ دستور حکومت اولاً برے معنوں میں عدیدانہ نہیں تھا یعنی وہ چند اشخاص کی ستمگارانہ یا خود غرضانہ حکمرانی نہیں تھی اور اگرچہ میں اس قدر قدیم زمانے کے لیئے ارسطو کو کوئی اہم سند نہیں سمجھتا لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ بااغلب وجوہ یہ زیادہ ترجیح تھا کہ چند اشخاص کی یہ ابتدائی حکومتیں "طبعی عدیدات" کے نام کی سزاوار تھیں جس کے معنی یہ ہیں کہ معدودے چند کے ہاتھ میں اختیار اس وجہ سے چھوڑ دیا جاتا تھا کہ "اکثر" اس کے اہل نہیں تھے اور خود کو ایسا سمجھتے بھی نہ تھے۔ پس میرا قیاس یہ ہے کہ عدیدانہ حالات کا غلبہ صرف ایک ہی طرز پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مختلف طریقوں سے ہوتا تھا، کچھ تو اس طرح ہوتا تھا کہ موروثی بادشاہوں کو برطرف کرکے جب ان کے بجائے سالانہ منتخب شدہ حاکم یا مجلس حکام مقرر ہو جاتی تھی تو قدیم مجلس خاص کے اختیارات بڑھ جاتے اور خاص اسی کے ہاتھ میں جمع ہو جاتے تھے، کچھ اس طرح سے ہوتا تھا کہ کامل الحقوق شہریوں کی تعداد اس طرح محدود ہو جاتی تھی کہ (الف) جن مملکتوں کا قیام فتح پر مبنی ہوتا تھا ان میں مفتوحین کو اور نو آبادیوں میں بعد کے آنے والوں کو حقوق شہریت سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ (ب) دوسرے یہ کہ ایٹکا کی ایسی سلطنتوں میں سیاسی امتزاج، اتحاد باہمی اور دولت کی عدم مساوات دونوں جمع ہو جاتی تھیں۔ پس اس طرح آٹھویں ہی صدی قبل مسیح میں ان مملکتوں کے اندر عدیدیت قائم ہو گئی تھی، جو تمدن و تہذیب کی مشرد تھیں، ان میں یوبیہ کے اندر کورنتھ اور کالکس سب سے آگے تھیں۔ یہ تجارتی مملکتیں عدیدیت کی منزل طے کر چکی تھیں، لیکن مختلف ملتوں میں اس کا آغاز مختلف وقتوں میں ہوا تھا اور اس کے بقا کا زمانہ بھی مختلف تھا۔ اس کے بعد ساتویں صدی میں عدیدیت کے خلاف تحریک شروع ہوئی لیکن یونان کے جن حصوں میں زرعی کاروبار کا غلبہ اور تحفظی عادات کا تسلط تھا ان حصوں میں جہاں تک ہمیں علم ہے عدیدیت زیادہ دنوں تک

ہے گز نہ قائم رہی۔

لیکن اکثر ایسا ہوا تھا کہ عدیدیوں اور عوام کے درمیان اختیارات کے لئے جب کشمکش شروع ہوئی تھی تو عدیدیوں کی شکست کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا تھا کہ دفعتاً عمومی ادارات قائم ہو جاتے تھے کیونکہ اس پہلی منزل میں عوام ہنوز حکمرانی کے قابل نہیں ہوتے تھے، آزاد شہریوں کے انبوہ میں اتنی فہم و فراست اور اتنا ملکہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ متحد ہو کر زمام حکومت کو مجموعۃً اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ یہ اختیارات اسی حوصلہ مند شخص کے ہاتھ میں چلے جاتے تھے، جس نے اپنی شان و شوکت کے بڑھانے کے خیال سے اس تحریک کی رہبری اختیار کی ہو۔ اس طرح "ترانش" (خودسری حکومت) وجود پذیر ہو جاتی تھی، گویا شاہی کی طرف بازگشت ہوتی تھی۔ لیکن قریب قریب تمام صورتوں میں یہ شاہی غیر آئینی قسم کی ہوتی تھی، اور بلا استثنا اس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ حق و قائم شدہ نظم و ترتیب کی خلاف ورزی ہے، یہاں تک کہ بادشاہ جب نرمی و عمدگی کے ساتھ حکومت کرتا تھا اس وقت بھی یہی سمجھا جاتا تھا۔

مطلق العنانی

ا۔ میں اس سے قبل "مطلق العنانی" کے واقعہ عجیبہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ خودسرانہ حکومت سے مقصود وہ میلان ہے جو یونانی نظم حکومت کے نشو و نما کے ایک خاص درجے یا بعض مدارج پر پہنچکر پیدا ہو گیا تھا کہ حکومت ایک فرد واحد کے ہاتھ میں آجاتی تھی، جو جابرانہ ویے ضابطہ طور پر اقتدار حاصل کر لیتا تھا، اور مادام الحیات مطلق العنانی کے جتنے خاص واقعات ہمیں تاریخی طور پر معلوم ہیں ان سے بھی یہی پایا جاتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایسا شخص نہ صرف اپنی زندگی بھر کے لئے اس اقتدار پر قابض رہنے میں کامیاب ہو جاتا تھا بلکہ اپنے انتقال کے وقت وہ اپنے اس اختیار کو اپنے خاندان کے کسی رکن کی طرف بھی منتقل کر دیتا تھا (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں)، یہی وہ صورت ہے جو یونانی نظم حکومت کے ارتقا کو رومانی دستور سلطنت کے ارتقا سے ممیز کر دیتی ہے، اور سیاسیات کے طالب علم کے لیئے یہ اس نظر سے بھی دلچسپ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں اطالیہ کی بڑی جماعتوں نے جس طرح سیاسی ترقی حاصل کی اس میں اور یونان کی اس حالت میں خاص مماثلت پائی جاتی ہے۔ اطالیہ کی شہری جماعت کی ترقی کے متعلق میں بعد کو توجہ دلاؤنگا۔

میں یونانی لفظ تیرانس (Tyrnuis) یا مطلق العنانی کو اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ ایک طرف تو انگریزی لفظ ٹِرنی (Tyranny) سے خواہ مخواہ ذہن اس جانب منتقل ہو جاتا ہے کہ تیرانس یا مطلق العنان (Tyrannus)

اپنے اختیارات کو عملاً جبر، خودرائی اور ظلم کے ساتھ استعمال کرتا تھا اگر ایسا ہی ہوتا تھا، اگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا اور پانچویں اور چوتھی صدی (قبل مسیح) کے مصنفوں نے یونانی لفظ کو جس طرح استعمال کیا ہے، اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ ارسطو نے جس کی تحریر چوتھی صدی کے ربع آخر کی ہے، اس نے یہ لکھا ہے کہ کسی تیرانس (Tyrannus) کے لئے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو جابرانہ صورت ہے اور اکثروں نے اسی طریقے کو اختیار کیا ہے، اور دوسری مصالحانہ صورت ہے اگرچہ در اصل ارسطو کا مفہوم یہ ہے کہ نرمی و اعتدال سے حکومت کرنے کی وجہ سے کوئی "تیرانس" اس زمرے سے خارج نہیں ہو جائے گا، بلکہ وہ اسی نام سے یاد کیا جائے گا۔ دوسری طرف لفظ "ڈسپاٹ" یا مطلق العنان (Despot) اور بے ضابطہ ہونے کی خصوصیت کا مفہوم پوری طرح سے مترشح نہیں ہوتا ہے، اور اصولاً یہ ایک نہایت ہی اہم خصوصیت ہے۔ کم از کم مقدونیہ کے غلبہ تک تو ضرور ایسا ہی تھا، آزاد یونان کے جس قدر واقعات معلوم ہیں ان میں سے تقریباً ہر ایک واقعے میں یہ "خودسری" کسی زبردست ناگہانی کارروائی سے وقوع پذیر ہو جاتی تھی، اور بے ضابطہ و خلاف قانون صورت میں قائم رہتی تھی۔ ہمیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہے کہ کسی خودمختار یونانی سلطنت نے کبھی کسی کے حضور تاج پیش کیا ہو، البتہ جب اہل قرطاجنہ پر فتح حاصل ہوئی تو اس کے بعد گیلون (Gelon) کو سرقوسہ کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا، یہی ایک استثنا ہے، اور یہ بھی صاف طور پر واضح نہیں ہے

اس مطلق العنانی کی وسعت و حالات پر غور کرتے وقت ہمیں مقدم و موخر زمانوں میں امتیاز قائم کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے خودسری کے حسب مطلب خاص یونان میں مقدم دور کا آغاز ساتویں صدی کے نصف اول میں شروع ہوا تھا، اور اجمالاً یہ کہنا چاہیے کہ سرزمین یونان، جزائر ملحقہ اور یونان کے ایشیائی شہروں میں چھٹی صدی کے شروع ہونے کے قبل ہی اس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ (ایشیائی شہروں میں ان شہروں کو شمار نہ کرنا چاہیے، جو ایرانی حکومت کے تحت میں آ گئے تھے) یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ مختلف شہروں میں اس کا آغاز و انجام مختلف وقتوں میں ہوا کیا ہے اور کوئی خاص صورت ایسی نہیں ہے جس میں یہ بے ضابطہ مطلق العنانی (خواہ وہ موروثی ہی کیوں نہ ہو گئی ہو) بہت دنوں تک قائم رہی ہو۔ ارسطو کی رائے کے موافق سکیون کی مطلق العنانی

سب سے زیادہ طویل المدت تھی اور یہ کل سو برس تھی، مگر ان اطراف و اکناف میں شاہان مطلق العنان کے دور کو کم و بیش ۶۵۰ ق م سے ۵۰۰ ق م تک سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد پرزور و شاندار جمہوری زندگی کا آغاز ہوا جو جنگہائے ایران کے وقت سے شروع ہوکر مقدونیہ کے غلبہ کے وقت تک قائم رہی، ہم جب یونان کی تاریخ پڑھتے ہیں تو خاص طور پر اسی دور کو پڑھتے ہیں، یہی وہ زمانہ ہے جبکہ یونان میں شہری سلطنت کا سیاسی احساس اپنے اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا، اور جمہوری جذبات خواہ اعیانی صورت میں ہوں یا عمومی صورت میں بہ حیثیت مجموعی اس قدر قوی تھے کہ مطلق العنانی کی طرف مائل نہیں ہو سکتے تھے۔

سسلی اور جنوبی اطالیہ کی بعد کی نوآبادیوں میں، قدیم تر خودسری کا دور بعد میں شروع ہوا۔ اور بعد ہی میں ختم ہوا، اس کا آغاز ساتویں صدی کے آخر تک نہیں ہوا تھا، اور سسلی میں اس کا سب سے زیادہ تابناک زمانہ پانچویں صدی کا ربع اول تھا اور یہ زمانہ اس سے بہت ماقبل نہیں ہے جب (۴۶۷ء میں) عام طور پر مطلق العنانی کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔

اس کے بعد ۴۰۰ء کے بعد ہی جلد تر اس دور کا آغاز ہوا جسے ہم آخری مطلق العنانی کے نام سے ممیز کرتے ہیں مگر اس کی وسعت اتنی نہیں ہوئی جو کسی اعتبار سے سابقہ دور مطلق العنانی کی ہمسری کرسکے، کم از کم مقدونوی غلبے کے قبل تک تو یہ حال ضرور تھا، ان دونوں کے درمیان جو امتیاز ہے، اس پر اس اعتبار سے زائد از ضرورت زور دینے کی حاجت نہیں ہے، کہ دونوں دوروں میں جو طرز رائج تھا ان میں زیادہ قطعی وحتمی فرق تھا، مگر اجمالاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کے اسباب و علل مختلف تھے، سابقہ مطلق العنانی کے اسباب کا تعلق زیادہ تر یونانی شہری سلطنتوں کی داخلی سیاسی ترقی سے تھا، عمومی حکومت کی جانب ابتدائی نامکمل تحریکات کی وجہ سے بالعموم اس کا امکان پیدا ہوجاتا اور اس کے قیام کا موقع ملجاتا تھا، موخر مطلق العنانی کے اسباب بظاہر زیادہ تر اندرونی سیاسی ارتقا سے باہر واقع ہوئے تھے۔ سیاسی بدنظمی ہمیشہ اس کے مفید مطلب حالات پیدا کردیتی تھی مگر اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اجیر سپاہیوں سے کام لینے کا میلان بڑھتا جاتا تھا۔

ایک دوسری قسم کا سبب وہ تعلق ہے جو کمزور سلطنتوں کو اپنے زیر دست

ہمسایوں کے ساتھ پیدا ہوگیا تھا اور یہ سبب جس طرح دور ثانی میں اثر انداز تھا اسی طرح دور اول کے آخری حصے میں بھی تھا جن اقطاع ملک کو عملاً توابع کہنا چاہئے ان پر کسی زبردست ہمسایہ کے حکمرانی کرنے کا سب سے زیادہ سہل الحصول طریقہ یہ تھا کہ وہاں کوئی واحد حکمران مقرر کردیا جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے چھٹی صدی قبل مسیح کے اختتام پر ایشیائے کوچک کے ساحل آیونیہ میں مطلق العنانی رائج ہوگئی۔ اور سکندر کے ایران فتح کرنے کے بعد اور معاقدہ اکائیم کی نشو ونمائے سفیت کی جیسی کچھ ترقی ہوئی اس کے قبل بڑی حد تک اس کا خاتمہ ہوگیا۔

پس اجمالی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ خودسری کا دور اس زمانہ سے قبل واقع ہوا تھا جب یونانی شہری سلطنتوں کے باشندوں میں کامل سیاسی احساس نہیں پیدا ہوا تھا۔ بعد میں مطلق العنانی از سر نو اس وقت قائم ہوئی جب پر امن صنعت و حرفت کے عادات نے معمولی باشندوں کی طاقت اور ان کی حفاظت ذاتی کی عادت کو کمزور کردیا اور اس لئے جیسا کہ ارسطو نے واضح کیا ہے جو شخص مطلق العنان حکمران بنتا تھا ہر ایک واقعہ خاص میں اس کی نوعیت جداگانہ ہوتی تھی۔ ازمنہ قدیمہ میں جبکہ فصاحت و بلاغت کے فن نے ترقی نہیں کی تھی جو شخص عام پسند تحریک کے سرگروہ کی حیثیت حاصل کرتا تھا وہ بالعموم کوئی نہ کوئی فوجی قابلیت کا شخص ہوتا تھا اور اس طرح عوام کی سرگرگی سے گزر کر مطلق العنانی تک پہنچ جانا آسان تھا اور دور اول میں زیادہ تر یہی سرگروہ ترقی کرکے مطلق العنان حکمران بن جاتے تھے۔ اس کے برعکس، زمانہ مابعد کے سرگروہ معمولاً جنگجو لوگ نہیں ہوتے تھے اور اس لئے ان میں کسی زبردست ناگہانی کارروائی سے کامیابی حاصل کرلینے کی اہلیت بھی نہیں ہوتی تھی، اور چونکہ بعد کے زمانے کے عامۃ الناس سیاسی حد بلوغ کو پہنچ گئے تھے، اس لئے انھیں فریب دینا بھی علی العموم اتنا آسان نہیں تھا، تاہم اگر ان سے چاپلوسی و خوشامد سے کام نکالنا دقت طلب تھا تو انھیں دھمکی دینا ممکن تھا اور جنگ و پیکار کے اجیرانہ طرز کی ترقی کی وجہ سے فوجی قابلیت رکھنے والے بیباک سربازوں کو تہدید کے خطرناک مواقع حاصل ہو جاتے تھے، خاصکر اس حالت میں جبکہ فرقہ بندی و نافص حکومت نے آئینی حکومت کے ساتھ وابستگی اور قوم کے موثر ارتباط کو کمزور کردیا ہو۔

۴ - قدیمی عدیدیت کے خلاف تحریک کے اسباب حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) ارباب دول کی جانب سے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو تکلیف پہنچی تھی - یہ تکلیف کچھ تو عام حقوق کو دبا لینے سے ہوتی تھی، چنانچہ میگارہ میں خود سر تھیاگنیس نے دولتمندوں کے ان مویشیوں کو مار ڈالا جو اراضی عامہ میں داخل ہو گئے تھے[1] اور کچھ تکلیف اس وجہ سے ہوتی تھی کہ تمدن جس قدر ترقی کرتا گیا اسی قدر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے لئے دولتمندوں سے قرض لینے کا خطرناک راستہ وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ قدیم زمانہ کے شدید قانون کے تحت میں دولتمند غریبوں کو اسی طرح ستانے لگے جس طرح بعد میں روما میں -

(۲) تجارتی قصبوں میں، قدیم خاندانوں کے محدود گروہ کے باہر نئے نئے دولتمند بنتے اور ترقی کرتے گئے، جس سے کال شہریت کے نئے دعویداروں کی ایک روز افزوں قوت وجود میں آ گئی ہے[2]

(۳) تجارت اور وسائل آمد و رفت کی وجہ سے طبائع میں بیداری پیدا ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ عادات و اطوار کی قدیم سادگی اور قدیم اخلاقی قیود زائل ہوتے گئے جس سے امرا زیادہ قبیح عیش پرستی و رعونت کی طرف مائل ہو گئے[3]

(۴) انھیں اسباب میں ہم ایک سبب کا اور اضافہ کر سکتے ہیں، یعنی غیر تحریری قانون، کی طرف سے بے اعتمادی ہوتی گئی۔ کیونکہ جو دولتمند اسے عمل میں لاتے اور اسے نافذ کرتے تھے وہ اسے یوماً فیوماً غریبوں کے ستانے کا آلہ بناتے جاتے تھے -

اس آخری اور کسی حد تک پہلے سبب کا تدارک تحریری ضوابط کے نفاذ سے کیا گیا۔ ساتویں صدی وہ دور ہے جب ضابطہ ترتیب دینے والے یا مقنن محض افسانے کے علاوہ تاریخ میں پہلی مرتبہ افسانہ سے جداگانہ خود سر حکمران کے دوش بدوش نمایاں ہوئے -

---

[1] - ارسطو "سیاسیات" کتاب ہفتم، پنجم باب ۵، ۹ (۱۳۰۹ الف)

[2] - ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق (ج) متعلقہ قدیمی عدیدیت و تجارت

[3] - ارسطو - سیاسیات، ۷، (۵)، ۱۰، ۱۹ (۱۳۱۱ ب) کہتا ہے کہ منی لنہ (واقع لسبوس میں) پنتھال خاندان اس وجہ سے معزول کیا گیا کہ وہ سڑکوں پر دیانتدار شہریوں کو سونٹوں سے مارتے پھرتے تھے -

اول اول نوآبادیوں میں ان کا ظہور ہوا (۶۶۲ ؁ کے قریب) زالیوکس کا ذکر لوکری کے تحریری وضع قانون کے مصنف اول کے طور پر کیا گیا ہے [عل] ۔ اور کٹانا کا خاروندا س اس سے کچھ ہی بعد کو ہوا ہے ۔ ان دونوں صورتوں میں گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ مرتب ضوابط نے سلطنت کو مطلق العنانی کے پنجے میں گرفتار ہونے سے بچا لیا ۔ خاروندا س کے زمانے کے قریب یا اس سے کچھ قبل اتھینز میں ڈراکون نے قوانین وضع کئے تھے ، اور اس سے کچھ دن بعد سولن نے قوانین بنائے ۔ لیکن موخرالذکر سے مطلق العنانی کی روک تھام نہ ہوئی [عل۲] ہم یہ نہیں جانتے کہ زالیوکوس ، خاروندا س یا ڈراکون کو کس قدر سیاسی اختیارات تفویض ہوئے تھے ، البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ سولن کو اختیار حاصل تھا اور اس لئے ایسے "اے سمینت" کے زمرے میں ایک مثال کے طور پر شمار کرسکتے ہیں [ہو] ، بقول ارسطو [عل۳] شخصی حکمران یا آمر مطلق ہوتے تھے یعنی انھیں غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے مگر ان کا انتخاب قانون کے موافق ہوتا تھا ، یہ انتخاب خواہ زندگی بھر کے لئے ہو یا کچھ برسوں کی میعاد معین کے لئے ، سولن کا انتخاب صرف ایک برس کے لئے ہوا تھا یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کا انتخاب کسی خاص کام کے لئے ہو ۔ ارسطو نے جو مثال دی ہے وہ متی لنہ کے پتاکوس کی ہے جو دس برس کے لئے مقرر ہوا تھا (۵۹۰ ؁ ۔ ۵۸۰ ؁) ۔ ارسطو کہتا ہے کہ اس نے ایک مجموعۂ ضوابط کی ترتیب دی تھی مگر کسی دستور سیاسی کی ترتیب نہیں کی تھی ، اغلب یہ ہے کہ اس نے حکومت عدیدی کو تسکین بخش اور قابل برداشت بنادیا تھا ۔ بہر حال اتنا تو ضرور ہے کہ اس کے بعد سے ہم کسی مطلق العنان کا ذکر نہیں سنتے [عل۴] لیکن یہ

عل ۔ اسٹرابو ، ششم ۲۵۹ ۔

عل۲ ۔ سولن نے اتھینز کو مطلق العنانی سے تو نہیں بچایا مگر عمومیت کے عملدرآمد کے لئے زیادہ اچھا سامان تیار کردیا معلوم ہوتا ہے کہ سولن کے دستور کے اشکال مطلق العنان کے زمانے کے بعد تک باقی رہے ۔

عل۳ ۔ ارسطو ۔ سیاسیات کتاب سوم باب ۱۴ ، ۹ (۱۲۸۵ الف) ; ۶ (۴ ، باب ۱۰ ، ۲ (۱۲۹۵ الف)

عل۴ ۔ لیکن پتاکوس کا زمانہ ایک خود سرانہ حکومت کے دور کے بعد واقع ہوا تھا ، درحقیقت اس نے ایک خود سر ملینکروس کو زیر کرلیا تھا ۔ (۶۱۲ ۔ ۶۰۹ ق م) ،

ہو اے سمینٹ کی حیثیت سے ارسطو ایپمینیڈیس کا ذکر کرتا ہے ، جس کا تقرر اس وجہ سے ہوا تھا کہ ایک پلید

باقاعدہ مقرر کیسا ہوا حاکم مطلق ایک مستثنیٰ شخص ہوتا تھا، اس سے بدرجہا زیادہ کثیر الوقوع عجوبہ مطلق العنانی تھی۔

۳۔ ابتدائی خودسری کے حالات پر غور کرتے وقت ہمیں اپنے دل میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یونان کے مختلف حصص کی ترقی میں بہت بڑا تفاوت تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خود یونان اور اس کی نوآبادیوں کے چھوٹے سے خطے کے اندر مختلف خودمختار قومیں ایک ہی وقت میں مختلف مدارج ترقی کی حالت میں تھیں۔

یونان میں تمدن سمندر کے راستے سے داخل ہوا تھا، اور اسی تمدن کی جلو میں سیاسی تغیر کا سیل بھی بڑھ آیا تھا، پس سیاسی ارتقا کے معاملے میں اندرون ملک کی آبادی سواحل کی آبادی سے پیچھے رہ گئی تھی۔ تمدن جنوب و مشرق سے آیا تھا، مصر اور فینیقیہ اور خصوصاً فینیقیہ نے تمدن کی مشعل یونان کے ہاتھ میں دی تھی، لہٰذا شمال مغرب کے لوگ بلکہ اس کے ساحلی مقامات تک کے باشندے مشرق و جنوب کے باشندوں سے پیچھے رہ گئے، بجز ان مقامات کے جہاں آبادکار کورنتھ سے آئے تھے، جس کی خاص جائے وقوع نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ مشرق و مغرب دونوں سے یکساں طور پر تجارت کر سکے۔ ارتقا کے اس عدم مساوات کا اظہار نمایاں طور پر اوقات کے ان اختلافات سے ہوتا ہے جب یونان کے مختلف حصص نے شہری زندگی اختیار کی تھی۔ یہ نکتہ نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سیاسی نظم معاشرت کا وہ طرز جس میں سیاسی و معاشری زندگی ایک مرکزی شہر میں مجتمع ہوتی تھی یونان میں ترقی تمدن کے ساتھ متمدن نظم معاشرت کا رائج الوقت طرز تسلیم کر لیا گیا تھا، مگر اس سے ہمیں یہ فرض نہ کرنا چاہیے کہ یونان کی چھوٹی چھوٹی خودمختار قوموں نے ہر جگہ ایک ساتھ یہی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک طرف تو یہ صحیح ہے کہ ہومر کے وقت میں یہ انداز پیدا ہو رہا تھا چنانچہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے کو مار کر خودسر بن گیا تھا، پس اس طرح نیلیڈیوں کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا، بظاہر اس کا سبب عدیدیت کی مخالف تحریک نہیں ہے۔ گلبرٹ نے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ اہل میڈیا کے خلاف، ایرانیوں کے خروج کے وقت ایسیس کا ارسٹارکس مطلق العنان نہیں، بلکہ "اسے سمنٹ" تھا، فی الجملہ ہمارے گھر کی شہادت ناکافی ہے کہ "اسے سمنٹ" کا قائم ہونا عدیدیت کے خلاف عامۃ الناس کی جدوجہد کے طور پر ہوا تھا۔

اوڈیسی میں نویں یا آٹھویں صدی کے شاعر نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ پینیلوپ کے خواستگار جس طبقہ کے لوگ تھے یعنی اتھاکا کے امرا و شرفا وہ سب جزیرے کے کسی ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور غیر ملکی خواستگاروں کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ وہ "دوسرے شہروں کے لوگ" تھے[۱]۔ دوسری طرف تھیو سیڈائڈس[۲] یہ کہتا ہے کہ اس کے وقت یعنی پانچویں صدی کے نصف آخر میں مغرب اہل لوکرس، اہل ایتولیہ، اہل اکارنانیہ اور بر اعظم یونان کے شمال مغرب کے دوسرے باشندے بدستور اسی قدیم طرز کے چھوٹے چھوٹے غیر محصور دیہاتوں میں رہتے تھے، اور اس لیے ان میں ہتیار اپنے ساتھ رکھنے کی پرانی عادت بدستور باقی تھی، حالانکہ یونان کے زیادہ مہذب حصص میں روز افزوں امن و طمانیت کی وجہ سے یہ عادت مدتوں قبل ترک ہو چکی تھی، آرکیڈیا کے بہت بڑے حصہ میں "کینٹن" یعنی دیہاتوں کا حلقہ نسبتاً بہت بعد کے زمانے تک معمولی سیاسی فرد بنا رہا۔ تھیو سیڈائڈس نے جن مغربی حصص کا ذکر کیا ہے ان کی نسبت آرکیڈیا کا حال زیادہ تر معلوم ہے اور اس لئے آرکیڈیا کے متعلق اس امر کا سراغ لگانا بھی دلچسپ ہے کہ کس تدریجی رفتار سے نظم دستور سیاسی کے شہری طرز نے کوہستانی اضلاع پر یورشیں کیں، اس کارروائی میں سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ واقعات ہیں جنھیں یونانی "امتزاج" (Synaikism) کہتے تھے، یہ خیال و واقعہ بالکلیہ یونانی تاریخ کے لیے مخصوص ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتوں کی ایک تعداد کو بالارادہ اور مصنوعی طور پر قصبے میں بدل دیا جائے۔ اس کا ایک نمایاں اور مشہور عام واقعہ یہ ہے کہ چوتھی صدی میں جنگ لیوکترا کے بعد اہل تھیبس کے اشارے سے آرکیڈیا کے جنوب میں ایک "بلدیہ عظیم" (Megalppolis) اسپارٹا کے مدمقابل کے طور پر اور اس سے مامون و محفوظ رہنے کے لیے قائم کیا گیا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس "امتزاج" کی دو حیثیتیں تھیں، سیاسی و مادی۔ اصلاً و مقصداً یہ ایک سیاسی تغیر تھا مگر اس کے ساتھ مختلف وسعت کے مادی تغیرات بھی شامل تھے، جس امر کا تعین اور جس کا نفاذ ہوتا تھا وہ یہی تھا کہ چند دیہات جو اب تک بہت کچھ خود مختار

---

[۱] - اوڈیسی، کتاب ۲۴، ۴۱۸۔

[۲] - طوسی ویدش کتاب یکم، ۵۔

ہوتے تھے، ان کی سیاسی زندگی کا اجرا اب ایک نئے شہر کی صورت میں یا پرانے شہر کو وسعت دیکر قرار پاجاتا تھا، حکمراں جمعیتوں اور مجلسوں کا اسی شہر میں مجتمع ہونا ضروری ہوتا تھا اور حکمراں افراد مستقلاً وہیں قیام کرتے تھے، دیہات کے باقی لوگوں کے متعلق معمولاً یہ ہوتا تھا کہ وہ اگر چاہتے تو اپنے پرانے مکانوں میں رہنے کے مجاز ہوتے تھے، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو انھیں اس امر پر رضامند ہونا پڑتا تھا کہ ان پر مرکزی قصبے ہی سے حکمرانی ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم تر زمانے میں "کینٹن" یعنی کسی سیاسی جماعت کو جو دیہاتوں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں منتشر ہو اور جسے ایک معقول حد تک خود مختاری بھی حاصل ہو، شہری سلطنت کی صورت میں "مجتمع" کرنے کی یہ کارروائی نسبتاً کم تصنع اور زیادہ آہستگی کے ساتھ عمل میں آتی تھی مگر کسی نہ کسی شکل میں اس کا سلسلہ یونان کی تمام تاریخ میں جاری رہا۔

میں نے آخری خطبے میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ جہاں تک جمعیت کی ترکیب کا تعلق تھا قدیم تر زمانہ میں یہ تغیر کس طرح اولاً عدیدیت کی طرف مائل ہوتا گیا، دولتمند نے یا وسعت یافتہ شہر میں مجتمع ہوجاتے تھے اور غربا میں یہ استطاعت نہ تھی کہ وہ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر وہاں چلے جائیں، بغیر اس کے کہ غربا کو قدیم دستوری حقوق سے باضابطہ محروم کیا جائے علاوہ از خود احرار کی جمعیت عام کی شرکت سے معذور ہوجاتے تھے اور اسی لئے جب شہروں میں حرفتی و تجارتی مستقر کو ترقی ہوتی تو یہی اجتماع جو ابتدائی مدارج میں مطلق العنانی کا موقع پیدا کردیتا تھا، بالطبع عمومیت کی تحریک کے مفید مطلب بن جاتا تھا۔

لیکن حرفتی عناصر کی یہ نشوونما بھی حکومت کے ایک مرکز پر مجتمع ہوجانے کے باوجود، مختلف سلطنتوں میں نہایت مغائر یکدگر طور پر وقوع پذیر ہوتی تھی جن اقطاع میں کاشتکاری کو غلبہ حاصل ہوتا وہاں طبیعت کا وہ تحرک جو غیر ملکیوں کے ساتھ سہولت آمد و رفت کی وجہ سے پیدا ہوجاتا تھا، تجارت سے جو مختلف صنعتیں وجود پذیر ہوتیں، اور اسکے ساتھ خواہشوں میں جو وسعت پیدا ہوتی ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی تھی، اور متمول زمینداروں کی قدیم "طبعی عدیدیت" از خود بہت زیادہ زمانے تک قائم رہتی اور جب ان اقطاع میں عمومی تحریک کا وقت آیا تو اس وقت تک یونان میں مطلق العنانی کے متعلق سیاسی احساس میں تنفض پیدا ہوچکا تھا، اس لئے ان اقطاع

کے ارتقا میں یہ درجہ ساقط ہو گیا۔

۴۔ اسی وجہ سے ہم مطلق العنانی کے متعلق خود اس زمانہ تک میں جسے خودسروں کا دور کہتے ہیں یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ ایک ایسا درجہ ہے جسے یونانی نظم حکومت نے بلا استثنا بلکہ عام طور پر بھی طے کیا ہو، البتہ یہ ایک ایسا درجہ ضرور ہے جسے ان سلطنتوں نے بالعموم ضرور ہی طے کیا ہوگا جو چند خاص حالات کے تحت میں ترقی کر رہی ہوں گی یقیناً مطلق العنانی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، اور اس میں شک بھی نہیں کہ اگر ہمارے معلومات زیادہ مکمل ہوتے تو ہمیں اور بھی بہت سی مثالیں معلوم ہو جاتیں، لیکن زیادہ قریب سے دیکھنے سے ہم ہیلاس (یونان) اور اس کے مستعمرات (یعنی وسعت یافتہ ہیلاس) میں یہ تمیز کر سکتے ہیں کہ کس جگہ کس خاص دور میں حالات، مطلق العنانی کے زیادہ موافق تھے اور کہاں یہ ناموافق تھے، اور میرے خیال میں اس قسم کی تمیز کا قائم کرنا بہت ضروری ہے۔

ایشیائے کوچک کے ساحل اور سسلی و اطالیہ کے مستعمرات میں یہ طریقہ بہت ہی عام معلوم ہوتا ہے، اور یہی حال قدیم یونان کے ان حصص کا تھا جو تجارت کے اثر میں تھے، (یہ اثرات تمدن آفرین تھے اور اضطراب انگیز بھی) مگر قدیم یونان کے بیشتر حصص کے متعلق ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔

ہمیں اس پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے، شمال مغرب جہاں وہی جماعتیں اور معاشرت کے قدیم کیفیات بدستور جاری تھے، وہاں کی نسبتاً کم متمدن و غیر ترقی کن اقوام کو چھوڑ کر ہم تھسلی میں یہ دیکھتے ہیں کہ عدیدی حالات قدیم مطلق العنانی کے دور کے بہت آگے تک چلے جاتے ہیں اور جب بالآخر خودسر کا تسلط ہوتا ہے تو وہ عامۃ الناس کے سرگروہوں کے زمرے سے نہیں ہوتا۔ بیوتیہ میں بھی ہم مطلق العنانی کا ذکر نہیں سنتے، جنگ ایران کے وقت تھیبس میں مستحکم عدیدیت موجود تھی جو صورت حالات کا بقیہ معلوم ہوتی تھی اور جب چوتھی صدی میں پرزور عمومیت کی تحریک کا وقت آیا تو پھر مطلق العنانی کا وقت باقی نہیں رہا۔ اور غالباً بیوتیہ کے دوسرے شہروں کی نسبت بھی یہی صادق آتا ہے۔ جب ہم پیلوپونیز پر نظر کرتے ہیں تو اسپارٹا اور یتونیہ میں فی الواقع کسی قسم کی خودسری نہیں تھی، ارگوس میں بھی مطلق العنانی نہیں تھی، اور غالباً ارگوس اس طرح بچ گیا کہ وہاں تخفیف شدہ اختیارات کے ساتھ بادشاہی باقی رہ گئی تھی۔ ایلیس میں بھی مطلق العنانی کی کوئی

شہادت نہیں ملتی، یہی حال اکائیہ کی چھوٹی اور زیادہ عمومیت پسند جماعتوں اور کوہستانی، آرکیڈیا کے حلقہائے دیہی کا تھا۔

اس کے برخلاف اٹیکا اور خاکنائے (کورنتھ) اور یوبیا کی ساحلی اور زیادہ تجارتی سلطنتیں (سکیون، میگارا، کورنتھ، کالکس وغیرہ) ساتویں صدی کے وسط سے آگے برابر قدیم مطلق العنانی کی مشہور و معروف مثالیں پیش کرتی رہیں، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کچھ زمانے کے بعد نو آبادیوں میں بھی ہم خودسری کا زور و شور دیکھتے ہیں جنہیں ایشیائی ساحل کی وہ شہری سلطنتیں بھی شامل تھیں جو باقاعدہ استعماریت کے شروع ہونے کے قبل یونانی تارکان وطن نے قائم کی تھیں، سسلی کی نو آبادی میں خودسری کو خصوصیت سے سرسبزی حاصل ہوئی جہاں اسے شاندار دور نصیب ہوا۔ بلاشبہ مستعمری نظم بالطبع زیادہ تحریک پذیر تھا[1] اور غالباً یہ بھی تھا کہ مختلف نسلوں کا اختلاط مطلق العنانی کے حق میں زیادہ مفید تھا۔

اب اس سے میرا خیال اس طرف رجوع ہوتا ہے کہ جن مقامات میں خودسری کو فروغ حاصل ہو چکا تھا، وہاں سے بھی بعض حالتوں میں خودسری کا اخراج اس وجہ سے ہوا کہ عدیدیت کی بنیاد وسیع ہو گئی تھی۔ یہ کوئی ناقابل خطا علاج نہیں تھا مگر بہ حیثیت مجموعی موثر معلوم ہوتا ہے مثلاً پانچ مواقع ایسے ہیں[2] جن میں اگرچہ حکومت بدستور عدیدی سمجھی جاتی تھی مگر بحث و تحمیص کی اعلیٰ جماعت کی تعداد "ایک ہزار" تھی۔ ان پانچ مواقع میں سے ایک موقع تو ایشیائے کوچک کا تھا، تین اطالیہ کے اور ایک شمالی یونان کا۔ یونان کی شہری سلطنتوں کی وسعت کے تناسب سے جب اس پر خیال کیا جاتا اور ایک ہی ایک خاندان کے یا خاندانوں کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی حکمرانی سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اسے ایک توسیع دادہ عدیدیت کہہ سکتے ہیں، اور کم از کم ایک صورت میں تو ایسا تھا کہ اس قسم کی عدیدیت کے قیام کو شہریت کی وسعت کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق (د) درباره تقدم مستعمرات در تمدن۔

[2] یہ ہیں واقع ایوس، اوپس اور اس کی اطالوی نو آبادی لوکری، ارہے گیوم، کرتون کو لوزنا بھی اس زمرے میں ہے، مگر میرا خیال یہ ہے کہ وہاں اس قسم کی باضابطہ محدود سیاسی جماعت کے وجود کی شہادت کافی نہیں ہے۔

ب یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان پانچ صورتوں میں سے تین صورتوں میں ہم خود سری کا ذکر نہیں سنتے (حالانکہ ان میں سے چار خود سری کی سرزمین میں واقع تھیں)، دو باقی صورتوں میں سے ایک میں خود سر غیر ملکی حکمران آلۂ کار کے طور پر باہر سے مسلط کر دیا گیا تھا۔ پس اگرچہ ہمارے معلومات نہایت نامکمل سہی مگر یہ فرض کر لینا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ ان وسعت یافتہ عدیدیت میں ان بد نظمیوں کے مواقع کم تھے، جن سے آیندہ مطلق العنانی کا موقع نکل آتا تھا۔

علیٰ ہذا ایک یا دو صورتوں میں جہاں ہم یہ سنتے ہیں کہ سیاسی حقوق کی وسعت چھ سو حکمرانوں تک پہنچ گئی تھی وہاں بھی ہم مطلق العنانی کا کوئی ذکر نہیں سنتے[1]۔

۵۔ مطلق العنانی کی بحث کو ختم کرنے کے قبل اس کے اثرات کے متعلق بھی دو چار لفظ کہنا چاہیے۔ ہمارے لئے ان اثرات پر کوئی حکم لگانا مشکل ہے خاصکر مطلق العنانی کی قدیم تر صورت کے متعلق، کیونکہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ قدیم مصنفوں نے ان بیانات پر جیسا سیاہ رنگ چڑھایا ہے اسے کچھ ہلکا کرنا ضروری ہے۔ ہمارے سامنے وہی مثل ہے کہ شیر کا نقش انسان نے بنایا ہے (ولیکن قلم در کف دشمن است) ہم دوسری جانب کے دلائل سے واقف نہیں۔ تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ باوجودیکہ یونان میں عملاً خود سروں کا دور دورہ تھا مگر علمی جہت سے ان کی جانبداری کا کوئی ذکر کہیں سننے میں نہیں آتا۔ مثلاً ہم یہ نہیں سنتے کہ یہ مطلق العنان کبھی نظم و امن یا مذہب کے حامی ہونے کا ادعا کرتے ہوں یا عدیدیت کے ظلم و تعدی کے خلاف قوم کے حقوق کے مربی یا قوم کی مرضی کے ملجا و ماویٰ بنکر نمودار ہوتے ہوں، ان کی حمایت میں اس قسم کی باتیں زمانہ حال کے مصنفوں نے لکھی ہیں، مگر مجھے کسی یونانی مصنف کا حال نہیں معلوم ہے جس نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہو، اور (جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں) اگرچہ بہت سے مطلق العنان عامۃ الناس کی سرگروہی کے وسیلہ سے اس مطلق العنانی تک پہنچے تھے، مگر عام طور پر اس کی نسبت اتنا بھی نہیں کہا جاتا کہ اپنی حکمرانی قائم کر لینے کے بعد انھوں نے محض ظاہرداری ہی کے طور پر عام سرگروہ کی حیثیت برقرار رکھی ہو۔ اس میں

---

[1] ہرقلیہ۔ مسالیہ، (ارسطو) سیاسیات، (۵، ۶، ۳)، مگر چوتھی صدی میں سرقوسہ کا مقابلہ کیجئے۔

شک نہیں کہ غالباً وہ ایک حد تک ایسا کرتے تھے، تاہم ابتدائی خودسر (تو ضرور ہی ایسا کرتے تھے)، وہ اپنی سرگروہی کی حیثیت قائم رکھتے تھے، مگر ان کے جانشین علی العموم بادشاہ بن جاتے تھے، چنانچہ سکیون میں سیورس کی مشہور مطلق العنانی کے معاملہ میں کلیستھنیس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس شخص کو تاج پہنایا جس نے ورزشی مقابلہ میں بہ حیثیت حکم کے اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا[1]؛ اسی طرح ایتھنز میں پی سسترا توس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مقدمہ کی سماعت کے لئے "اریوپاگوس" کے روبرو حاضر ہوا؛ علیٰ ہذا کورنتھ میں، کپسیلوس اس امر کے لئے مشہور تھا کہ اس نے اپنے دوران حکومت میں اپنی حفاظت کیلئے کبھی نیزہ برداروں کی جماعت نہیں رکھی، لیکن یہ "شان عمومیت" برابر مٹتی جاتی تھی، اگر پہلے مطلق العنان کی زندگی میں نہیں تو (اگر وہ اپنے اختیار کو موروثی بنانے میں کامیاب ہو جائے) اس کے جانشین کے زمانے میں ضرور ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا، چنانچہ (آخر میں) خودسر حکمران کے اعزاز میں عامۃ الناس اکثر بطیب خاطر اور کبھی کبھی پرجوش تنفر کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔

مگر اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر دانشمند اور اعلیٰ نسب والوں ہی کو مطلق العنان سے متنفر ہونے کی خاص وجہ ہوا کرتی تھی، یہ یقینی ہے کہ ارسطو نے خود اس حکومت کے جس "جابرانہ طریق" کا نقشہ کھینچا ہے وہ بالتخصیص خوش حال لوگوں ہی کے لئے تھا؛ ضیافتوں بزم گاہوں اور محکوموں میں بلندیٔ طبیعت و اعتماد باہمی کے تمام وسائل اور تعلیم کا دبایا جانا اور یہ اصول مسلمہ قائم کرنا کہ خودسر حکمران کی رعایا کو "غریب" و مشغول کار رکھنا چاہئے؛ ان تمام امور کا اثر عملی طور پر صرف دولتمندوں پر پڑتا تھا؛ از روے روایت سخت گیری کا یہ طریقہ کورنتھ کے پری آندر کی جانب منسوب کیا جاتا تھا جو قدیم طرز کے مطلق العنانوں میں ایک نہایت ہی مشہور و زبردست مطلق العنان گزرا تھا؛ اور ہیرودوتس نے اسی کی نسبت جو قصہ بیان کیا ہے[2] کہ کیونکر اس نے ملطہ کے تھراسی بولوس کے پاس آدمی بھیجکر اس سے حکومت کے حق میں مشورہ طلب کیا، تھراسی بولوس کس طرح اس قاصد کو ایک غلے کے کھیت

عه۱۔ ارسطو، "سیاسیات" ۸ (۵) ۱۲ ۲۷۔

عه۲۔ ملاحظہ ہو واقعہ کورنتھ، کلیبس ارسطو، سیاسیات ۸ (۶)، ۱۴

میں لیجا کر اس کے سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا اور اس گفتگو کے دوران میں اس نے غلے کی سب سے اونچی اونچی بالیں توڑ لیں مگر اور کوئی جواب نہیں دیا اور پری اینڈر نے اس علامت کے مفہوم کو کس طرح سمجھ لیا، اس سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ "ذی علم و سربر آوردہ اشخاص" ہی وہ لوگ تھے جنھیں بالتخصیص خوف کی وجہ تھی۔ علیٰ ہذا، وہ تعمیرات عامہ جن سے ایک سے زائد خود سروں کو شہرت حاصل ہوئی، (اور جس میں المپیا کے زیوس کا وہ مندر بھی شامل ہے جسے پی سسٹراتوس نے تعمیر کیا تھا) ان سے یہ فائدہ مرتب ہوتا تھا کہ غربا کو کام ملجاتا تھا اور اس کے لئے جس قدر محصول کی ضرورت پڑتی تھی اس کا بار خصوصیت سے امرا پر پڑتا تھا، یہی امر جنگ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے، ساموس کے پولکریٹس کی غارتگری تو بہر نوع اسی قسم میں شامل تھی مگر اغلب یہ ہے کہ کامیاب لڑائیوں کا مال غنیمت نے ان لڑائیوں کو مقبول عام بنا دیا تھا۔

دوسری جانب ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ سلطنت کے اقتدار و اعتبار کے بلند کرنے میں حکمرانوں کو کس درجہ کامیابی ہوئی سکیون کا دور مطلق العنانی ہی، اس شہر کی عظمت و تحت کا واحد زمانہ تھا، اور فریقانہ جذبات سے الگ ہو کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل کورنتھ کو ایک حد تک پری اینڈر پر اور اہل ساموس کو پولکریٹس پر ناز ہونا چاہئے تھا، گیلوجس نے اسی زمانے میں جب ایرانیوں نے یونان پر حملہ کیا تھا، سسلی میں اہل قرطاجنہ کے مقابلے میں یونانی تہذیب و تمدن کی موافقت کی تھی، وہ اسی طرز حکومت کی ایک نمایاں مثال تھا، اس کی فتح عظیم کے بعد اسے مطلق العنان کہنا دشوار ہے، بلکہ وہ مقبول عام بادشاہ ہو گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ خود سر اکثر اپنے شہر کو زیب و زینت دیتے اور علم و فن کی سرپرستی کرتے تھے۔

مگر اغلب یہی ہے کہ غیر آئینی حکمرانی جسے قوم کے زیادہ مہذب و متمدن حصے نے اخلاقاً ملعون ٹھہرا دیا تھا (اور معدودے چند نوی غلبے کے قبل تو ضرور، یہی حال تھا) تقریباً ہمیشہ آخر میں جا کر پست و متبذل ہو جاتی تھی، بہر نوع یہ قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مطلق العنانی کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں اس کی حکومت کا طرز ہمیشہ ستمگارانہ ہی نہیں رہتا تھا اور اگرچہ بعض اوقات یہ حکمرانی نرم و انصاف پرور بھی معلوم ہوتی ہے جو قوم کی طاقت و شہرت کو ترقی دیتی، جنگ میں کامیاب رہتی، اور اپنے وطن میں علم و فن کی

ہمت دفزائی کرتی تھی، مگر بااین ہمہ چونکہ یہ حکومت ہمیشہ بیضابطہ خلاف قانون اور جبر و تعدی کے ذریعے سے رائج ہوتی تھی اس لیے یونان اسے بلاشک وشبہ ملعون قرار دیتا تھا

ہم لوگ یونانیوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ کو زمانہ حال کے خیالات کی روشنی میں پڑھتے ہیں اس لیے ایک طرف بادشاہی اور دوسری طرف عددیت وعمومیت دونوں کے درمیان جو وسیع امتیاز قائم تھا اس پر ہمارا ذہن آسانی سے حاوی نہیں ہوتا۔ ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ بادشاہی واقعات ناگہانی سے قائم ہوئی تھی مگر اسی طرح عمومیت وعددیت بھی برابر انقلاب ہی کے ذریعے سے قائم ہوتی تھیں اور یہ انقلابات بھی کچھ کم ستمگارانہ ومفسدانہ نہیں ہوتے تھے، خاصکر اس وقت سے تو یہی حالت تھی کہ جب سے اتھنز و اسپارٹا میں فوقیت کے لئے کشاکش شروع ہوئی اور ہر ایک سربرآوردہ سلطنت ان متضاد سیاسی اصول سے ایک نہ ایک اصول کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور اس کی نمائندگی کرنے لگی۔ مطلق العنانی کے ساتھ مختص بغض وتنفر کی تشریح کرنے کے لئے ہمیں امور ذیل ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

اول یہ کہ جب عمومیت یا عددیت کی اسناد کیا اس کی امداد، جبر و تعدی سے ہوتی تھی، اس وقت بھی واقعاً جو نظام حکومت معین ہوتا تھا وہ عام طور پر کسی نہ کسی متفق علیہ مفاہمت باہمی کا نتیجہ ہوتا تھا اور اس لئے باعتبار ظاہر حسب قانون ہوتا تھا، دوسرے یہ کہ بادشاہی (جبر و تعدی کے سوا) کبھی کسی اور طریقے سے قائم ہی نہیں ہوتی تھی، کم از کم ارسطو کے قبل کے زمانے میں جس کا حال ہمیں ہمعصر مورخوں سے معلوم ہوا ہے یہی کیفیت تھی۔

مزید برآں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ عددیت وعمومیت کے درمیان جو مباحثہ ہوتا رہا اس میں دونوں جانب کے نظری دلائل میں ناقابل انکار قوت موجود تھی۔ دیگر امور ایک سے ہوں تو یہ امر صاف طور پر قرین عقل ہے کہ کثیر اشخاص کے فیصلے کو چند اشخاص کے فیصلے پر غالب آنا چاہیئے۔

علیٰ ہذا یہ بھی قرین عقل ہے کہ عقلمند اور اچھے لوگوں کے فیصلے کو غالب آنا چاہیئے۔ خواہ ان کی تعداد کم ہو یا زیادہ اور ارباب دولت کی جماعت قلیل کو فرصت کے باعث سیاسی فہم وفراست کے حاصل کرنے کی خاص سہولتیں میسر ہوتی ہیں اور ان

ترغیبات وتحریصات سے وہ خاص طور پر بریٰ ہوتے ہیں جو معمولی جرائم کا خاص باعث ہوتے ہیں، لیکن یہ سیاسی نظریات جس وقت بنے تھے اس زمانے کے لوگوں کے حالات پر نظر کرتے ہوئے اس قسم کی کوئی نظری دلیل اس امر کیلئے نہیں قائم کی جا سکتی کہ ایک شخص واحد کے فیصلے کو اس کے تمام ہموطنوں کے فیصلے پر غالب آجانا چاہئے۔

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خودسر کا اقتدار جب اس درجہ عام طور پر ناپسند کیا جاتا تھا تو پھر وہ کس بنیاد پر قائم ہوتا تھا؟ عموماً حکومت کا انحصار یا تو قوم کی عملی ہمدردی وپسندیدگی پر ہوتا ہے یا، اطاعت کی عادت پر، جس میں اگر کل قوم نہ داخل ہو تو کم از کم اس کا اتنا حصہ ضرور ہونا چاہئے جو باقی کے لئے ہیبتناک بن جائے تو پھر خودسر کی قوت کا انحصار کس امر پر تھا؟ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ علی العموم خودسری کا آغاز اہل ملک کے ایک زبردست جزو (بالعموم زیادہ غریب طبقے کی) مصدقہ تائید سے ہوتا تھا جو موجودہ حکومت سے بیزار ہوتے تھے۔ لیکن جب ایک مرتبہ یہ حکومت قائم ہوجاتی تھی تو پھر اسے اجیر سپاہیوں کی ایک محدود جماعت کے سوا اور کسی کی تائید کی ضرورت نہیں رہتی تھی، اس جماعت کو جب تک تنخواہ مل جاتی تھی اسے اس سے بحث نہیں تھی کہ وہ خودسر کرتا کیا تھا؟ رہ گئے اہل ملک سو وہ عادت، خوف یا اتحاد باہمی کی کمی کے باعث بالعموم مطیع رکھے جاتے ہیں۔

ابتدائی مطلق العنانی کے دور کے گزر جانے کے بعد ہم اس منزل میں داخل ہوتے ہیں جس میں کسی نہ کسی قسم کی جمہوری حکومت عام تھی اور کچھ زمانے کے لئے تو بالکل ہمہ گیر ہوگئی تھی، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں شہری سلطنتوں میں کم وبیش ایک صدی تک تقریباً ہر جگہ مروجہ سیاسی احساس مطلق العنانی کے خارج کردینے کے لئے کافی قوی تھا۔ اس لئے اس دور میں تنازعہ عددیت وعمومیت کے درمیان ہوتا تھا اگرچہ چند قلیل التعداد حالات میں عددیت نے خود کو قائم رکھا تھا اور بیشتر حالات میں "قلیل" و "کثیر" کے درمیان طولانی کشمکش چلی جا رہی تھی جس کا کبھی قطعی طور پر تصفیہ نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ چوتھی صدی کے نصف آخر میں مقدونوی غلبے نے نئے حالات پیدا کردئے مگر ارتقا کی اس منزل کی عام خصوصیت یہی تھی کہ وہ عمومیت کی طرف قطعی طور پر گامزن تھی، میں اس گمان کی طرف مائل ہوں کہ اگر ان سلطنتوں کے داخلی نشوونما میں خارجی تعلقات نے ابتری نہ

پیدا کی ہوتی تو بہ حیثیت مجموعی یہ تحریک عمومیت زیادہ قطعی ہو جاتی اگرچہ اس حال میں بھی اس میں شک نہیں کہ اس کی تکمیل کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوئی لیکن اسپارٹا کے غلبے نے ایتھنز کے توازن پیدا کردینے کے باوجود جابجا عددیت کی بزور تائید نہیں کی تھی اور خاصکر (سنہ ۳۷۱ ق م کی، جنگ لیوکٹرا کے قبل ۔)

یونانی عمومیت

۱- میں اپنے سابق خطبے میں، ابتدائی مطلق العنانی کے متعلق جو کچھ کہنا تھا، اسے ختم کرکے مختصراً اس کشمکش کے خصوصیات بیان کرنے کی جانب متوجہ ہوگیا تھا جو آزاد یونان کے سب سے زیادہ شاندار دور میں عدیدیت و عموميت کے درمیان جاری رہی تھی اور یہ دور جنگ ایران کے بعد سے غلبۂ مقدونیہ یعنی سنہ ۴۸۰ء سے سنہ ۳۳۶ء تک گویا ڈیڑھ صدی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کی سیاسی تحریک کی تمامتر خصوصیت یہ تھی کہ وہ کامل ترقی یافتہ عموميت کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی تھی یعنی بڑھے ہوئے عدیدی حالات سے معتدل عموميت کی طرف اور معتدل عموميت سے انتہائی عموميت کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔

لیکن عموميت کی جانب اس میلان ورجحان کا پتہ رواں و سرسری طور پر چل سکتا ہے یعنی یہ میلان کسی جہت سے بھی یکساں و پائیدار نہ تھا۔ چند صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عدیدیت عموميت کا کچھ شائبہ لئے ہوئے قائم رہگئی تھی یعنی بعض اغراض کے لئے شہریوں کی مجلسیں برقرار تھیں، لیکن اکثر صورتوں میں ہم انقلابات اور پھر صریحاً عدیدیت کی صورت میں تنزل کرجانے کا حال سنتے ہیں۔ عموميت کے میلان میں کسی حد تک سلطنتوں کے خارجی تعلقات کی وجہ سے خلل پڑا مثلاً یہ کہ اہم تجارتی مرکز کورنتھ ابتدائی مطلق العنانی کے بعد سے مقدونوی دور تک کے تقریباً تمام زمانہ میں اسپارٹا کے اثر کی وجہ سے، عدیدی بنا رہا۔ یہ بھی

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری اطلاع نہایت جزوی و منتشر ہے تاہم اس میلان و رجحان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا؛ جن تغیرات کا ہم ذکر سکتے ہیں ان کی نسبت اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ترقی معکوس بالکل نہیں ہوئی، تاہم عمومیت کی جانب اقدام زیادہ اور اس سے انحراف کم تھا۔

عمومیت میں ایک ایسی شان جسے مطابق فطرت کہا جاتا ہے اس وجہ سے ہویدا ہو گئی تھی کہ اس میں سیاسی جوش شامل ہوتا تھا اور قومی تحریک اکثر عمومی تحریک ہو جاتی تھی چوتھی صدی کے حصہ اول میں تھیبس میں عمومیت کا جو مختصر و شاندار دور گزرا اس سے ہم اس بیان کی توضیح کر سکتے ہیں، یہ تحریک عمومی ہونے کے ساتھ ہی قومی بھی تھی اور اس تحریک نے تھیبس کو اس مقتدر حیثیت پر پہونچا دیا جو ۳۷۱ ق م میں جنگ لیوکٹرا کی وجہ سے اسے حاصل ہو گئی تھی، یہی وہ فیصلہ کن جنگ تھی جس نے اسپارٹا کے غلبے اور اس کے بےنظیر فوجی امتیاز کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ہی دوسری مثال آرکیڈیا کے نشو و نما میں ملسکتی ہے جب اس نے تھیبس کے غلبے کے زمانے میں تھیبس کے سرگروہوں کے زیر اثر اپنے لئے ایک نیا وفاقی نظام حکومت قائم کیا، اور جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں[1]۔ اسپارٹا کی زیادہ موثر مقاومت کے لئے چند دیہاتوں کو ملا کر ایک "شہر اعظم" کی بنا ڈالی تو آرکیڈیا کا یہ اتحاد عام لامحالہ عمومی شکل کا تھا، حکمران جماعت میں جنگ کی قابلیت رکھنے والے تمام لوگ شامل تھے۔ علی ہذا، جب ۳۳۴ ق م میں سکندر نے ایونیا کے شہروں کو ایرانی تسلط سے آزاد کیا تو اس کی یہ کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اس نے لابدی طور پر ان کی عمومیت انھیں واپس دے دی۔

یہ میلان ارسطو کے بیان سے بھی صاف و واضح ہے اور اس کی نسبت جو وجہ اس نے بیان کی ہے وہ قابل لحاظ ہے، وہ کہتا ہے کہ "اب کہ شہر اس قدر وسیع ہو گئے ہیں، اس کے سوا حکومت کی کوئی اور شکل قائم کرنا آسان نہیں ہے[2]"۔ مزید براں

---

[1] خطبۂ ششم صفحہ ۹۲

[2] سیاسیات　　حصۂ سوم باب پانزدہم

یہ میلان ایک دوسری صورت میں بھی نظر آتا ہے وہ یہ کہ واقعاً ارسطو کے زمانہ تک عمومیت
زیادہ عمومی ہوتی جاتی تھی۔ ارسطو نے نہایت ناموافقانہ طور پر جس شئے کو عمومیت کی انتہائی
شکل بیان کیا ہے، جس میں عموعی جمعیت کے فیصلے قانون سے بالاتر ہو جاتے تھے اُس کی
نسبت وہ کہتا ہے کہ اس شکل نے تاریخی سلسلہ میں سب سے آخر میں ترقی حاصل کی تھی۔ ہمیں
یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ارسطو یہ لکھتا ہے کہ عمومیت، عدیدیت[1] کے بہ نسبت زیادہ محفوظ
و مستقل ہے، نیز یہ کہ عدیدیت اور مطلق العنانی حکومت کی تمام شکلوں میں سب سے کم عمر
پاتی ہیں۔ میں[2] اس بیان کو اس موخر دور کی عدیدیت کی نسبت سمجھتا ہوں اور اس کا یہ مفہوم
قرار دیتا ہوں کہ میلان عمومیت کے اس دور میں عدیدیت کی جانب بازگشت نہایت ہی
ہنگامی ہوتی تھی۔

۲۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس دور کی عدیدیت و عمومیت کے طُرق کی ایک عام
کیفیت بیان کروں مگر عدیدیت کے متعلق ہمارے پاس شہادت ناکافی ہے۔ ہم اسپارٹا کے
دستور سلطنت کے متعلق کچھ حالات جانتے ہیں مگر میں آپ کو پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسپارٹا
کا دستور سلطنت بالکل یکتا تھا یا ایک عجیب و غریب باقی تھا اور یونانیوں کی نگاہ میں صاف
طور پر عدیدی نہیں تھا، کم از کم نیابتی عدیدیت کی حیثیت تو نہیں تھی پس میں جو کچھ کرونگا وہ یہی
ہوگا کہ ارسطو نے "سیاسیات" میں قلت و کثرت تعداد کے اعتبار سے اصناف عدیدیات
کا جو خلاصہ دیا ہے، انھیں پر مختصراً نظر ڈالوں[3]۔

عدیدیت کی سب سے زیادہ نرم صورت جسے اکثر املاکیت (Timmcracy)
کہا جاتا ہے، وہ صورت تھی جس میں عام جمعیتیں اور کثیر التعداد جوری یا عدالتیں اسی طرح ہوتی
تھیں جسطرح عمومیت میں ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ یہ ان لوگوں تک محدود تھیں
جن میں صاحب املاک ہونیکا ایک خاص وصف موجود تھا، یہ شرط اتنی بلند ہوتی تھی کہ اس

---

[1] سیاسیات حصہ ششم باب دہم
[2] سیاسیات حصہ ہشتم باب دوازدہم
[3] سیاسیات حصہ ششم۔ چہارم) باب ششم ملاحظہ ہو۔ سیاسیات حصہ ہفتم (پنجم) باب ہفتم
ارسطو نے عدیدیت کے مختلف اقسام کی جو ترتیب قرار دی ہے، وہ زیادہ کارآمد ہو جاتی اگر اس میں وہ یہ
خیال رکھتا کہ ایک دور میں جو عدیدیت رائج ہوتی تھی تاریخ ارتقاء اسے دوسرے دور کی عدیدیت سے مختلف
بنا دیتا تھا، مگر بظاہر اسنے اسکا خیال نہیں رکھا۔

یہ فرائض اہل ملک کی ایک قلیل تعداد کے ہاتھ میں آجاتے تھے مگر اتنی زیادہ بلند نہ ہوتی تھی کہ یہ جماعت قلیل بہت ہی مختصر ہو جائے۔

یہ لازمی تھا کہ املاک کی شرط جس قدر بلند ہو جاتی تھی اسی قدر حکومت کی شکل میں عدیدیت کا زور و غلبہ ہوتا جاتا تھا، مگر عدیدیت کو سخت کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں تھا، بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ جنگ و صلح، وضع قانون، انتخاب و نگرانی عمال و دیگر اہم فرائض سلطنت کے متعلق غور و بحث کرنا اور ان پر فیصلہ صادر کرنا، (جو عمومیت میں شہریوں کی عام جمعیت کے اندر انجام پاتا تھا)، اس قسم کی عدیدیت میں جزاً یا کلاً ایک مختصر سی منتخب شدہ جماعت کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بعض وقت یہ بھی ہوتا تھا کہ اس قسم کی غور و بحث کرنے والی جماعت کی خالی جگہیں بقیہ ارکان کے انتخاب سے پُر کر دی جاتی تھیں اور اصلاح دستور سلطنت کی عدیدی خصوصیت اور بڑھ جاتی تھی۔ آخری امر یہ ہے کہ بعض وقت اس قسم کی جماعت کی رکنیت موروثی کر دی جاتی تھی اور اس طرح عدیدیت انتہائی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

اسی طرح عدیدیت میں حکام کا انتخاب بھی جائداد کی شرط سے محدود تھا، اور کل حکام یا اُن کا زیادہ حصہ بالعموم قرعہ اندازی سے نہیں بلکہ انتخاب سے مقرر ہوتا تھا، صرف عدیدیت کی شدید ترین صورت میں حکام کا عہدہ بعض خاندانوں میں موروثی بنا دیا جاتا تھا۔

ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض وقت جمعیتوں میں رائے دینے کا حق حسب ضابطہ اس سے زیادہ وسیع تھا جتنا عملاً وقوع میں آتا تھا، یہ ایک عدیدانہ تدبیر تھی کہ دولتمندوں کی غیر حاضری کے لیئے جرمانے کے ظاہرا سخت قانون کے ذریعے اُن کے غلبے کا تیقن کر لیا جاتا تھا، یہ بھی عدیدیت کی ایک خصوصیت تھی کہ غور و بحث کی مجلس میں جو کارروائی منظور کرانا ہوتی تھی اس کے ابتداءً پیش کرنے کے لیے ایک مختصر سی مجلس شوریٰ بنالی جاتی تھی، حالانکہ عمومیت میں اسکے خلاف ہوتا تھا چنانچہ ایتھنز میں ۵۰۰ آدمیوں کی مجلس (Boule) ہوتی تھی۔

۳۔ اب ہمیں عمومیت پر غور کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، جسکے متعلق

ہم ایتھنز کی علمی شان کی وجہ سے زیادہ وقفیت رکھتے ہیں، عمومیت کے متعلق بھی یہ مسئلہ ارسطو کے صریحی بیان سے صاف ہو جاتا ہے کہ عمومیت کی طرف جو میلان و رجحان تھا وہ پوری ترقی کردہ یا انتہائی عمومیت کی جانب تھا[۱]، اور ایتھنز کی چوتھی صدی کے دستور سیاسی کو ہم اس طرز عمومیت کا نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔

پانچویں صدی میں ارتقا کی کارروائی ایتھنز میں جاری رہی، اور چوتھی صدی میں ان کا مکمل نتیجہ ہمارے سامنے آیا۔ ایتھنز کے دستور سلطنت کے متعلق جو تحریر حال میں دستیاب ہوئی ہے اور جسے ارسطو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور یہ تو صاف

---

[۱] ارسطو چار قسم کی عمومیت میں تمیز قائم کرتا ہے، اور خوبی کے اعتبار سے اس کی ترتیب تاریخی ترتیب سے اس درجہ برعکس ہے کہ بہترین قسم بلا شک وشبہہ قدیم ترین قسم تھی (دیکھو سیاسیات حصہ ہفتم (ششم) باب چہارم، اور لاریب کہ بدترین قسم آخری قسم تھی (سیاسیات حصہ ششم (چہارم) باب ششم) اس نے غالباً نقص کے اعتبار سے اوسط قسم کو وقت کے اعتبار سے بھی اوسط خیال کیا تھا مگر ان کا تصور مبہم سا قائم کیا گیا ہے بہترین قسم کے متعلق اس کا زیادہ تاریخی تخیل صاف طور پر سولن کے زمانے کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم میں تمام آزاد شہریوں کو عہدہ داروں کے انتخاب کرنے، ان سے جواب طلب کرنے اور فیصلہ کرنے کا حق ہوتا تھا مگر حکام کے عہدوں کے ساتھ جائداد کی قید لگی ہوئی تھی، اور جہاں لوگ بیشتر کاشتکاری میں مصروف رہنے کی وجہ سے اسقدر مشغول رہتے تھے کہ زیادہ مجلسیں منعقد نہیں کر سکتے تھے، اور عملاً اس قدر مصروف کار ہوتے تھے کہ جوری کی خدمات انجام نہیں دے سکتے تھے، وہاں ان دونوں میں سے کسی کام کے لیے کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔

ارسطو عمومیت کی بہترین قسم کی مثال کے طور پر مین ٹی نیا کی عمومیت کو پیش کرتا ہے، یہ عمومیت بہت مدت تک خالص زرعی رہی اور ہیروڈوٹس اور پولی بیوس دونوں اس کی اعلیٰ شہرت کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہاں حسب دعویٰ ارسطو مجلس، عہدوں کے لیے انتخاب نہیں کرتی تھی، یہ کام ایک جماعت انجام دیتی تھی جو تمام شہریوں کی طرف سے منتخب ہوتی تھی۔ ہم نہیں جانتے کہ اس قدیم طرز کی دوسری عمومیتیں اور کس قدر تھیں۔ پولی بیوس کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اکائیا نے اسکی مثالیں مہیا کی ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ یہ تحریر اسی کے زمانہ کی ہے، اس سے یہ مسئلہ بین طور پر صاف ہو جاتا ہے، صاحب تحریر کا خیال ہے کہ ۴۰۳ء میں جو دستور قائم تھا وہ بعینہٖ ویسا ہی تھا جیسا اوس کے زمانہ میں چوتھی صدی کے ربع ثالث کے آخر میں تھا، وہ اسے شمار میں گیارہواں قرار دیتا ہے اور سابق کے دس مدارج میں سے کم از کم چھ کا تعلق پانچویں صدی سے سمجھتا ہے، اس صدی کا آغاز کلس تھینس کی معتدل عمومیت سے ہوا تھا، مگر کلس تھینس کے اصلاحات سے ایتھنز کی عمومیت قطعی طور پر "عدیدی سرپرستی" سے خارج نہیں ہو گئی تھی[۱]، اور حقیقت میرے خیال میں یہ ایک قابل اعتماد تاریخی تعمیم ہے کہ "عدیدی سرپرستی" مشکل سے فنا ہوتی ہے۔ "عدیدی سرپرستی" سے مراد یہ ہے کہ کسی نظم معاشرت میں اس قلیل التعداد جماعت کا اثر ہو جسے دولت کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم و تہذیب اور سیاسی تجربہ و عمل کے روایات بھی ورثہ میں ملے ہوں، اور یہ یقینی ہے کہ یہاں (ایتھنز میں) ایسا ہی ہوا تھا۔ کتاب "دستور ایتھنز" کے مصنف کے بیان کے موافق ایریوپاگس کی مجلس نے بغیر کسی باضابطہ اظہار رائے کے جنگ ایران کے نازک موقع پر اپنے خدمات کے وسیلہ سے دوبارہ اختیار حاصل کر لیا تھا اور سترہ برس (یعنی ۴۶۲ء ق م) تک اس اختیار کو قائم رکھا اور یہ کہ یہ مجلس بزور طور پر عدیدی تھی۔ اس سے واضح ہے کہ ایفیالتیس اور فارقلیس نے اس پر حملے کئے[۲]، اس وقت سے صدی کے اختتام تک کامل عمومیت کی تحریک تیزی سے بڑھتی گئی مگر اس وقت

---

[۱] یہ فقرہ مسٹر وارڈ فاولر کا ہے مگر انھوں نے جو رائے اختیار کی ہے وہ اس سے مختلف ہے ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "یونان و روما کی شہری مملکت"، صفحہ ۱۶۱

[۲] اس مجلس میں ہر سال نو حکام اعلیٰ شامل کئے جاتے تھے۔

ان حکام کے معاملہ میں بھی تدریجی ترقی ہوئی۔ ۵۱۲ء میں مطلق العنان حکمرانوں کے نکالدئے جانے کے بعد چوبیس برس تک ان کا تقرر انتخاب سے ہوتا رہا نہ کہ قرعہ سے، پھر اس کے بعد ایک نامعلوم زمانہ تک کلستھینس کے دسوں قبیلوں میں سے ہر قبیلے کے پہلے سے پسند کردہ لوگوں کی ایک تعداد میں سے بذریعہ قرعہ اندازی ان کا تقرر ہوتا رہا، آخر میں یہ سابقہ پسندیدگی بھی قرعہ کے ذریعہ سے ہونے لگی۔ یہ تغیر کب ہوا اسکا ہمیں علم نہیں ہے مگر یہ ہم جانتے ہیں کہ ۴۵۷ء کے بعد ہی یہ ہوا کہ عہد ارخنی میں دو سب سے بلند صاحب املاک طبقات کے سوا اور کسی کا داخلہ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ کچھ زمانہ بعد ان عہدوں کو غیر قابل معاوضہ بنا کر مقابلہ بند کر دیا گیا تھا۔

تک تکمیل کو نہیں پہنچی جبتک کہ ملکی حکام کے تمام عہدوں کے دروازے کل اہل ملک کیلئے
نہ کھول دئے گئے، اور مجلس شوری اور مجلس ملکی اور نیز عدالتوں کی حاضری کے لئے معاوضہ
نہ ملنے لگا۔ اس آخری نتیجہ کا آغاز فارقلیس کے شاندار زمانہ میں ہوگیا تھا۔ جوری اپنے
معاوضوں کے لئے اسی کی منت کش تھی، مگر مجلس ملکی کی حاضری کا معاوضہ اس کے بعد
کے زمانہ کا ہے۔ خلاصتہً میں مکرر یہ کہتا ہوں کہ پانچویں صدی مسلسل تغیر کا دور تھی اور جنگ
پیلوپونیز کے اختتام پر عدیدیت کے مختصر و بدنام دخل کے بعد (چوتھی صدی کے آغاز تک)
عدیدیت کو استحکام نہیں حاصل ہوا۔

ہم حقیقی طور پر یہ نہیں جانتے کہ ایتھنز کے ادارات کس حدتک نیابتی تھے
مگر ارسطو کے بیان سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ چوتھی صدی کی یونانی عمومیت میں حسب
ذیل خصوصیات وسعت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ اولاً ایک جمعیت ہوتی تھی جس کا
دروازہ ایک خاص عمر کے تمام کامل الحقوق شہریوں کے لئے کھلا ہوا تھا، یہ جمعیت محض
حکمرانوں کا انتخاب اور ان کی نگرانی ہی نہیں کرتی تھی بلکہ فی الواقع خود حکمرانی کرتی تھی۔
ایتھنز میں اسی اعلیٰ حکمران جمعیت کے اندر (جس کا انعقاد شدید ضروریات کے غیر معمولی
اجتماع کے علاوہ، سال میں چالیس مرتبہ باقاعدہ ہوا کرتا تھا) حکومت کے تمام اہم فیصلے ہوا
کرتے تھے جن میں سلطنت کی کل غیر ملکی حکمت عملی کا انتظام و انصرام بھی شامل تھا اور ہر ایک
شہری جسنے حق رائے دہی سے محروم ہونے کا کوئی فعل نہ کیا ہو، اس جمعیت میں تقریر
کرسکتا تھا۔ ہمیں ارسطو کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں یونان میں چھوٹی چھوٹی
سلطنتوں میں عمومیت کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ حکومت کے اعلیٰ کارکن کے طور پر غور
وبحث کی کوئی ایسی جماعت ہو جس میں تمام اہل ملک داخل ہوں، وہیں یہ بھی تھا کہ یہ
جماعتیں واقعی جس حدتک حکمرانی کرتی تھیں ان میں بہت اختلاف تھا، عمومیت کی
نہایت ہی معتدل صورت میں اس جماعت کا فرض یہ تھا کہ وہ حکام کا انتخاب، حسابات
کی تنقیح، مسائل جنگ وصلح ومحالفہ کا تصفیہ کیا کرے اور نظم ونسق کے دوسرے معاملات
کو منتخب شدہ حکام اور مجلس شوری کے اوپر چھوڑ دے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں،
ارسطو کے وقت تک ارتقا کا میلان عمومیت کی انتہائی صورت کی طرف تھا، جسمیں
یہ جمعیت تمام اہم معاملات کے آخری فیصلہ کی بالطبع دعویدار ہوجاتی تھی۔

ایتھنز میں عمومیت کی جو شکل تھی، اس میں حکام اور حکمران مجلس بولے (جو جمعیت کے لئے امور زیر بحث مرتب کرتی تھی) دونوں کے اختیارات بالکل زیر دست ہو گئے تھے، اس لئے ان عہدوں کے لئے اس اصول پر عمل کیا جاتا تھا کہ "ہر شخص کی خوبیاں تقریباً مساوی ہوتی ہیں" اور صورت یہ اختیار کی گئی تھی کہ تمام شہری جو ان عہدوں کیلئے درخواست کریں اور جن پر کوئی داغ بدنامی نہ لگا ہو ان میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ سے انتخاب ہوتا تھا۔ صرف وہ عہدے اس سے مستثنیٰ تھے جن میں صریحاً خاص اوصاف کی ضرورت ہوتی تھی، جیسے فوجی عہدے یا زیادہ اہم مالی عہدے، ان عہدوں کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ استعمال کرنا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔

اس غرض سے کہ غربا واقعی طور پر حکومت کے کاموں میں شرکت کر سکیں ایتھنز میں مجلس شوریٰ کی حاضری کا معاوضہ دیا جاتا تھا، اور آخر میں جمعیت کی حاضری کا بھی معاوضہ دیا جانے لگا اور یہ اس لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ عمومیت کا حقیقتاً موثر ہونا قطعی ہو جائے۔ اگرچہ یہ امر ذہن میں ملحوظ رہنا چاہئے کہ ایتھنز اور دوسری جگہوں کے طبقہ عوام سے پست تر ایک طبقہ غلاموں کا بھی ہوتا تھا؛ در اس لئے ان عامۃ الناس میں ہاتھ سے کام کرنے والوں کا وہ بڑا حصہ شامل نہیں ہوتا تھا جنھیں زمانۂ موجودہ کی عموماً نہ حکومت رکھنے والی سلطنت میں کثرت و غلبہ حاصل ہوتا ہے، پھر بھی ارسطوفانیس کا تو کیا ذکر خود ارسطاطالیس کے شکایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان عامۃ الناس میں ان چھوٹے چھوٹے سوداگروں اور صناعوں وغیرہ کی ایک کثیر جماعت شامل ہوتی تھی جنھیں ان کی غربت کی وجہ سے اتنا وقت نہیں مل سکتا تھا کہ وہ فرائض عامہ کو پر زور طور پر انجام دے سکیں۔ بے معاوضہ کی حاضری میں یہ اندیشہ تھا کہ اس میں بہت کم لوگ حاضر ہونگے اور پھر جمعیت پر دولتمندوں اور ان کے غاشیہ برداروں کا تسلط ہو جائے گا۔

عدالت کا انتظام بھی عمومی تھا، اور انھیں وجوہ سے اس کا بھی معاوضہ دیا جاتا تھا، ایتھنز میں مقدمات کا تصفیہ وسیع و مختلف التعداد عمومی جوری کے ذریعہ سے ہوتا تھا مگر معمولی تعداد، خاصکر اہم مقدمات کے لئے ۵۰۱ کی تھی۔

ایتھنز کی عمومیت جب پوری طرح ترقی کر گئی، اس وقت اس میں ایک دوسری اہم خصوصیت بھی پیدا ہوئی۔ عمومی جمعیت بذات خود قانون سازی کا

کام انجام نہیں دیتی تھی یا یہ کہئے کہ مسلمہ و مسلسل طور پر اپنے احکام سے قانون کو باطل نہیں کرتی تھی اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ عام جوش کے اثر سے عملاً اکثر ایسا واقع ہوجاتا تھا۔ وضع قوانین کا واقعی کام قانون سازی کی ایک کثیر التعداد مجلس کے سپرد کردیا گیا تھا جس کا انتخاب ایک سال کے لئے جوریوں میں سے ہوتا تھا۔ (ان واضعین قانون کی تعداد ایک ہزار اور پانچسو تک سننے میں آتی ہے) یقیناً یہ ماہران فن کی مجلس نہیں ہوتی تھی، تاہم جو جوری حلف اٹھا چکے تھے ان کی اس قسم کی مجلس معمولی جمعیت کے بہ نسبت بدرجہا زیادہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرتی ہوگی[ع۱] اور اس ذی اقتدار جمعیت نے خود کو اپنے فیصلوں میں بے قاعدگی سے محفوظ رکھنے کے لئے اس طرح پر سعی کی کہ اس قسم کے (بیقاعدہ) فیصلے کے مجوز پر فوجداری کا مقدمہ چلانا جائز قرار دیدیا[ع۲] لیکن عملاً یہ تحفظ بہت ہی ناکمل معلوم ہوتا ہے۔ ذی اقتدار عامۃ الناس اکثر خود عائدکردہ قیود کا لحاظ نہیں کرتے تھے، یہ صاف ظاہر ہے کہ ارسطو نے جس انتہائی عمومیت کا ذکر کیا ہے

ع۱۔ چوتھی صدی میں جس نکر کے ساتھ اکلیزیا اور نوموتھے ٹائی کے درمیان وضع قوانین کے کام کی تقسیم کی گئی تھی اس پر غور کیجئے۔

۱۔ ہر سال کی پہلی جمعیت میں مسلمہ مجموعۂ ضوابط کے ایک ایک باب پر رائے لی جاتی تھی اور یہ رائے مباحثہ کے بعد لی جاتی تھی جس میں ہر شہری، قانون میں تغیرات تجویز کرسکتا تھا۔

۲۔ اگر کسی باب پر رائے نفی میں آتی تھی تو وہ نوموتھے ٹائی جو جوری میں سے لئے جاتے، جو نہی معمولی اکلیزیا میں مقرر کئے جاتے تھے۔ اس اثنا میں اساسی قوانین کے بموجب تغیر کے مجوز کو قدیم قانون اور نیا مجوزہ قانون عوام میں پہلو بہ پہلو نمایاں کرنا پڑتا تھا، اور اس کی نقلیں معتمد کو بھی دینا پڑتی تھیں جو انھیں درمیانی جلسوں میں علی الاعلان پڑھ دیتا تھا اور چوتھے جلسہ میں قوم، نوموتھے ٹائی کی تعداد اون کے لئے معینہ وقت اور معاوضہ کا فیصلہ کرتی تھی اور موجودہ قانون کی مدافعت کے لئے پانچ "مؤید" مقرر کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قوم کا یہ فیصلہ "غور سابق" کے بعد ہوتا تھا۔

۳۔ اس کے بعد تغیر کی ہر تجویز پر مجلس شوری کے "غور سابق" کے ساتھ، آخری طور پر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ آیا قانون میں تغیر ہونا چاہئے یا نہیں۔

ع۲۔ مقابلہ کیجئے خطبۂ دوازدہم۔ جلد (۶)

اور جسے کسی قسم کا دستور سلطنت کہنا دشوار ہے بلکہ وہ ایک طرح کی انبوہی خودسری ہے جسمیں ایک حد تک خود اپنے وقت کے ایتھنز کی عموریت کا نقشہ اس کے پیش نظر تھا، لیکن ان قیود کی تفصیلی نوعیت سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ایتھنز میں سیاسی اور اک رکھنے والوں کے نزدیک اس خاص انبوہی مطلق العنانی کے خارج کرنے کی ضرورت پوری طرح مسلم تھی

۴ - ترتیب ارتقا کے بیان کے بعد، اب میں نے مقدونوی غلبے تک، یونانی شہری سلطنتوں کے خاص اشکال حکومت کا مختصر خاکہ تمام کر دیا ہے، اور مختلف مدارج ترقی میں جو اسباب ان کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے اور جو حالات ان کے مفید مطلب تھے، ان پر بھی مختصراً بحث کی ہے، لیکن ہنوز ایک نہایت دلچسپ سوال باقی رہ گیا ہے، جس پر میں نے اس وقت تک صرف ایک صورت خاص یعنی خودسری کے ذیل میں گفتگو کی ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ حکومت کے یہ مختلف طریقے عملاً کس طرح کام میں لائے جاتے تھے زیر حکم قوم کی بہبود کو وہ کس حد تک محفوظ رکھتے تھے؟ بالتخصیص عموریت کے متعلق ہمیں یہ سوال کرنے کی خواہش زیادہ ہے کیونکہ جیساکہ میں کہہ چکا ہوں چوتھی صدی قبل مسیح میں عموریت کی جانب ویسا ہی میلان باقی تھا، جیساکہ اس وقت مغربی یورپین سلطنتوں میں ہے، لیکن قلت معلومات کے باعث اس سوال کا قابل اطمینان جواب دینا سوالات زیر بحث سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

لیکن جن سربرآوردہ اصحاب فکر (اور خاصکر چوتھی صدی کے جن ارباب نظر کی تحریریں ہم تک پہونچی ہیں اور جنھیں پڑھکر سیاسی خیالات و نظریات کی جانچ کرکے ہم اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں) ان میں سب سے زیادہ اہم خیالات افلاطون و ارسطو^{علیہ} کے ہیں، لیکن میں افلاطون کے استاد سقراط کی طرف بھی رجوع

علیہ - عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت جدیدہ کے ارتقا کے سلسلۂ عمل کے پتہ چلانے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یونانی سیاسیات کا اثر مقدماً جدید خیالات و تصورات پر پڑا ہے اور روما جدید واقعات سیاسیہ کا خاص تدریجی منبع و مخزن ہے۔ عالم خیال میں ارسطو کی "سیاسیات" نے خاص دلچسپی پیدا کرلی ہے کیونکہ یہی وہ کتابچہ ہے جس سے جدید خیالات نے سیاسی نوامیس کے علمی تجزیہ و ترتیب کے متعلق پہلی منزل میں پہلا سبق لیا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے مطالعہ کے وقت یہ خیال نہ رکھیں

کرونگا جس کی زندگی کا خاتمہ عین چوتھی صدی کے اوایل میں ہوا تھا نیز افلاطون کے ہم سبق زینوفون (Zenophon) اور مقرر خوش بیان اساکریٹس کے حوالے بھی دونگا جس کی تصنیف سے افلاطون کی تصنیف کی۔ (جسے ارسطو نے بعد کو جاری رکھا) گونہ مخالفت ورقابت ظاہر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اس کے سیاسی خیالات کا اصحاب بالا کے سیاسی خیالات سے مقابلہ کرنا اور بھی زیادہ باعث دلچسپی ہے کیونکہ ایک فصیح البیان مقرر ہونے کے علاوہ اسے سیاسی نقطۂ نظر سے صاحب فکر ہونے کا بھی کچھ حق حاصل ہے

افلاطون وارسطو دونوں نے اشکال حکومت کی تعریف وترتیب پر بہت زیادہ غور کیا ہے افلاطون کے مکالمات (مقالات) ہمارے سامنے ترتیب کی دو مختلف تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ ایک تو ری پبلک (جمہور) میں اور دوسرے بعد کے مکالمہ اسٹیٹسمین (مدبر) میں۔ ارسطو کی ترتیب زیادہ تر اس دوسرے مکالمہ سے ماخوذ ہے، اور میں ارسطو ہی سے آغاز کرونگا کیونکہ باوجود یہ تسلیم کرنے کے کہ وہ افلاطون کا بہت کچھ زیربار احسان تھا اس میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا کہ سیاسی واقعات کے متعلق اس کی وسعت معلومات افلاطون سے بہت بڑھی ہوئی تھی ارسطو نے جو ترتیب اختیار کی ہے وہ ایک شش رخی ترتیب ہے، اسکی بنا تقسیم کے دہرے اصول پر رکھی گئی ہے۔ پس اسے ایسا سمجھنا چاہئے کہ ایک سہ شاخہ کو دو دو برابر حصوں میں تقسیم کردیا ہے، اس نے اسی بدیہی وعروج سہ رخی تفریق کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہ یہ سبق ان مختلف دساتیر کو پیش نظر رکھکر مرتب کیا گیا ہے جنھوں نے یونان کی بڑی سلطنتوں میں واقعاً ترقی حاصل کی تھی اور رابعہً اولاً اس کا اطلاق انھیں دستوروں پر ہوسکتا ہے، تو ضرور ہم اس سے غلط نتیجہ اخذ کرنے لگیں گے۔ لیکن اگر اس امر کو ہم ملحوظ رکھیں اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ سبق عین اس وقت لکھا گیا تھا جبکہ جنگ خیرونیا اور کورنتھ کی کانگریس کے بعد اور اس اثنا میں جب سکندر ایشیا کو فتح کر رہا تھا یونانی شہری سلطنتوں کی حقیقی خود مختاری کا دور ختم ہوچکا تھا اور اس اثنا میں جبکہ سکندر ایشیا کو فتح کر رہا تھا اور پھر اسکے ساتھ ہی ہم اس کی ترتیب وتقسیم کے عام خاکہ ہی پر غور نکریں بلکہ ان مخصوصات واشارات پر بھی غور کریں جو ارسطو نے کثرت ان کے ساتھ شامل کردئے ہیں تو پھر شہری سلطنتوں کے ارتقا اور خاصکر اس ارتقا کے موخر دور کے نسبت تو بالیقین ویسی ہی غالب درجہ کی اہم دوربینی حاصل ہوتی ہے جیسی ایک نہایت ہی عمیق وغائر ذہن کا اقتضا ہونا چاہئے۔

اختیار کیا، جس کا اظہار بادشاہی، عدیدیت، اور عمومیت کے اصطلاحات سے ہوتا تھا مگر اس تفریق کو اس نے اس اصول کے ساتھ ملا دیا جو سقراط سے ماخوذ تھی، وہ اصول یہ ہے کہ صحیح حکمراں وہ ہے جو خود اپنے منافع کو نہیں بلکہ محکوم کے منافع کو ترقی دینے کی فکر میں ہو، یہ اصول بھی ویسا ہی ہے جیسے ان بزرگ کے دیگر مخصوص مسلمات ہیں کہ نظری اعتبار سے تو صداقت بدیہہ معلوم ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے میدان عمل میں آکر ایک طرح کا معما بن جاتے ہیں۔ غرض اس طرح جو تفریق پیدا کی گئی ہے اسے قدیم سہ رخی ترتیب کے ساتھ ملانے سے ہمیں "تین صحیح شائستہ" و ساتیر سلطنت ہاتھ آتے ہیں جن میں فرد یا جماعت، سقراط کے خیال کے مطابق صحیح طور پر حکمرانی کرتی ہے۔ یہ تین اقسام حسب ذیل ہیں۔

(۱) بادشاہی یعنی اعلیٰ ترین قابلیت کے فرد واحد کی حکمرانی (۲) اعیانیت یعنی ان اشخاص کی حکومت جنہیں حکمرانی کے بہترین اوصاف موجود ہوں (۳) وہ طرز حکومت، جسے ارسطو ایک خاص مفہوم میں پالیٹی (دولت عامہ) کہتا ہے، جس میں اعلیٰ اختیار اہل ملک کی جماعت کثیر کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ دولت عامہ کی ترتیب ایسی ہوتی ہے کہ وہ ازدحامی حکومت کے نقائص سے پاک رہتا ہے، انھیں کے متوازی تین "فاسد" صورتیں بھی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) خودسری یعنی ایک شخص کی خودغرضانہ حکمرانی۔ (۲) عدیدیت یعنی دولتمند قلیل التعداد جماعت کی خودغرضانہ حکومت (۳) عمومیت یعنی نسبتاً کثیر التعداد غیر مالکان املاک کی خودغرضانہ حکومت۔ اس تجویز کے حسن تناسب کا صریحی اقتضا یہ ہے کہ عدیدیت کے مانند (جو اعیانیت کی فاسد صورت ہے) اعیانیت میں بھی قلیل التعداد افراد کی حکومت کثیر التعداد افراد پر ہو، اور افلاطون کی رائے یقیناً یہی تھی کہ جو لوگ موزوں طور پر حکمرانی کے اوصاف سے متصف ہوں ان کی حکومت واقعی چند افراد کی حکومت ہوگی، افلاطون و ارسطو دونوں اسی وصف کو اعیانیت کے معنی اصلی سمجھتے تھے۔ افلاطون کہتا ہے کہ "یہ غیر ممکن ہے کہ کسی سلطنت کا گروہ عوام فن سیاست میں مہارت حاصل کر سکے" ہزار آدمیوں کے شہر میں پچاس اچھے شطرنج کھیلنے والے بھی نہ ملینگے! پچاس ماہران سیاست کا کیا ذکر ہے؟[۱] ارسطو نے جہاں اپنی تجویز کو پیش کیا ہے وہاں اعیانیت

[۱] افلاطون سیاسیات ۲۹۲

کے متعلق اسی کو مقبول و مسلم رائے قرار دیا ہے کہ عددیت سے اس کی مشابہت تعدادی تعلقات اور صرف اسی تعدادی تعلقات کی وجہ سے ہے۔[۱]

لیکن یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ دقیق مباحث کے بعد ارسطو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ[۲] عام اہل ملک کی جماعت کثیر کو اگر مناسب تربیت دی جائے تو مجموعۃً وہ چند افراد سے زیادہ دانشمند ہو جائیں گے اور اس لئے اعلیٰ ترین کارہائے شوریٰ و عدالت کے لئے مجموعۃً زیادہ اہل ثابت ہوں گے، البتہ فرداً فرداً وہ عاملانہ حکام کے کام انجام دینے کے لئے موزوں نہوں گے، اس لئے اس نے جہاں اپنی نمونہ کی سلطنت کا نقشہ کھینچا ہے[۳]، وہاں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تمام اہل ملک کو جب وہ ایک مناسب عمر کو پہنچ جائیں حکومت میں حصہ ملنا چاہئے مگر ارسطو کے نمونہ کی دستور سلطنت میں اہل حرفہ، سوداگر بلکہ کاشتکار تک داخل نہیں ہیں کیونکہ دستکارانہ و تاجرانہ زندگی مبتذل اور اعلیٰ اوصاف کے منافی تھی اور زرعی زندگی اگرچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دستکارانہ و تاجرانہ زندگی کی اتنی پست نہیں تھی مگر اس میں اس فرصت کی کمی تھی جو ارسطو کے خیال کے مطابق ہر ایک کامل اہل ملک میں ہونا لازمی تھی۔ لہٰذا اس کے نزدیک اہل ملک سے مراد زمینداروں کا وہ گروہ تھا جو اپنے حصہ کی زمین کی پیداوار پر فرصت و فراغت سے بسر کرتا تھا، اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ زمین کی کاشت غلام یا نیم غلام کرتے ہیں، پس قوم کے مادی ضروریات کے لئے جسقدر انسانوں کی مجموعی تعداد کی ضرورت تھی اس کے مقابلہ میں یہ تعداد پھر بھی منتخب اور قلیل جماعت تھی۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، اگر ہم اس سہ شاخہ تقسیم سے بنی ہوئی شش رخی ترتیب کی طرف پلٹیں تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ارسطو حکومت کی ان چند شکلوں کو باعتبار قابلیت کے کس طرح ترتیب دیتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "اخلاقیات" میں جو پہلا مختصر خاکہ کھینچا ہے اس میں یہ تجویز ایک سادی اور معقول تجویز ہے۔ ہمیں پہلی تین قسم کی سلطنتوں کو حسابی

---

[۱] ۔ اخلاقیات حصہ ۸ باب ۱۰ سیاسیات حصہ سوم باب ہفتم۔

[۲] ۔ سیاسیات سوم باب نہم۔

[۳] ۔ سیاسیات چہارم۔ باب چہاردہم۔

تسلسل کی ترتیب میں رکھتا ہے اور دوسرے سہ شاخہ میں اس ترتیب کو الٹ دینا ہے۔ پس قابلیت کے لحاظ سے یہ زینہ اس طرح تیار ہوگا:-

بادشاہی

اعیانیت

دستوری حکومت یا دستوری عمومیت

ساوی یا غیر متوازن عمومیت

عدیدیت

خودسری یا ناجائز مطلق العنانی

اگر ایک شخص ایسے اعلیٰ اوصاف کا مل سکے جو تنہا حکمرانی کے سزاوار ہو تو یہ اس عقدے کا سادہ ترین و بہترین حل ہوگا۔ جہاں اس قسم کا کوئی عدیم المثال فرد واحد نہو وہاں حکومت کے فرائض ان لوگوں کے تفویض ہونا چاہئیں جو ان فرائض کی انجام دہی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوں مگر ارسطو نے بعد کے خیالات میں اس ترتیب میں ترمیم کر دی۔ کتاب "سیاسیات" تک پہونچکر اسے بادشاہی اعیانیت سے زیادہ بہتر نہیں معلوم ہوتی اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اعیانیت کے متعلق اس کی رائے افلاطون کی رائے سے مختلف ہوگئی تاہم (اس کے نزدیک) تمام حکومتوں میں خود غرضانہ مطلق العنانی بدترین حکومت ہے اور خود غرضانہ عدیدیت خود غرضانہ عمومیت سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

اس ترتیب کی ہیئت ظاہری تک سے یہ تکلیف وہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ در پردہ مصنف کا مقصود یہ ہے کہ یونان کی شہری سلطنتوں میں جو حکومتیں واقعتاً قائم تھیں وہ سب کی سب مردود قرار پا جائیں کیونکہ ان سے فاسد اشکال کے ظاہر کرنے کے لئے وہی اصطلاحات منتخب کئے ہیں جو مورخ معمولاً واقعی حکومتوں کی ترتیب دہی ہیں کام میں لاتے ہیں[1] اور اس مزید تشریحات نے اس شک کو یقینی بنا دیا ہے کہ ارسطو نے عدیدیت

---

[1] یونان میں عام خیال کے مطابق جو امتیازات مسلم تھے ارسطو کی ترتیب و تقسیم میں زیادہ تر انھیں کو ایک قاعدہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ایران میں جس سازش کا انجام دار یوش ڈپرس ہسٹسپس کی تخت نشینی پر ہوا اس کے دوران میں ساتوں سازشیوں کے درمیان ہروڈوٹس (کتاب سوم ۸۰ و ۸۲) کے دعوی کے بموجب

وعمومیت کی جو تعریفیں ان الفاظ کے خراب مفہوم میں کی ہیں وہ صرف مجرد ظاہری تعریفیں
نہیں ہیں بلکہ ان سے مقصود مروجہ واقعات سیاسیہ کی تعریف ہے۔ یہ اس سے واضح
ہے کہ اس نے کس فکر کے ساتھ اس امر کی تشریح کی ہے کہ عدیدیت وعمومیت میں اصلی
فرق محض تعداد کا فرق نہیں ہے (جیساکہ عدیدیت کے اشتقاق سے ظاہر ہوتا ہے) بلکہ
اس میں زیادہ تر غربا اور امرا کے درمیان امتیاز مدنظر ہے۔ وہ ہر ایک کی مختلف قسموں
کا بیان کرتا ہے جن میں سے بعض بدتر اور بعض بہتر ہیں، وہ یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے
کہ کوئی حکومت ظاہری شکل کے اعتبار سے عمومی ہو مگر فی الاصل عدیدی ہو، لیکن وہ صاف
طور پر اس رائے پر قائم ہے کہ موخر دور میں یونان کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے
اکثر و بیشتر یہی واضح ہوتا ہے کہ بہت سے نظمہائے معاشرت معدودے چند امرا اور کثیر التعداد
غربا دو فرقوں میں منقسم تھے جو اپنے خودغرضانہ مقاصد کے واسطے غلبہ و اقتدار کیلئے کشاکش
برپا کئے ہوئے تھے، اور اس کا معمولی نتیجہ یہی تھا کہ ایک فریق کی کامیابی اور دوسرے
فریق پر ظلم و ستم لازم و ملزوم تھے۔

۵۔ کامل ترقی یافتہ عمومیت کے متعلق یہ درشت کلامی صرف ارسطو ہی کا شیوہ
اور خیال نہیں ہے بلکہ یہ خیال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہم تو تقریباً بلا استثنا یہ کہہ سکتے ہیں کہ
ہم تک جو خیال پہنچا ہے وہ صرف یہی خیال ہے بشرطیکہ ہم مقرروں کی تقریروں کو بحث
سے خارج کردیں کیونکہ ان کا کام عوام کو دام ترغیب میں لانا تھا، اور اس لئے ان کے لئے
دشوار تھا کہ وہ ان سے صاف صاف یہ کہدیتے کہ وہ ناقابل دآزادہ ہیں، عمومیت کے ساتھ
افلاطون کا عناد، ارسطو کے عناد سے بھی بڑھا ہوا تھا، زینوفون نے اسپارٹا کی جو بے حجابانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عجیب وغریب مکالمہ و مباحثہ ہوا، اس میں واحد، متعدد اور کثیر التعداد اشخاص کی
حکومتوں کا مقابلہ کیا گیا تھا اور صحیح بادشاہ اور مطلق العنان کے درمیان اور علی ہذا القیاس بہترین اشخاص کی حکومت اور
چند دولتمندوں کی حکومت کے درمیان جو وسیع فرق ہے وہ عام زبان میں کم و بیش تسلیم کیا گیا تھا، پس شش گانہ باقاعدہ ترتیب کیلئے
صرف اس امر پر زور دینا باقی تھا کہ کثیر التعداد اشخاص کی آئینی پابند حکمرانی جو اعتدال و انصاف کے حدود کے اندر رہتی ہو) اور
عمومیت کی زیادہ انتہائی قسم (جس میں عوام الناس باقاعدہ طور پر دولتمندوں کو ستاتے ہوں) ان دونوں
کے درمیان بھی مذکورہ بالا نوع کا فرق موجود تھا۔

جانبداری کی ہے، اس کی وجہ سے گروٹ نے اس پر سخت نفرین کی ہے۔ لیکن یہ حجت پیش ہو سکتی ہے کہ یہ سب کے سب اپنے خیالات میں ایک ہی طریقے کے پیرو تھے، یہ سب سقراط کے اثر میں شریک تھے، مگر اساکریٹس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس نے بھی اپنے سیاسی رسائل میں (جو کم و بیش اسی صدی کے وسط میں سیاسی تقریروں کی شکل میں شائع ہوئے تھے) بے اصول سرگروہان عوام کی رہبری میں بے لگام عمومیت کی نااہلیت آزادی کے متعلق کچھ کم جوش و خروش کے ساتھ گفتگو نہیں کی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ "نہ صرف ہمارے قومی نام کو نظروں سے گراتے ہیں، بلکہ وہ مقدمات چلانے، الزام لگانے اور تباہ کاری کی ہر ایک تدبیر سے کام لیکر خود کو دولتمند بناتے ہیں اور ہمیں تکلیف وہ مفلولوں سے پیس ڈالتے ہیں، اور ان کی نااہلیت ان کی اس غارتگری سے کم نہیں ہے، ان کے زیر اثر ہم خود اپنے دل کا حال ایک دن کے لئے بھی نہیں جانتے اور اگرچہ انفرادی رشوت کی سزا موت ہے مگر نہایت ہی ناقابل لوگ جمعیت عمومی کو بڑی بڑی رشوتیں دے کر ہمارے سپہ سالار بن جاتے ہیں[1]۔

اس میں شک نہیں کہ ان جملہ امور کا تعلق اولاً و اقدماً ایتھنز سے ہے، مگر اس امر پر اتفاق عام تھا کہ یونانی عمومیت کی سب سے زیادہ درخشاں مثال ایتھنز ہی کی عمومیت تھی، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس میں تو شک نہیں ہے کہ ایک نمونہ تھا جسکی تقلید عمومیت کے اس عام میلان میں بہت وسعت کے ساتھ کی جاتی تھی، اور اساکریٹس نے صریحاً یہ کہدیا ہے کہ اس نے عمومیت پر جو لعنت بھیجی ہے وہ صرف ایتھنز تک محدود نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ "ہم اس وجہ سے مامون ہیں کہ ہمارے مدمقابل سلطنتوں کی حکمرانی بھی ہم سے کم ناقص نہیں ہے، ہم گویا اہل تھیبز کو بچاتے ہیں اور وہ ہمیں بچاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک دوسرے کی جمعیت عمومی کے ارکان کو معاوضہ دینا خالی از نفع نہ ہوگا[2]۔ آرگوس وہ دوسری سلطنت ہے جسے عہد قدیم سے امتیاز حاصل تھا، اور اب وہ مدت دراز سے عمومی ہو گئی تھی، اس کے نسبت اساکریٹس ایک اور جگہ کہتا ہے کہ ارگاس والوں کو

---

[1] ۔ ایسفرائیس (تقریر ہشتم متعلق امن و امان)۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایک تقریر کے مختلف مضمون کا لب لباب ہے
[2] ۔ اساکریٹس (تقریر ہشتم "متعلق امن و امان")

جنگ سے جب ذرا سانس لینے کا موقع ملجاتا ہے تو اپنے سے زیادہ با مود شہریوں کو قتل کرنے کے کام میں لگ جاتے ہیں[۱]۔

میرا خیال ہے کہ ہم اس امر کو ایک ناقابل انکار حقیقت کی طرح سے قبول کر سکتے ہیں کہ چوتھی صدی میں یونان میں جس عمومیت کی خوبیوں کا صور پھونکا جارہا تھا اسے اصحاب خرد کا وہ طبقہ جسکے ملفوظات ہم تک پہونچے ہیں، عام طور پر ناپسند کرتا اور مردود قرار دیتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی جہاں ہمارے ان تمام مصنفین کا اس پر اتفاق ہے کہ بے لگام عمومیت ایک خراب شئے ہے وہیں وہ سب کے سب اس امر پر بھی متفق ہیں کہ خود غرضانہ عدیدیت یعنی خاص اپنے مفاد کے لئے قلیل التعداد دولتمند اشخاص کی حکومت اور بھی بدتر ہے' اس قول میں اساکریٹس' ارسطو سے پیچھے نہیں ہے کہ "ایک ناقص عمومیت بلائے بد ہونے میں عدیدیت سے کم ہے" ہماری ذلیل و رشوتخوار عمومیت بھی "تیس[۲] خودسروں" کی حکومت کے مقابلہ میں آسمانی حکومت معلوم ہوگی اور اگر ہم یونان کے خاص خاص شہروں میں گھوم کر دیکھیں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ ان شہروں نے عدیدیت کے تحت میں اس سے کم ترقی کی ہے جتنی ترقی انھوں نے عمومیت کے دور ان میں کی ہے[۲]۔ یہ صحیح ہے کہ افلاطون نے اپنی کتاب "جمہور" میں عمومیت کو عدیدیت سے بدتر قرار دیا ہے وہ تنزل کی جانب میلان طبعی کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے جسکے بموجب اسپارٹا کا ایسا دستور سیاسی (جسے وہ اپنی نموذجی سلطنت سے دوسرے درجہ پر رکھتا ہے)، حصول زر کے مفر اثر کی وجہ سے عدیدیت کی جانب تنزل کرنے پر مائل ہوتا ہے' بعدازاں عدیدیت، عمومیت کی جانب تنزل کر جاتی ہے اور پھر عمومیت خودسری کے درجہ تک پست ہو جاتی ہے' یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ یوروپین تاریخ' سیاسی ارتقا کا جو پہلا نظریہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ تنزل کا نظریہ ہے' اور اس میں شک نہیں کہ یونان کی تاریخ سے ایسی بکثرت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اس رفتار تنزل کے ہر ایک قدم کا ثبوت مل سکے' لیکن اشکال حکومت کے سلسلہ کی عام ترتیب اس تاریخ کے عام

---

[۱] اساکریٹس (تقریر پنجم) "بابت فیلقوس"۔

[۲] اساکریٹس (تقریر ہفتم) ایریو پاگس

واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی جس میں وہ زمانہ "جود ور خود سری" کے نام سے مشہور رہے خصوصیت کے ساتھ کامل ترقی یافتہ عمومیت سے قبل واقع ہوا ہے، بہر نوع افلاطون نے "مدبر" (Stateman) کے لکھتے وقت ناقابلیت کی اس ترتیب کو نظر انداز کر دیا ہے، یہاں اس نے ناقابلیت کی وہی ترتیب رکھی ہے جو ارسطو نے دی ہے یعنے "عمومیت، عدیدیت اور خود سری"

۶ - افلاطون نے اپنی تجویز مابعد میں عمومیت و عدیدیت کے مابین اس حیثیت باہمی کے قائم کرنے کے متعلق جو توجیہ پیش کی ہے وہ قابل لحاظ ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ کثیر اشخاص کی حکومت فی الاصل ایک کمزور حکومت ہوتی ہے، یہ حکومت کی ایک ایسی صورت ہے جس میں قوم کے اوپر نسبتاً بہت کم حکمرانی ہوتی ہے۔ ایک دانشمند و مضبوط حکومت کے مقابلہ میں عمومیت کی یہ بیکارہ خصوصیت افلاطون کی نظر میں ایک نقص معلوم ہوتی ہے لیکن عدیدیوں کی خود غرضانہ تہدید کے مقابلہ میں یہ ایک خوبی ہے۔

اپنے تمام گواہوں کی شہادت سے ہم عمومیت میں بہ حیثیت مجموعی تیقن کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ اسکے سخت ترین مفہوم میں انفرادی آزادی نمایاں طور پر حال تھی، انفرادی آزادی سے مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہو کہ خطرناک بدنظمی پیدا کئے بغیر وہ جو چاہے کرے۔ "کثرت کا ظلم" جو ٹوک ویل و مل کو یورپ کی آنے والی عمومیت میں ایک نہایت ہی شدید خطرہ معلوم ہوتا تھا، وہ ایتھنز کے عامۃ الناس کی نمایاں خصلت کی حیثیت سے یقیناً کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا، اس کے برخلاف ڈیموس تھنیس ہم سے یہ کہتا ہے کہ "عمومیت تشدد کے عام فقدان کی جانب رہبری کرتی ہے" یوریپیدیس تقریر کی عام آزادی کو اس سے منسوب کرتا ہے اور طوسی ویدش کا ممدوح فارقلیس کہتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے راستہ پر چلتا ہے اور دوسروں پر ان کے جداجدا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے غراتا نہیں ہے" افلاطون کہتا ہے کہ "یہاں کتے بھی دوسری جگہوں کی بہ نسبت زیادہ گستاخ ہوتے ہیں، اور خران بے تمیز کامل الحقوق شہریوں کی شان سے چلتے ہیں" فرضی زنیوفون (جس نے ایتھنز کے نظام سلطنت کی ہجو تصنیف کی ہے) کہتا ہے کہ کوئی غلام جو سڑک پر آپ کے راستہ سے ہٹ نہ جائے آپ اسے بھی مارنے

کے مجاز نہیں ہیں۔"

کم از کم یہ تو ایک ایسا الزام ہے کہ ہم اس جدید زمانہ کے لوگ خواہ ہمارے سیاسی عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں عامۃ الناس کے خلاف نہ پیش کریں گے۔ ہم جب یونانی و اطالوی متمدن دنیا کے سیاسی و معاشری انتظام کی عام خوش حالی کے اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو غلامی کا یہ واقعۂ عظیم غمگین پلہ میں ایک بھاری وزن ہو جاتا ہے، اور اس خیال سے گونہ تسلی ہوتی ہے کہ عمومیت نے اس وزن کو کس قدر ہلکا کر دیا تھا۔

مگر یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ دولتمندوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا تھا وہ ہر طرف سہولت و آسانی پیدا کر کے اس عام میلان میں ایک استثنا نہیں تھا؟ کیا عامۃ الناس اپنی سیاسی حیثیت سے ان پر غیر مساوی محصول لگا کر انھیں پریشان نہیں کرتے تھے اور پھر اپنی عدالتی حیثیت سے ان پر مذموم و نامنصفانہ مقدمات قائم کر کے جنکی سماعت بھی وہ خود ہی کرتے تھے انھیں لوٹتے نہ تھے، یہ بالکل ٹھیک ہے، اور چونکہ ہمارے اسناد اس پر متفق ہیں اس لئے اس میں شک کرنا مشکل ہے کہ ایک حد تک ان دونوں قسموں کی آزار رسانی جاری تھی، دوسری جانب سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اتنا ہے کہ اس کی کوئی علامت نہیں ہے کہ یہ کارروائی اس حد تک جاری رہی ہو کہ دولتمند اس سے ڈر کر ایتھنز سے راہ فرار اختیار کر رہے ہوں اور اس سے ایتھنز کی صنعتی و تجارتی خوش حالی پر اثر پڑتا ہو۔

عوام کی بڑی بڑی عدالتوں کے متعلق یہ یقینی ہے کہ چوتھی صدی کی عدالتی تقریریں جو ہم تک پہنچی ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے انصاف کے عملدرآمد کے متعلق ان عدالتوں کی قوت عمل کی طرف سے پست خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ فریق مخالف کی نسبت وہ کثیر غلط بیانی اور غیر متعلق الزامات ہیں جو وکلا اپنی تقریروں میں بیان کیا کرتے تھے۔ نیز بغیر کسی قید کے وکلا کا اس امر کا مجاز ہونا بھی اس کا باعث تھا کہ وہ اپنے حسب مطلب ججوں کے خیالات سے بھی جج پر اثر ڈال سکیں ان سے کام لیں، تاہم ان عدالتوں کے وسیلہ سے جو باقاعدہ و غیر منصفانہ ضبطی ہوتی تھی اس کی وسعت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا نہایت دشوار ہے۔ ارسٹوفینس جب مخبر کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے کہ وہ ہر طرف قصوروار، نادہند، لحیم، شحیم، شیریں مقال، تنومند، دولتمند اشخاص کو چنتا پھرتا ہے

تو اس کا مقصود یہی ہے کہ وہ قاصرونا دہندہ تھے[1] اور جب ہمیں لیسیاس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض وکلا دوران مقدمات میں جوریوں سے یہاں تک کہتے تھے کہ اگر وہ ملزم کو رہا کردینگے تو خزانہ میں اتنا سرمایہ نہ رہے گا کہ انھیں تین روبول یومیہ کے حساب سے معاوضہ دیا جاسکے، تو ہمیں یقیناً یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی مجرم مدعیٰ علیہ پر رحم نکرنے کی درخواست تھی، نہ کہ کسی بیقصور شخص کے لوٹنے کی علانیہ تائید و تحریک، تاہم ایسا ہونا ہی فی نفسہ برا تھا۔ علی ہذا اگرچہ اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ عامۃ الناس کے تحت میں عہدہ دار کبھی کبھی رشوت ستانی وجابرانہ کارروائیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ پھر بھی اس امر میں شک کرنا بالکل قرین عقل ہے کہ یہ کسی نہج سے بھی عمومیت کی ممیز و مخصوص صورت تھی۔

محصول کے معاملہ میں زائد از ضرورت بار ڈالنے کے متعلق، یہ خیال رکھنا چاہئے کہ دولتمندوں پر مزید بار ڈالنے کا طریقہ قدیم سے چلا آرہا تھا، اور اس کی کوئی علامت نہیں ہے کہ انتہائی عمومیت نے اسے بدتر بنا دیا ہو اگر ہم یہ سنتے ہیں کہ قوم رقص و سرود اور مشعلوں کی دوڑمیں تباہ ہورہی تھی، تو یہ خیال کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ یہ بالعموم اس وجہ سے ہوتا تھا کہ شان و نمائش کے شوق میں وہ اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتے تھے جتنے خرچ کے لئے وہ قانوناً مجبور تھے۔ ہم ایک شخص کی نسبت یہ سنتے ہیں کہ اُس نے اپنے گانے والوں کو سونے کے گوٹے سے آراستہ کیا اور اس کے بعد خود پہ ہا جھنڈے لگائے پھرنے لگا۔ لیکن گوٹے پٹھے کی یہ فضول خرچی اس نے خود اپنے شوق سے کی تھی۔ عوام نے اسے اس کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔

جنگ کے مصارف کا بار زیادہ سخت تھا اور اس میں زیادہ تکلیف محسوس ہوتی تھی، مگر کسی نکتہ چین نے اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ عامۃ الناس جنگ کرنے کے اس وجہ سے شائق تھے کہ خود انھیں اس کے مصارف ادا نہیں کرنا پڑتے تھے، کم از کم چوتھی صدی میں جبکہ عمومی میلانات نہایت ہی کامل طور پر ترقی کر گئے تھے، یہ حال نہ تھا بلکہ الزام تو یہ ہے کہ فیلقوس شاہ مقدونیہ کی موزوں مقاومت کے لئے جس قدر اخراجات کی ضرورت تھی عامۃ الناس اس کے لئے پوری مستعدی کے ساتھ کمربستہ نہیں ہوتے تھے

[1] ارسٹوفینیس! "مبارزہ" ۲۵۹

لیکن جہاں میں ایتھنز کی عمومیت کی مشروط حمایت کرتا ہوں وہیں میں اس حمایت کو عام طور پر یونان کی عمومی سلطنتوں کی طرف وسعت دینے میں پس وپیش رکھتا ہوں۔ ارسطو کے اس بیان کی صداقت میں شک کرنا خالی از جسارت نہیں ہے کہ عمومیتوں کے اندر انقلابات "اکثر سران انبوہ کی غیر معتدل روش کی وجہ سے واقع ہوتے تھے جو ذی املاک طبقہ کے امرا پر مفسدانہ مقدمات قائم کرکے یا عوام کو بہ حیثیت جماعت کے ان کے خلاف بھڑکا کر ان کو متحد ہونے پر مجبور کر دیتے تھے"۔ اس نے ایک عجیب وغریب مثال جزیرۂ رہوڈز کی بیان کی ہے، جہاں ان دولتمندوں کو جنکے ذمہ جہاز سازی تھی، ان کو عوام الناس کے ان سران انبوہ نے دوسرے شہریوں سے واجبی چندہ لینے سے روک دیا تھا، اور اسلئے جب ان کے قرضخواہوں نے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی دہمکی دی تو اس خوف کی وجہ سے مجبور ہو کر انھوں نے ایک سازش کی اور عمومیت کا تختہ الٹ دیا۔ اسی طرح وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ میگار ا میں "ان سران انبوہ نے ضبطی جائداد کا موقع حاصل کرنے کی غرض سے، امرا کی بہت بڑی تعداد کو سلطنت سے خارج کر دیا یہاں تک کہ جلاوطنوں کی تعداد اس حد کو پہنچ گئی کہ انھوں نے وطن واپس آکر اہل عمومیت کے مقابلہ میں صفآرائی کی اور میدان کارزار میں انھیں مغلوب کرکے عددیت قائم کر دی"[1]۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس سے بالیقین یہ معلوم ہوتا ہے کہ میگارا میں دولتمندوں پر ظلم وستم نہایت ہی شدید اور بہت ہی عام تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارسطو ایک مخالف گواہ ہے مگر اس کے دل ودماغ پر ہمیشہ حقیقی علمی جستجو کا غلبہ رہتا تھا (اور اس لئے اس پر تخلیط کا گمان نکرنا چاہیئے) اور میگارا کے عمومی فریقوں کی زیادتی کے نسبت ہمیں پلوٹارک سے بھی ایک طرح کی تصدیق حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ میگارا میں، بادشاہی، عددیت اور خودسری کے معمولی دوروں کے بعد چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف اول میں ہنگامہ خیز عمومیت کا ایک اور واقعہ ہوا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غربا امیروں کے گھروں میں بزور گھس جاتے اور بلالحاظ قیمت ناشتے اور کھانے کے لئے احکام جاری کرتے تھے اور باضابطہ ایک حکم یہ بھی نافذ کر دیا تھا کہ قرضوں پر جو کچھ سود ادا ہو چکا ہے وہ واپس کیا

[1] سیاسیات حصہ ہشتم (یہ پنجم) باب پنجم۔

جائے ؛ (جیسا کہ گروٹ نے اشارہ کیا ہے) اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ دوریانیوں کی فتح کے بعد سے نسل کا جو اختلاف باقی رہگیا تھا وہی گروہ عام کی اس ظلم و زیادتی کو اور شدید بنانے کا باعث ہوا اس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ پے درپے دو مرتبہ عدیدیت قائم ہوگئی مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔

ارگوس کی عمومیت کی پراشتداد نوعیت کی توضیح بھی اسی طرح پر ہو سکتی ہے اس کا حال ہمیں خاصکر بدنام کن شکوتالسموس یا "عدالت دیوس" کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جسکے حکم سے سنہ ۳۷۰ ق م میں اعلی طبقہ کے بارہ سو افراد جن پر عدیدانہ انقلاب کا منصوبہ قائم کرنے کا الزام تھا ہلاک کئے گئے اس قسم کے افعال کا منفرد نہ ہونا اس طرز بیان سے مستنبط ہو سکتا ہے جو ایسقراطیس نے (سنہ ۳۴۶ ق م میں) ارگاس کے اختلافات کے ذکر میں اظہار کیا ہے (اور یہ جملہ اوپر درج ہو چکا ہے) بااینہمہ پانچویں صدی کے وسط سے قبل کو ارگوس میں عمومیت کا سلسلہ تقریباً غیر منقطع رہا، غالباً اسپارٹا کی رقابت ایک حد تک اس کا سبب تھی جو عدیدی اسپارٹا کے ساتھ متحد ہوتے لوگ حب وطن کی وجہ سے ان کے خلاف ہو جاتے۔ عام الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پراشتداد عمومیت کی وجہ سے اضطرابی حالت پیدا ہو جاتی تھی جس سے مملکت دفعۃً عدیدیت یا خودسری کی صورت میں بدل جاتی تھی مگر ان کی زندگی بہت کم ہوتی تھی۔ اگر ہم ایتھنز کے تیس خودسروں کی مختصر تاریخ سے عام نتیجہ اخذ کریں تو یہ کہنا پڑے گا کہ غالباً اس قسم کی عدیدیت کو بدترین عمومیت کے بدترین افعال کی ہمسری سے ننگ نہیں تھا۔

دولتمندوں سے استحصال زر کی ایک شکل "زمین کی تقسیم جدید" بھی تھی[۱] اور اس میں اس وجہ سے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے کہ یہ طریقہ خود ہمارے زمانے کے بعض انقلابی مقاصد سے مشابہت رکھتا ہے۔ اساکریٹس مقرر نے "شہروں کی معمولی مصیبتوں کا جہاں ذکر کیا ہے (اور اسپارٹا کے ایک طرفدار نے یہ دعوی کیا ہے کہ صرف اسپارٹا ان آلام سے پاک ہے) وہاں اس نے ان معمولی مصائب و نوائب "یعنی قرضوں کی تنسیخ (جو ایتھنز میں سولن کا ایک جلیل القدر کارنامہ شمار ہوتا تھا) اور زمین کی تقسیم جدید[۲]

عـ۱ ۔ اس باب کا فقرہ (۵) دیکھا جائے۔

عـ۲ ۔ اساکریٹس تقریر عـ۱۲ ۔

کا بھی ذکر کیا ہے؛ ارسطو نے بھی اس کا مذکور اس طرح پر کیا ہے کہ یہ سران انبوہ کے
ظلم و ستم کا مسلمہ طریقہ تھا؛ مگر اس نے کوئی مثال نہیں دی ہے، اور دور شہنشاہی کے ایک
فصیح البیان یونانی مقرر دیون کری سوستوم نے یہ کہا ہے کہ ہمیں مطلقاً اس کا علم نہیں ہے کہ
اس قسم کا کوئی فعل سرزد ہوا ہو؛ میں نے بھی اس امر کی بیکار کوشش کی ہے کہ سولن کے
تنسیخ قرض کی طرح زمین کی تقسیم جدید کی بھی کوئی ایسی مثال ملجائے جو عمومی کارروائی کی حیثیت
سے باامن و منظم قانونی طور پر عمل میں آئی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خانہ جنگی کے دوران
میں جبکہ کوئی فریق بزور خارج کر دیا جائے، اس وقت اس قسم کے امور کا واقع ہونا بعید
نہیں تھا۔ تاہم اس میں بھی بمشکل شک ہو سکتا ہے کہ عمومی ظلم و ستم کی اس چیرہ دستی
کی اور مثالیں بھی ہوں گی اگرچہ یہ باتیں اس سے بکثرت زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ جیسا
واقعی عمل میں آتی ہیں۔

یونانی عمومیت کے متعلق ایک اہم اعتراض کو جس کی بنیاد اتھنز کی تاریخ
پر ہے۔ میں نے آخر تک محسوس کیا ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جس طولانی کشمکش کا
خاتمہ بالعموم تمام یونان پر مقدونیہ کی فوقیت کے قبول کر لئے جانے پر ہوا، اس سے
غیر ملکی حکمت عملی کے متعلق عمومیت کی مہلک کم بینی و عدم استقامت کا اظہار ہوتا ہے
اور یہ کہ اہل اتھنز میں حکومت کی کوئی اور شکل ہوتی تو ممکن تھا کہ اہل اتھنز کامیابی
کے ساتھ فلپ کا مقابلہ کر سکتے۔ میں یہ نہیں خیال کرتا کہ اس امر سے انکار کیا جا سکتا ہے
کہ اس الزام کی بہت بڑی وجہ موجود ہے؛ لیکن اگر ہم اتھنز کی عمومیت کا مقابلہ
ان دوسرے اشکال حکومت سے کریں جو یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری قوموں میں،
واقعاً انھیں عام حالات کے تحت میں پائی جاتی ہیں جن حالات کے تحت میں اتھنز
کی عمومیت قائم تھی تو عمومیت کے حامی بہت خوبی کے ساتھ اس کے جواب میں
یہ سوال کر سکتے ہیں، کہ یونان کے دوسرے شہروں نے اس شکل سے عہدہ برآ
ہونے میں کیا مزید قابلیت دکھائی۔ عدیدیت کا نہایت ہی سرگرم مداح بھی اسپارٹا

عہ۱۔ "سیاسیات" ہشتم ۵ پنجم ۱؛ پنجم
عہ۲۔ تقریر ۳۱ صہ ۳۳۲۔

کے لئے مشکل اس کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔

بہ حیثیت مجموعی میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ فیلقوس کے مقابلہ میں اولاً واقدً ثانیہ محض عمومیت کا امتحان نہیں تھا کہ وہ اس میں کمزور ثابت ہوئی بلکہ یہ یونان کی شہری سلطنتوں کے زائد از ضرورت خودکامانہ جذبے اور ان کی بیحد محدود حب وطن کا امتحان تھا' جس میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ عام یونانیت کے حقیقی و موثر جذبے سے برانگیختہ ہو جائے اور ایک مساوی اور مستحکم متفقیت قائم کرلے' بعد کے زمانہ میں جبکہ متفقیت کے اصول نے اکائیا کے گمنام وغیر نمائشی معاقدے کے مختصر آغاز سے ترقی کرکے نمود و سربلندی حاصل کی اور ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اس حالت میں بھی ایتھنز علیحدہ تھا اور اسپارٹا اپنے بلند درجہ سے گر چکا تھا اور متفقیت کیا کچھ کرسکتی تھی' تو پھر ہم ارسطو کے ساتھ کم وبیش اتفاق کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ یونانی قوم اگر صرف اتنا کرتی کہ ایک حکومت کے تحت میں متحد ہو جاتی تو وہ اپنے خوش نصیبانہ امتزاج اور متوازن صفات کی وجہ سے ساری دنیا کو فتح کرلیتی ۔

خطبۂ ہشتم

ارسطو و افلاطون کی مثالی سلطنتیں

۱- اپنے آخری خطبہ میں، چوتھی صدی کے ایتھنز کے دستور سلطنت کا مختصر بیان دینے کے بعد میں یونانی عمومیت کے عملی کام کے متعلق اس متفقہ ناموافق رائے کا ذکر کر رہا تھا جس پر افلاطون، ارسطو، اساکریٹس، اور زینوفون سب یک زبان ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے، دوسری جانب سے کسی بے لوث شخص نے کوئی ایسا کلام نہیں کیا ہے جس کی کچھ اہمیت ہو کیونکہ (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) عامۃ الناس کی مدح و ستائش میں مقرروں کے بیانات شہادت میں اس وجہ سے قبول نہیں کئے جا سکتے کہ ان لوگوں کا تو کام ہی یہی تھا کہ عوام کو راضی رکھیں۔

لیکن یہ حجت نکالی گئی ہے کہ افلاطون اساکریٹس اور ارسطو صرف اس زمانہ کے ایتھنز کو جانتے تھے جب اس کا بہترین دور گزر گیا تھا اور جب عہد زریں کی ذہین و پرجوش آبادی جنگ وبا پیلو پونیشیا کے باعث تھوڑی رہ گئی تھی[۱] اور چونکہ ایتھنز والے قلیل تعداد میں رہ گئے تھے اور اس تقلیل سے ان کے دل پست ہو گئے تھے، اس لئے انہوں نے بالطبع حکومت کا کام کتوں کے حوالہ کر دیا تھا، میرے خیال میں اس تشریح سے کام

---

[۱] - وارڈ فاؤلر، "یونانیوں اور رومانیوں کی شہری سلطنت"، صفحہ ۱۵۲۔

نکلنا دشوار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایٹکا کی آبادی گھٹ گئی تھی، چوتھی صدی کے اختتام پر ہم ۲۱۰۰۰ بالغ شہریوں کا ذکر سنتے ہیں حالانکہ پانچویں صدی کے اواخر میں یہ تعداد ۳۰۰۰۰ سے اوپر تھی، لیکن یہ گھٹی ہوئی تعداد عمومیت کے ادارات کے چلانے کے لئے یقیناً کافی تھی^۱ اور جنگ پیلو پونیز کی ناقص کامیابی اور اس کے نتیجہ میں بحری شہنشاہی کے ضائع ہوجانے سے اہل ایتھنز کا دل ہمیشہ کے لئے پست نہیں ہوگیا تھا، پست ہونا تو کجا چوتھی صدی کی یونانی تاریخ کے پڑھنے والے اس امر سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اس صدمہ سے بحال ہو جانے اور دوسری شہنشاہی کے قائم کر لینے میں اہل ایتھنز نے کس قدر باطنی قابلیت کا اظہار کیا، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ دوسری شہنشاہی پہلی شہنشاہی سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتی تھی۔

اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چوتھی صدی مسلمہ و کامل ترقی یافتہ عمومیت کا دور اور پانچویں صدی منازل ارتقا کے طے کرنے کا زمانہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فارقلیس کے عہد جلیل میں شاندار خوشی کا ایک زمانہ گزرا تھا مگر قدیم اسناد کے مطابق اگرچہ اس زمانہ میں انتہائی عمومیت کی جانب ماہرانہ قدم بڑھ رہے تھے مگر ہنوز وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ عمومی ادارات کا پورا پورا اثر نمایاں ہو جاتا۔ پس کیوں اس زمانہ کی خوشحالی کامل ترقی یافتہ طرز عمومیت کا اثر نہیں سمجھی جاتی۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے اور دوسری وجہ اس امر کی کہ کیوں پانچویں صدی کے شاندار دور میں ایتھنز کا دستور سلطنت اپنے طرز کا نمونہ نہیں قرار دیا جاتا خود اسی واقعے میں مضمر ہے کہ اس زمانہ میں ایتھنز نمایاں و مقدم طور پر ایک شہنشاہی شہر تھا اس کی قومی آمدنی کا ماخذ زیادہ تر دوسرے شہروں کا خراج تھا اور اہالی ایتھنز کو فرائض حکمرانی اور تنخواہوں کی جو کثرت و وسعت حاصل تھی وہ زیادہ تر ان کی اسی شہنشاہی حیثیت کے باعث تھی۔

چوتھی صدی کی طرف پلٹ کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جمود، فرقہ بندی اور آپس کی جنگ و جدل کے وہ مصائب جو تمام دور تاریخی میں عام طور پر یونان کی شہری سلطنتوں کی خصوصیت خاص بنے ہوئے تھے، یہ عیوب ایتھنز کی کامل ترقی یافتہ عمومیت میں نہیں

عـلـہ۔ ارسطو، "سیاسیات" حصہ ۴ (د)، باب ۴، فقرہ ۴، حصہ دوم، باب ۶، فقرہ ۴۔

پائے جاتے ہیں (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں)، یہی آپس کا مناقشہ تھا جس کی وجہ سے ساتویں اور چھٹی صدیوں میں خودسرانہ حکومت کے قیام کا موقع مل گیا؟ ایتھنز میں آپس کی اس جنگ جدال کا دور پانچویں صدی کے آخر تک ختم ہو گیا تھا چوتھی صدی میں فرقہ بندیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ رہی ہوں مگر وہ بدنظمی و زیادتی کی طرف منجر نہیں ہوتی تھیں۔ اہلِ دولت اور ان کے شرکائے کار اور عامۃ الناس کے مابین جو کشمکش اور جھگڑے اس قدر عام تھی اور جس سے بقول افلاطون ایک شہر کے دو دشمن بن جاتے تھے جنہیں سے ہر ایک اپنے مخالف فریق کے سرگروہوں کو برابر خارج کرتا رہتا تھا، ایتھنز اس کشمکش سے پاک تھا، لیکن پھر بھی (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں)، اس کی عمومیت سربرآوردہ اہلِ فکر و مصنفانِ سیاسیات کے شدید لعن وطعن سے نہ بچ سکی۔

۲۔ لیکن اگر اصحابِ فکر عمومیت کے معائب کا علاج عددیت کے بدتر معائب میں تلاش کرنے پر متفق نہ تھے تو پھر ان کا مجوزہ قطعی علاج کیا تھا؟ افلاطون و ارسطو دونوں نے اس سوال کا جواب کسی قدر پیچیدہ سا دیا ہے۔

دونوں نے ایک مثالی سلطنت قائم کی ہے اور اس کی نسبت یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ عام طور پر عملی صورت میں نہیں آسکتی، اور پھر دونوں ایک آخری علاج یعنی ایک دوسری بہترین صورت تجویز کرتے ہیں جس کا عملی صورت میں لانا زیادہ اغلب ہو، اور جب ہم دونوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کی مثالی سلطنت اگرچہ افلاطون کی مثالی سلطنت سے بہت ہی غیر مشابہ ہے لیکن افلاطون کی دوسری بہترین صورت کے نمونے کے ساتھ اسے ایک قوی مشابہت ہے، پس اس طرح ہم دونوں اصحابِ فکر کے تعلیمات کو یکجا کر سکتے ہیں اور ان میں تخیل کے اس مسلسل تحرک کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ وہ بہت ہی نمایاں قسم کے سیاسی تخیل سے جو عملی سیاسیات سے بہت ہی بعید واقع ہوا تھا نسبتاً زیادہ عملی تجربہ آموز تخیل کی طرف گامزن تھا۔

سیاسی مطمح نظر کا جو عنصر اصلی افلاطون و ارسطو دونوں میں مشترک تھا وہ اس بنیادی اصول کے اندر پایا جاتا ہے جس پر افلاطون کے استاد سقراط کی مکالماتی تعلیم مبنی تھی۔ وہ تعلیم یہ تھی کہ ذاتی معاشرت کے مانند حکومت کے کام میں بھی بہت بڑی احتیاج علم یعنی انسان کی حقیقی بہتری اور اس کے حصول کے ذرائع کے علم کی ہے، جس

شخص میں یہ علم موجود ہوگا جب اسے حکمرانی کے فرائض تفویض ہوں گے، تو اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ محکوم کی بہبود کو کس طرح ترقی دینا چاہیے اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود اس کی بہبود بھی اس فرض کے صحیح طور پر انجام دینے سے حاصل ہوگی۔ اس قسم کا شخص فی الواقع مدبر ہوگا، خواہ اس کا تقرر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اور اگر ہمیں اس قسم کا کوئی آدمی مل سکے، اور ہم اسے حکمراں نہ بنائیں اور حکمرانوں کے انتخاب کا مسئلہ قرعہ کے نتائج اتفاقی پر چھوڑ دیں تو یہ پوری دیوانگی ہوگی۔ اس کے برعکس، اس جوہر علم کے بغیر تمام بنی نوع انسان کی رائیں بھی کسی شخص کو مدبر نہیں بنا سکتیں۔ ان سادے دفعات میں سقراط کے سیاسی عقیدے کے وہ تخم مخفی تھے، جن سے افلاطون کی مثالی اعیانیت نے نشو و نما حاصل کی کیونکہ افلاطون کی رائے میں یہ لابدی علم صرف فلاسفہ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، اس کے قبل کہ کوئی شخص انسانی زندگی میں اعلیٰ اوصاف سے کام لینے کی توقع کر سکے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے مجرد اوصاف پر غور و فکر کرنے کی تعلیم و تربیت دی گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی، ایسے اشخاص جو اپنے مواہب فطری کے لحاظ سے اس قابل ہوں کہ فلسفہ کے حسب ضرورت، طولانی و مشقت طلب تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں ایسے افراد بہتر سے بہتر منتظم قوم میں بھی ہمیشہ معدودے چند ہی ہوں گے اور ان چند افراد کے منتخب کرنے کی قابلیت بھی صرف فلسفیوں ہی میں ہو سکتی ہے، لہٰذا افلاطون کی اعلیٰ ترین مثالی سلطنت ایک ایسی اعیانیت ہوگی جس کی بنا انتخاب باہمی پر ہوگی یعنی اس میں فلسفیوں کے ایک ایسے مختصر سے طبقہ کی بے چون و چرا اطاعت ہوگی جن کی تعلیم و تربیت غور و فکر کے ساتھ ہوئی ہو اور جو اپنی تعداد کو ایسے نوجوانوں کے انتخاب سے پورا کرتے رہیں جنھیں وہ تعلیم و تربیت کے قابل سمجھیں۔

ایک ایسی انسانی جماعت کی بقا کے لیے جو اپنے ضروریات کو خود پورا کرتی ہو، جن طبقات کی ضرورت ہے، اس میں سے افلاطون نے اپنی مثالی سلطنت کے بنانے میں جس دوسرے طبقہ کی تعلیم و تربیت کی ضرورت سمجھی ہے وہ صرف جنگجو طبقہ ہے، یہ ضرور ہے کہ سلطنت کے اندر کاشتکار و دستکار بھی ہوں گے مگر اس کی رائے میں ان لوگوں کو سپاہی پیشہ جماعت سے علیحدہ ہونا چاہیے۔ افلاطون نے صرف ان سپاہی پیشہ اشخاص ہی کے لیے قواعد و ضوابط کا مشرح طریقہ بیان

گیا ہے، یہی لوگ بشمول فلاسفہ تمام قوم کے مربی ومحافظ قرار دے گئے ہیں۔

وہ جنگ کو انسانی نظم معاشرت کی مثالی حالت کا کوئی حسب معمول واقعہ نہیں سمجھتا بلکہ اس کے بالکل برعکس خیال رکھتا ہے، لیکن اس کی سلطنت اگرچہ ایک خیالی و تصوری سلطنت ہے پھر بھی اس کا مقصود کسی یوٹوپیا کا قائم کرنا نہیں ہے، وہ کوئی وہمی سلطنت نہیں ہے بلکہ ایک نمونہ کی سلطنت ہے۔ یونانی شہری سلطنتوں میں جو واقعی حالت قائم تھی اسی کو مدنظر رکھکر اس کا خاکہ تیار کیا گیا ہے، اور ان سلطنتوں میں قومی خوشحالی کے لئے یہ ایک لازمی شرط تھی کہ جنگ کے معاملہ میں سلطنت کو مہیب و ہولناک ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی ان طبقات کے مقابلہ میں، جو قوم کے مادی ضروریات مہیا کرنے میں مشغول تھے، سپاہی پیشہ طبقات کی اخلاقی فوقیت کے متعلق اس کا خیال بالکل اسی، تصور کے مطابق تھا جو یونانیوں نے نکوکاری کے متعلق قائم کر رکھا تھا، اور اس تصور میں شجاعت کو اس زمانہ کے خیال کے بہ نسبت بہت زیادہ نمایاں حصہ دیا گیا تھا، اس سے اس زمانہ کے لوگوں کو حیرت ضرور ہوگی مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کیفیت سیاسی حالات کا ایک بالواسطہ اثر تھا۔ پس افلاطون کی انتہائی رائے میں ارباب حکمت و اہل سیف ہی باہم ملکر مربیوں کا وہ طبقہ بناتے تھے جن کے لئے تعلیم و تربیت فوجی قواعد، اور ضابطۂ زندگی کے لئے ایک مشرح نظام مرتب کیا گیا تھا، یہ نظام اسپارٹا کے طرز پر ڈھالا گیا تھا، جس کے دستور سلطنت کو افلاطون، یونان کے واقعی اشکال حکومت میں سب سے اول درجہ پر قرار دیتا ہے مگر اپنے سیاسی دستور کی ترتیب میں اس نے یہ خیال مدنظر رکھا ہے کہ خانگی ضروریات کے لئے خود غرضانہ وصولِ زر کی خرابیاں زیادہ قطعی طور پر خارج ہو جائیں۔

افلاطون نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ خرابیاں اسپارٹا سے کامل طور پر خارج نہیں کی گئی تھیں کیونکہ لائی کرگس کے دستور میں اگرچہ مردوں کو سخت وسادہ قواعد کی مشق کرائی جاتی تھی اور عورتیں اس مشق سے بالکل کوری رہگئی تھیں، اور اگرچہ اسپارٹا کی فوجی قیامگاہ کی زندگی اور عام مشترک دعوتوں نے مردوں کے لئے دولت سے لطف اندوز ہونے کو بہت سختی کے ساتھ محدود کر دیا تھا مگر بیوی بچوں کے لئے دولت جمع کرنیکی خواہش کا عملی نتیجہ صرف یہ تھا کہ اہل اسپارٹا حرص وہوس کی مخرب تحریکات کا شکار

ہو گئے تھے، پس اس غرض سے کہ شہری جذبہ نے اسپارٹا میں جس حد تک ترقی کی تھی اسے اس سے زیادہ قطعی غلبہ حاصل ہو جائے، اور اس غرض سے بھی کہ اہل شہر کی اولاد ہر طرح کامل ہو اور فرائض (ملکی) مناسبت طبعی کے مطابق تقسیم ہوں، افلاطون نے اپنے قائم کردہ مربیوں کے طبقہ کے لئے ذاتی جائداد اور ذاتی خاندان کو بالکلیہ منسوخ کر دینے کی تجویز کی۔

لیکن اس اشتمالیت پر ارسطو نے بہت سختی سے بحث کی ہے اور اپنی تصنیف "سیاسیات" میں اس اختلاف رائے کو اس نے جو نمایاں جگہ دی ہے، اس سے افلاطون کی "دوسرے درجہ کی سلطنت" اور خود اس کے (ارسطو) کے سیاسی منتہائے خیال میں جو گہرا اور اصولی تشابہ موجود ہے، وہ پردہ خفا میں آگیا ہے کیونکہ افلاطون نے خود یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی اشتمالیت عملی سیاسیات کے حد کے اندر نہیں آتی، اس لئے اپنی "دوسرے درجہ کی سلطنت" کی بحث میں (جس کا خاکہ اس نے اپنی تصنیف "قوانین" میں کھینچا ہے جو "ری پبلک" (جمہور) سے کئی سال بعد لکھی گئی تھی) اس نے منا کحت اور ملک شخصی دونوں کے متعلق اشتمال کے خیال کو ترک کر دیا ہے لیکن پھر بھی اس نے اس امید سے ہاتھ نہیں اٹھایا ہے کہ امرا و غربا کے درمیان نظم معاشرت کی مہلک تقسیم کو قانونی مداخلت کے ذریعہ سے روکا جائے۔ اس تقسیم کے متعلق اس نے "جمہور" میں بہت زور دے کر یہ کہا ہے کہ "اس سے ایک شہر کے اندر دو متحارب حصے قائم ہو جاتے ہیں"[ع۱]۔ اب وہ اسے روکنے کی اس طرح توقع کرتا ہے کہ زمینداروں کی ایک جماعت کو شہری حقوق دیدیئے جائیں اور ہر ایک کو زمین کے برابر برابر ٹکڑے دے دیئے جائیں جو نا قابل انتقال ہوں اور اس ٹکڑے کی چار چند قیمت سے زیادہ کی منقولہ جائداد حاصل کرنے کی قطعی ممانعت کر دی جائے۔ ان ٹکڑوں کی خرید و فروخت نہ ہو اور ہر شخص اپنا حصہ اپنے اس لڑکے کے لئے چھوڑ جائے جس سے اس کو سب سے زیادہ محبت ہو۔ اپنے دوسرے لڑکوں کو وہ "ان شہریوں میں تقسیم کر دے جنکے اولاد نہ ہو اور جو ان لڑکوں کو تبنیٰ کرنا چاہیں"[ع۲]۔ حصوں کو مساوی رکھنے کے لئے

ع۱۔ ریپبلک (جمہور) حصہ چہارم، ۴۲۲
ع۲۔ قوانین "پنجم" ۷۴۰

اور بھی بہت سے قواعد قرار دئے گئے ہیں۔ آبادی اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو بشرط امکان، حکام اسے محدود رکھیں۔ اور اگر یہ ناممکن العمل معلوم ہو تو آخری چارہ کار کے طور پر لوگوں کو کہیں اور نو آبادی قائم کرنے کے لئے بھیجدیں۔

جائداد کی عدم مساوات کو روکنے کی اس تجویز پر ارسطو نے نکتہ چینی کی ہے مگر اسکی یہ نکتہ چینی زمانہ جدید کے اس خیال کی مطابقت میں نہیں ہے کہ اس سے معاشی تقسیم کے فطری قوانین میں ضرورت سے زیادہ مداخلت ہوگی بلکہ یہ نکتہ چینی اس معنی کر کے ہے کہ یہ مداخلت کافی حد تک نہیں رکھی گئی ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ یہ تجویز اس وجہ سے شکست ہو جائے گی کہ خاندان میں لڑکوں کی تعداد کی کوئی معینہ حد نہیں مقرر کی گئی ہے، اس لئے اس نے اپنی تصوری سلطنت میں اس حد کے قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔

اس نے افلاطون کی دوسری درجے کی سلطنت کے بعض اور نکات پر بھی نکتہ چینی کی ہے، لیکن اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے ہم ارسطو کی بہ نسبت زیادہ صفائی کے ساتھ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ خود اس کا تخیل سیاسی اپنے خط و خال میں افلاطون کے تخیل سے کس درجہ یکساں ہے۔ افلاطون و ارسطو دونوں اس رائے پر متفق ہیں کہ اعلیٰ درجہ کے منتظم سیاسی نظم معاشرت کی آخری صورت شہری سلطنت ہی ہے۔ دونوں کی رائے میں سلطنت کو ایک شہر سے زیادہ وسیع نہ ہونا چاہیئے۔ شہر کے ساتھ اتنی زمین ہونا چاہیئے جو اس کے گزر کے لئے ضروری ہو اور یہ حد اس غرض سے رکھی گئی ہے کہ اہل شہر ایک مجلس میں جمع ہو سکیں، جو موثر غور و فکر کے لئے ضرورت سے زیادہ بڑی نہ ہو اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے اس قدر واقف ہوں کہ حکام کا انتخاب خوبی کے ساتھ کر سکیں۔ نیز یونان کے اصحاب فکر کی نظر میں اس شرط کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ انصاف کا انتظام عمدگی کے ساتھ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ارسطو کا تخیل افلاطون کے تخیل سے زیادہ سخت ہے اس نے افلاطون کی دوسری درجہ کی سلطنت کے متعلق (جس میں پانچ ہزار جنگجو آدمیوں کی جماعت تجویز کی گئی تھی) یہ نکتہ چینی کی ہے کہ یہ تعداد ضرورت سے زیادہ بڑی ہے، دونوں اس خیال میں متفق ہیں کہ مدبر ملک کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ تا حد امکان اہل شہر میں انسانی نیک کرداری اور بہبود کے بہترین اوصاف پیدا ہوں اور دونوں کی رائے میں اس کا بہترین ذریعہ فلسفہ (یعنی حصول علم میں ذہن کی مستعدانہ

مشغولیت) ہے، نیز دونوں اس رائے پر قائم ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی نیک کرداری کے حاصل کرنے اور اس پر کاربند ہونے کی توقع اہل شہر کے صرف ایک منتخب طبقے سے ہو سکتی ہے، جو اپنی گزر اوقات کا سامان مہیا کرنے کی ضرورت سے فارغ اور ایک مشرح و منضبط نظام تعلیم پر کاربند ہونے پر مجبور رہو۔ لہٰذا دونوں کی نظر میں اہل شہر کا مفہوم زمینداروں کی ایک جماعت ہے جو اپنے حصہ کی زمین کی پیداوار پر فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہو اور اس زمین کی کاشت نیم غلام کرتے ہوں اس لیے دونوں نے کاشتکاروں دستکاروں اور خوردہ فروشوں کو شہریت کے حق سے خارج رکھا ہے، دونوں کی رائے میں مرد شہریوں کو جوانی میں جنگ کی پوری پوری تعلیم ملنا چاہئے اور دونوں اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی فطرت میں یہ بات نہیں ہے کہ مسلح شہریوں کی جماعت فلسفی حکمرانوں کی اطاعت میں سر جھکا دے۔ (افلاطون نے اپنی دوسرے درجہ کی سلطنت میں اس معاملہ کو ارسطو سے کم تسلیم نہیں کیا ہے)۔ اس لئے دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ فوجی زمیندارانہ طبقہ کو سیاسی اقتدار میں اہم حصہ دینا چاہئے مگر دونوں کے ہاں اس کے طریقے اور درجے مختلف ہیں افلاطون کی تجویز میں انھیں عاملانہ حکام اور غور و بحث کی اس مجلس کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے جس کی جانب حکام اہم معاملات کو رجوع کریں، اس قسم کی منتخب شدہ مجلس شوریٰ کے وصف و خوبی کو ترقی دینے کے لئے وہ یہ تجویز کرتا ہے کہ شہریوں کو اسباب جائداد کے چار طبقات میں تقسیم کر دینا چاہیے اور دستور سلطنت اس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ عملاً اعلیٰ طبقات کی انتخابی قوت بڑھ جائے۔ اس کے برعکس ارسطو کی تجویز یہ ہے کہ اعلیٰ مباحثی فرائض تمام اہل شہر یعنی فوجی حد عمر کے گزر جانے کے بعد تمام زمیندارانہ طبقہ کی ایک جمعیت کو دینا چاہئیں۔ وہ یہ تجویز کرتا ہے کہ ان اہالی شہر کو عدالتی فرائض بھی دینا چاہئیں اور میرا گمان ہے کہ یہاں اس کا مقصود ان شہریوں سے ہے جو ایتھنز کی بڑی بڑی عمومی جوری کی صورت میں مجتمع ہوئے ہوں۔ پس اگر ہم شہریوں کے اندر صرف تقسیم اختیارات پر لحاظ کریں تو ارسطو کی مثالی سلطنت میں حکومت کی شکل افلاطون کی دوسری بہترین شکل کی بہ نسبت واقعاً عمومیت سے زیادہ قریب ہے، مگر ہماری نظر میں یہ فرق اس امر واقعہ کے مقابلہ میں بالکل غیر اہم معلوم ہوگا کہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ حق شہریت کو ان زمینداروں کے طبقہ تک محدود کر دینا چاہیے جو نیم غلاموں کی محنت کی پیداوار پر فراغت کے ساتھ

زندگی بسر کرتے ہوں، اس سے میں غلامی کے اس آخری نقطہ پر پہنچتا ہوں جس پر دونوں اصولاً متفق ہیں، دونوں اس رائے پر قائم ہیں کہ غلاموں کا ہونا ضروری ہے، مگر اس کے ساتھ ہی دونوں اس رائے پر بھی قائم ہیں کہ غلام ایسے انسان ہوں جو فطرتاً غلامی کے لئے موزوں ہوں، کسی یونانی کو غلامی میں نہ رکھنا چاہئے[عـــہ]۔

۳۔ پس مطلق بادشاہی یعنی عقل و نکوکاری کے اعتبار سے سب سے افضل و اعلیٰ شخص کی حکمرانی کو جسکی نسبت صاف طور پر واضح ہے کہ ارسطو کے زمانہ کی عملی سیاسیات سے اسے کوئی تعلق نہ تھا، بحث سے خارج رکھکر، سقراط کے اتباع کرنے والے جلیل القدر اصحاب فکر کا اعیانی تصور حکومت بالاختصار وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے افلاطون کی حکومت اعیانی پر خیال کیا جائے تو ہمیں صاف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسپارٹا کے ادارات سے نمونہ کا کام لیا گیا تھا اور اس لئے افلاطون و ارسطو دونوں اسپارٹا کے دستور سلطنت کو حقیقی یونانی سلطنتوں میں اعلیٰ جگہ دینے پر متفق تھے، اس کا تعلق ان سلطنتوں سے تھا جسے ارسطو وسیع مفہوم میں عددیت سے ممیز "اعیانیت" کہتا ہے، یعنی وہ سلطنتیں تھیں جن کے دساتیر کا مقصود اہل ملک کے اندر قابلیت کو ترقی دینا اور سیاسی حیثیت سے قابلیت ہی کو مستحق انعام قرار دینا تھا۔

تاہم، ارسطو کا یہ خیال نہیں ہے کہ جن واقعی شہری سلطنتوں کا اسے علم تھا ان کیلئے اس کے مثالی نظم سلطنت یا اسپارٹا کے مثل کسی اور دستور کی جسے اعیانی کہہ سکیں، عام طور پر سفارش کی جا سکتی تھی۔ اسے یہ تسلیم تھا کہ ان شہری سلطنتوں میں عمومیت کا میلان اس درجہ قوی تھا کہ اگر وہ ان کے لئے کسی ایسے سیاسی دستور کی سفارش کرتا جسے اعیانیت کہنا بجا ہو تو وہ اسے قبول نہ کرتیں۔ اس نے جس امر کی سفارش کی ہے اسے وہ ایک خاص مفہوم میں "دستوری حکومت" کہتا ہے، جس میں متوسط وسائل کے لوگ امرا و غربا کی دو انتہائی حدوں کے درمیان توازن کو قائم رکھیں اور عددیت و عمومیت کے متخاصم اصول کے درمیان ایک

عـــہ ۔ یونان میں واقعتاً جو غلامی رائج تھی اس کے ساتھ افلاطون و ارسطو کے تعلق پر بحث کرتے وقت ہم اس پر بالکل جدید نقطۂ نظر سے فیصلہ صادر کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں اور خلاصۃً یہ کہدیتے کہ دونوں غلامی کو قبول کرتے اور اس کے رواج کے حامی تھے مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ یونانیوں کے غلام بنانے کو مسترد کر کے وہ اپنے زمانہ سے کسقدر آگے بڑھے ہوئے تھے۔

طرح کا امتزاج پیدا ہو جائے اس طرز حکومت کو اگر دستوری حکومت کے بجائے دستوری عمومیت کہا جائے تو اس زمانے کے پڑھنے والوں کے لئے غالباً زیادہ قریب الفہم ہوگا۔

یہ امتزاج یا توازن مختلف طریقوں سے عمل میں لایا جا سکتا ہے کہ بعض امور میں یہ موزوں و مناسب ہوگا کہ ایک متوازن سلطنت کے نظام حکومت میں اعیانی و عدیدی دونوں انتظامات شامل کرلئے جائیں یعنی عدیدی سلطنتوں کے رواج کے مطابق امرا پر جوری کے خدمات انجام نہ دینے کے لئے جرمانہ کیا جائے، اور عمومی سلطنتوں کے رواج کے موافق غربا کو ان خدمات کے انجام دینے کا معاوضہ دیا جائے تاکہ دونوں کے شمول وحاضری کا تیقن ہو جائے۔ دوسری صورتوں میں حسب دلخواہ توازن بہترین طور پر یوں حاصل ہو سکتا ہے کہ دونوں طریقوں کے درمیان میں ایک راستہ اختیار کیا جائے، یعنی اعلیٰ مباحثی جمعیت کی رکنیت کی شرط کے طور پر، عدیدی سلطنتوں کے بلند معیار جائداد کے بجائے ایک معتدل معیار قائم کیا جائے جس سے آزاد شہریوں کا کثیر حصہ اس میں شامل ہو سکے یا یہ کہ تقرر کا ایک مرکب طریقہ اختیار کیا جائے، جو کسی قدر عدیدی اور کسی قدر عمومی ہو یعنی عاملانہ عہدوں کا تقرر کسی قدر اظہار رائے کے ذریعہ سے ہو (جسے یونانی قطعاً عدیدی یا اعیانی طریق تقرر سمجھتے تھے) اور کسی قدر قرعہ اندازی کے ذریعہ سے ہو (جسے وہ قطعاً عمومی طریق سمجھتے تھے) یہ ضرور ہے کہ یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ ترازو کے دونوں پلّے تمام حالات میں بالکل برابر اور ایک ہی سے ہوں گے بعض آئینی حکومتیں عدیدیت کی طرف زیادہ مائل ہوں گی اور بعض عمومیت کی طرف، لیکن ارسطو نے اپنے زمانہ کی شہری سلطنتوں کے عملی منتہائے کمال کے لئے جس قسم کے دستور سلطنت کی سفارش کی ہے وہ کوئی ایسا ہی مرکب دستور سلطنت ہونا چاہیے جس میں دولتمندوں یا غریبوں دونوں میں سے کسی کو بھی بے روک ٹوک

۱؎۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے انیسویں صدی کے نصف اول میں یورپی سلطنتوں کی نسبت اگر "دستوری حکومت" یا "دستور" کا لفظ استعمال ہوتا تو اس سے بالطبع یہی سمجھا جاتا کہ مقصود "دستوری بادشاہی" ہے جدید صورتوں میں دستور کے مرتب کرنے والوں کو جس مسئلہ سے سابقہ تھا وہ یہ تھا کہ ایک بادشاہ تو موجود ہے اب اس کے اختیار کو کس طرح محدود و متوازن بنایا جائے، اسی طرح پر قدیم اہل فکر بالطبع عوام کے اختیار کو مسلم قرار دے لینگے۔

یہ موقع نہ حاصل ہو کہ وہ جسطرح چاہیں کارروائی کریں مگر اس نے افسوس کے ساتھ اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ واقعاً اس کا عمل پذیر ہونا شاذونادر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے وجوہ و اسباب میں اسی کے الفاظ میں بیان کرونگا۔

"کیوں اکثر حکومتیں یا عمومی ہیں یا عدیدی؟ اس کے اسباب یہ ہیں کہ اولاً تو ان میں معتدل وسائل کے اشخاص کا طبقہ بالعموم کم تعداد میں ہے، دوسرے یہ کہ عوام اور اصحاب جائداد کے درمیان چونکہ فسادات و مناقشات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے جو فریق بھی غالب آجاتا ہے وہ اس کے بجائے کہ ایک وسیع النظر و مساوی قسم کی حکومت قائم کرے اپنی سیاسی فوقیت کو غنیمتِ فتح سمجھ لیتا ہے اور اس لئے یا عمومیت قائم کر دیتا ہے یا عدیدیت" مزید براں" وہ دو قومیں جنھیں یونان میں شہنشاہی حیثیت حاصل ہے، وہ تمام و کمال اپنے ہی سیاسی مقاصد پر نظر رکھتی ہیں اور اپنے زیر حکومت شہروں کے مقاصد کو اپنے مقاصد کے تابع کر لیتی ہیں۔ پس ایک ان میں سے اپنے تابع شہروں میں عمومیت قائم کرتی ہے اور دوسری عدیدیت۔ ان وجوہ سے حکومت کی درمیانی شکل یا تو وجود میں آتی ہی نہیں اور یا بہت ہی کم اور معدودے چند سلطنتوں میں نفاذ پذیر ہوتی ہے[1]"

میرے علم میں یہ بیان اس تمام صداقت کا آئینہ ہے جسے مرکب شکل حکومت کے امکان کے خلاف، اسٹیٹس کے وقت سے مختلف مصنفوں نے بدلائل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونانی تاریخ کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حسب دلخواہ توازن کا حصہ بہرنوع مشکل تھا، اس امتزاج میں ایک نہ ایک عنصر کو غلبہ حاصل ہو جاتا اور انجام کار میں یہ توازن غارت ہو جاتا تھا۔ یہ کہنا کہ اس قسم کی مرکب شکل ناممکن ہے میرے خیال میں یہ ایک عاجلانہ تعمیم ہے مگر ارسطو نے یونان کے تجربہ کا جو ملخص کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ باغلب وجوہ یہ صورت نادر الوقوع ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جس امتزاج کو اس نے بہت ہی زیادہ قابل عمل سمجھا ہے وہ عمومیت ہی کی طرف زیادہ مائل ہوگا، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کی اصطلاح "پولی ٹایا" کا ترجمہ "دستوری عمومیت" کیا ہے، یہ وہ نظام ہے جس میں آخری نگرانی اہل شہر کے حصہ کثیر کے ہاتھ میں رہیگی

---

[1] "سیاسیات" حصہ ششم، چہارم، باب یازدہم فقرہ ۱۹ و ۱۸، ان دونوں قوموں سے مراد لامحالہ اہل ایتھنز اور اہل اسپارٹا ہیں۔

اپنے زمانہ کی یونانی شہری سلطنتوں میں وہ اس امر کو صریحاً مایوس کن سمجھتا ہے کہ عامۃ الناس پر یہ اثر ڈالا جائے کہ وہ اس آخری نگرانی سے دست بردار ہو جائیں لیکن یہ ممکن ہے کہ انھیں اس امر پر راغب کیا جائے کہ وہ انضباط و توازن کے مطیع ہو جائیں جس سے چند امرا یا کثیر التعداد غربا کا ظلم و ستم رک جائے۔ لیکن اسے بھی مستحکم شکل سے قائم رکھنے کی امید وہ اس نظم معاشرت میں کرتا ہے جہاں متوسط وسائل کے لوگ باعتبار تعداد کے آئینی قوت رکھتے ہوں کہ ان کا طبقہ غالب رہ سکے۔[۱]

۴۔ جدید نقطۂ نظر سے یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو مرکب یا متوازن دستور سلطنت کی سفارش میں کبھی اس خیال کی طرف نہ آیا کہ اس امتزاج میں بادشاہی کو بھی ایک عنصر کے طور پر داخل کیا جائے۔ میرے قیاس میں اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ وہ جن مدبرین سے واقف تھا ان میں سے کسی کو بھی ایسی یکتا قابلیت کا شخص نہیں سمجھتا تھا کہ اسے مستقل اختیار کا اتنا وسیع حصہ تفویض کر دینا بظاہر قرین عقل معلوم ہوتا اور کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ حقیقی جائز بادشاہی ایک ایسی شے تھی جو (کم از کم ارسطو کے وقت کے) یونانیوں کے تجربہ کی حد رسائی سے باہر تھی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ارسطو نے ناجائز منصوبہ یا غیر فطری "خود سری" کے علاوہ پانچ قسم کی بادشاہیوں کو تسلیم کیا ہے مگر ان میں [۱۷] ایک قسم یعنی اسپارٹا کی بادشاہی کو محض اخلاقاً اس نام سے موسوم کر سکتے ہیں، وہاں بادشاہ کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ وہ ایک مستقل سپہ سالار اعظم تھا اور ملکی معاملات میں اس کا اختیار بے حقیقت سا تھا۔ (۲) دوسری نوع یعنی موروثی مطلق العنانی جو بربریوں (غیر یونانیوں) کے لئے گویا فطرت کی طرف سے مخصوص تھی اسے وہ یونان کے معاملہ میں خارج از بحث سمجھتا ہے، (۳) سورماؤں کے زمانہ کی حسب قانون، قدیم بادشاہی اب نسیاً منسیاً ہو چکی تھی اور (اس کا) اعادہ نہیں ہو سکتا تھا[۲] اور (۴) انتخاب کردہ دائمی امارت مطلقہ،[۳] جو شرفا و عوام کی کشاکش کے

---

[۱] تیسری صدی میں ارسطو کے تخیل سے کسی قدر قریب پہنچی ہوئی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

[۲] یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ارسطو سورماؤں کے زمانہ کے دستور کو حکومت کی متوازن یا مرکب شکل نہیں سمجھا۔ اس کا خیال یہ ہے کہ بادشاہ کی طاقت قانون یا رواج سے محدود ہوتی تھی مگر وہ یہ نہیں

دورِ اول میں قائم کی گئی تھی، وہ بھی زمانہ گزشتہ کی بات ہو چکی تھی۔ بس آخر ب (۵) یکتا قابلیت کے فرد فرید کی حکمرانی رہجاتی ہے جو ارسطاطالیسی ترتیب حکومت میں قابلیت کے معیار میں سب سے مقدم ہے، لیکن کم از کم ارسطو کے دور میں تو یہ محض ایک خالی تصور تھا۔ پس ارسطو کے زمانہ میں یونان کے لئے عملی سیاسیات کی حد وسعت کے اندر ایک بھی جائز بادشاہی ایسی نہ تھی جو حقیقتاً اس نام کی سزاوار ہوتی اور میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ وہ بادشاہی کو عمومیت، عدیدیت یا دونوں کے خارج کرنے کی بحث تک درمیان میں لاتا، اور خلاف قانون خودسرانہ حکومت کے ساتھ کسی قسم کی توازن یا مصالحت کا اشارہ تک آنا بھی مقبولۂ رائے عامہ کی خلاف حد سے بڑھی ہوئی جسارت تھی عـ۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہتا کہ کوئی مجلس شوریٰ یا جمعیت اس اختیار میں شریک تھی۔ چونکہ اسمیں شک نہیں کہ دستور سلطنت کا خیال اس نے ہومر سے اخذ کیا تھا اس لئے اس اختلاف رائے میں جس کی بحث خطبۂ دوم میں ہوئی ہے ارسطو کی سند گروٹ کی طرفداری میں نقل کیجا سکتی ہے مگر پھر بھی میری رائے اسکے خلاف ہے ملاحظہ ہو خطبۂ ہشتم صفحۂ (۹۰) مجھے کوئی تاریخی مثال ایسی نہیں معلوم ہے کہ اس قسم کا کوئی آمر مطلق مدت العمر کے لئے منتخب ہو گیا ہو مگر یہ عیاں ہے کہ اس کی مثالیں ارسطو کو معلوم تھیں (سیاسیات حصۂ سوم باب ۱۴)۔

عـ۱۔ اس امر میں شک کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خودسری کے خلاف رہا جی جذبات میں ارسطو فی الواقع کس حد تک شریک تھا، مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنے کو صریحی طور پر اس سے علحدہ نہیں کرتا تھا۔

یونانی وفاقیت[۱]

۱۔ اب ہم چوتھی صدی کے آخر تک یونان کے مختلف طرز ہائے حکومت و تقلیبات پر ان کی ارتقائی ترتیب کے بموجب غور کر چکے ہیں، اور علم سیاسیات کا مقصد ہی یہ ہے کہ مختلف طرز اور ایک طرز سے دوسری طرز کی طرف تقلیب کے عام اسباب کو دوسری مثالوں سے مقابلہ کر کے جہاں تک ممکن ہو صاف کرے، اول ہم نے ابتدائی "نظم حکومت" کی جانچ کی جس کا اگر کچھ نام ہو سکتا ہے تو بادشاہی ہو سکتا ہے، مگر یہیں ماتحت سرداروں یا بزرگوں کی مجلسِ شوریٰ اور آزاد مسلح اشخاص کی جمعیت کے اندر ان غیر ترقی یافتہ اجزا و عناصر کی دلچسپ کیفیت منکشف ہوتی ہے جس میں سے ایک تو آگے چلکر عدیدیت کی صورت میں نمایاں ہوا اور دوسرے نے عمومیت کا رنگ اختیار کیا، اس کے بعد ہم نے ابتدائی عدیدیت کی تقلیب پر بحث کی ہے جس کی سب سے زیادہ نمایاں ہیئت بادشاہ کے اختیار کا

[۱] سابق میں (Federation) کے ترجمہ متفقیت تجویز ہوا تھا اور وہی لکھا جاتا تھا مگر بعد میں مزید غور کے بعد "وفاقیت" زیادہ موزوں معلوم ہوا اس لئے آیندہ وفاقیت لکھا جائے گا، اسی طرح (Confederation) کا ترجمہ "مشترکیت" کے بجائے "عہدیت" ہوگا۔

کم کرنا اور آخر میں اس کے بجائے ایک سالانہ عہدہ نظامت قائم کرنا تھا اس کے بعد مجلس شوریٰ
حکمران عنصر بن گئی جمعیت غالباً قائم رکھی گئی مگر پرانے خاندانوں کے زمیندار اس پر حاوی ہوگئے
تھے۔ پھر ہم نے ان مختلف اسباب پر غور کیا ہے جو جمعیت میں عدیدی یعنی فاتحانہ رنگ پیدا کرنے
کا باعث ہوئے یعنی بغیر سیاسی حقوق کے جدید آبادی کو خاصکر نو آبادیوں میں ترقی دی گئی باہمی
اتحاد کے طریق کو (جس کے اثر سے چھوٹے چھوٹے زمیندار اور دور کے رہنے والے لوگ جمعیت
سے خارج ہوتے گئے) دولت کے عدم مساوات سے ترقی ہوئی اور غریب تر آزاد اشخاص معاشی
غلامی میں پھنس گئے۔ دوسرا امر جس پر غور کیا گیا تھا وہ خود سری یعنی "بادشاہی کی جانب بیقاعدہ
وغیر آئینی رجعت" تھی اور غالباً ایتھنز کی طرح اس میں دستوری شکلوں کو بھی قائم رکھا جاتا ہوگا اور ہم
نے اس موخر طرز کو جس میں اجیر سپاہیوں سے کام لینا مفید مطلب تھا اس قدیم طرز سے ممیز
کیا تھا جس نے سران انبوہ سے شروع ہوکر ترقی کی او جس کے لئے قدیمی عدیدیت کے مخالف
ردّ عمل نے عمدہ موقع پیدا کر دیا تھا ہم نے یہ بھی دکھایا ہے کہ بعض عہدوں میں رائج طرز مطلق العنانی
کا تھا مگر یہ کوئی لازمی منزل نہیں تھی جس سے یونانی سلطنتوں کا گزرنا لابدی ہو۔

اس کے بعد جب بالفاظ عام قدیم تر خود سری نابود ہوگئی تو یونانی تاریخ کا وہ شاندار دور
شروع ہوا جسے عام طور پر عمومیت کے میلان کی جانب معنون کیا جاتا ہے ہم عمومیت کی جانب
درجہ بدرجہ ترقی کا پتہ ایتھنز میں چلا سکتے ہیں جہاں پانچویں صدی کے آخر میں ایک مستحکم عمومی
دستور مختتم طور پر قائم ہوگیا تھا اور جو مقدونیہ کے زیر اثر آجانے کے وقت تک اصلاً ومعناً غیر متغیر
حالت میں قائم رہا۔ یونان میں اور جگہوں میں بھی عمومیت کی جانب ایسا ہی میلان نظر آتا ہے
اگرچہ یہ ضرور نہیں کہ ہمہ گیر طور پر اس کا رواج ہوا ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے دو ایک صورتوں
میں نظم حکومت کی عدیدی شکل اس تمام دور میں قائم رہی لیکن زیادہ تر ہم یہی سنتے ہیں کہ حکومت
کا پلہ کبھی عدیدیت کی طرف جھک جاتا تھا اور کبھی عمومیت کی طرف۔ نیز اجیر سپاہیوں کے کام میں
لائے کی عادت کے باعث اس دور کے موخر حصہ میں مطلق العنانی کو ایک مرتبہ پھر سر اٹھانے کا
موقع مل گیا تھا بعد ازاں مقدونوی غلبہ وشہنشاہی نے شہری سلطنتوں کی موثر خود مختاری کے
دور کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بعد ہمیں یونانیوں کے اعلیٰ دماغ کی جدت طرازی کے وہ آخری
قابل لحاظ ثمر نظر آتے ہیں جنھیں نظام وفاقی کہا جاتا ہے اور تیسری صدی میں جنکی نمایاں
ترقی نے آزاد یونان کی تاریخ کے آخری دور میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دی تھی یہ آخری

دور مقدونیہ کے غلبہ اور یونان کے روما کی حکومت کے تحت میں قطعاً جذب ہو جانے کے درمیان واقع ہوا تھا، اس کی دلچسپی صرف علم سیاست کے مطالعہ کرنے والوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ عام لوگ بھی اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔

حکومت کی ایک شکل سے دوسری شکل کی طرف منقلب ہو جانے کے اسباب پر غور کرنے میں اس وقت تک ہم نے (فتح کو چھوڑ کر) اپنی توجہ زیادہ تر اندرونی اسباب کی طرف مرکوز رکھی ہے لیکن یہ خیال رہنا چاہئے کہ ان اسباب میں معاشی اسباب کو بھی نہایت اہمیت حاصل ہے مثلاً یہ کہ دولت کے روز افزوں عدم مساوات کا میلان یہ تھا کہ ابتدائی نظم سلطنت کا رخ عدیدیت کی جانب پھر گیا جس سے غریب آزاد اشخاص کا انحصار دولتمندوں پر نسبتاً زیادہ ہو گیا اور پھر زیادہ وسیع پیمانہ پر روپیہ کے چلن کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکار قرض لینے لگے جس سے اس عدم مساوات کی آزادی کا احساس بڑھ گیا اور یونان و روما دونوں جگہوں میں ابتدائی عدیدیت کے خلاف تحریکات کا رجحان پیدا ہو گیا۔ نیز ذی امتیاز طبقے سے باہر نو دولتوں کی زیادتی تغیر طلبی کے لئے ایک مزید سبب بن گئی، اور یہ حالت نو آبادیوں اور تجارتی شہروں میں خصوصیت سے زیادہ تھی۔

مگر معاشی اسباب سے علٰحدہ تغیر کی ایک خاص تحریک اس سادے ایقان کے پھیل جانے سے بھی ہوئی کہ "یہ شخص ایسا ہی اچھا ہے جیسا وہ" یعنی جس گروہ کو سیاسی امتیاز حاصل تھا اس گروہ سے باہر کے لوگ بھی ویسے ہی اچھے تھے جیسے اس گروہ کے اندر کے لوگ۔ یہ ایک ایسا ایقان تھا جس کا عملی اثر نئے خیالات کے راستے نکلتے رہنے اور محض رسم و رواج اور عادت کی قوت کے کمزور ہوتے جانے سے برابر طاقت حاصل کرتا رہا اور تمدن کی تدریجی ترقی اور اس قدر کثیر التعداد خود مختار اقوام کے باہمی ربط و ضبط سے رسم و رواج اور عادت کی قوت کا کمزور ہو جانا لازمی تھا۔ عمومیت کے میلان میں یہ ایقان نہایت ہی بدیہی طور پر موثر تھا مگر ہم یہ بھی خیال کر سکتے ہیں کہ نسبتاً زیادہ محدود شکل میں قدیم مداج میں بھی اس کا میلان موجود تھا۔ مثلاً کورنتھ کے مانند مقامات کے متعلق جہاں بادشاہ کے بجائے شاہی خاندان سے سالانہ ایک یا دو حکام کا انتخاب ہوا کرتا تھا، ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان مقامات میں یہ رائے شائع ہو گئی تھی کہ شاہی نسل کا ایک شخص ایسا ہی اچھا تھا جیسا دوسرا، اور شاید (جیسا کہ ایک آرستانی نے اپنے قصہ میں کہا ہے) "ایک حد تک

بہتر بھی تھا" کیونکہ موروثی بادشاہ کی گاہ بگاہ کی ناقابلیت تغیر کے لئے ایک کثیر الشیوع دلیل ہوگئی ہوگی۔ علیٰ ہٰذا جب حاکم اعلیٰ کے عہدے کا دروازہ عام طور پر امرا کے لئے کھول دیا گیا، تو اس سے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ ایقان پھیل گیا تھا کہ قدیم خاندان کا ایک رئیس ویسا ہی اچھا تھا جتنا دوسرا۔

مگر جب ہم بادشاہ یا حکومت کی قابلیت کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اس خط سے پہلے ہی گزر چکے ہیں جو قوم کے داخلی تعلقات کو اس کے خارجی تعلقات سے جدا کرتا تھا کیونکہ قدیم بادشاہ کی قابلیت کا اندازہ بہت کچھ جنگ کے نقطۂ نظر سے کیا جاتا تھا۔ درحقیقت جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ "ایتھنز" میں موروثی بادشاہ کے علاوہ سپہ سالار کا ایک عہدہ قائم کیا جانا ہی حکومت کی عدیدی صورت اختیار کرنے کی کارروائی میں پہلا قدم تھا، اور زیادہ عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات حکومت کی صورت میں تغیر واقع ہونے میں جنگ ایک اہم جزو ہوا کرتی تھی اور دوسری جانب بعض وقت جبکہ قائم شدہ حکومت خود کو قابل ثابت کر دیتی تھی تو جنگ اس کی استقامت کا ایک وسیلہ بھی بنجاتی تھی۔

ہم نے اس پر بھی خیال کیا ہے کہ دیہاتی جماعتوں کے قدیم گروہ کی حالت سے نکلکر شہری مملکت کی طرف ترقی کرنے کے وجوہ میں ایک نہایت درجہ موافق وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے زمانے میں شہر پناہ رکھنے والے شہروں کے اندر حفاظت بہت خوب ہوتی تھی۔

آخری امر یہ ہے کہ یونان کی تاریخ کے آخری مدارج میں وفاقیت کا غلبہ خاصکر اس وجہ سے ہوا کہ اہل مقدونیہ کے شہنشاہی ایران کو فتح کر لینے کے بعد مقدونیہ اور ان بڑی بڑی سلطنتوں سے مقاومت کرنے کے لئے (جو سکندر کی شہنشاہی کے ٹکڑے ہو کر بن گئی تھیں) شہری سلطنتوں کی بہ نسبت زیادہ وسیع سلطنتوں کی ضرورت تھی۔ میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں، کہ جنگ کے موقع پر قوی تر مدافعت کی ضرورت ہی وہ وجہ تھی جو قدیم یونان کی طرح ازمنۂ وسطیٰ اور ازمنۂ جدیدہ کے یورپ میں بھی وفاقیت کے قیام کا باعث ہوئی۔

۲۔ مختصر یہ کہ وہ وقت آگیا کہ شہری سلطنتیں ان وسیع تر سیاسی تنظیمات میں منقلب ہو جائیں، جنھوں نے جدید یورپی تاریخ میں خاص امتیاز پیدا کیا ہے، اور جنھیں ہم ملکی سلطنت کہہ سکتے ہیں؛ تقلیب کے دو طریقے ایسے تھے جن کے ذریعہ سے شہری سلطنتیں ایسی ملکی سلطنتوں میں مبدل ہو سکتی تھیں جو شہنشاہی محض سے ممیز فی الواقع حب وطن کے

جذبات سے متحد ہوں ان میں سے ایک طریقہ تو مساویانہ شرائط پر متفق ہو جانے کا تھا اور
دوسرا توسیع و تجاذب کا اول الذکر ہی وہ طریقہ تھا جو یونانی تاریخ کے اس آخری دور میں رائج
تھا جس دور میں اکائیا اور ایتولیا کی لیگیں مورخین کی خاص توجہ اپنی جانب مائل کرتی
ہیں، اور دوسرا وہ طریقہ ہے جس نے روما کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ساری متمدن دنیا کا سرتاج بن گیا۔
اور جس پر ہم آئندہ کے دو خطبات میں بدقت نظر بحث کریں گے۔ اس تاریخی تقلیب
کی علمی دلچسپی زیادہ تر اس امر میں ہے کہ ان دونوں طریقوں کا باہم مقابلہ کیا جائے۔
جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ دونوں طریقے اس تقلیب کی صورتیں ہیں جو قطعی قدیم
تصور سے (جس کا اظہار Polis یعنے بلدیہ کے لفظ سے ہوتا ہے) اس تصور کی طرف
محول ہوا ہے جس سے ازمنۂ جدیدہ کے لوگ نہایت مانوس ہیں۔ ہم لوگ سلطنت کی
بجائے قرار کے طور پر بالطبع "ملک" کا خیال کرتے ہیں، "شہر" کا خیال نہیں کرتے بلکہ درحقیقت
ہم لوگ لفظ ملک کے استعمال میں بہت آسانی کے ساتھ لغزش کر جاتے ہیں اور اسے
دہرے اور مرکب مفہوم میں استعمال کرتے ہیں، چنانچہ کبھی تو اس سے سطح ارضی کے ایک خاص
حصے سے مراد لیتے ہیں اور کبھی اس سیاسی جماعت (قوم) سے مراد لیتے ہیں جو اس حصہ
ارض میں رہتی ہو اور کبھی ان دونوں مفہوموں کو ملا لیتے ہیں۔ پس جب کبھی جذبۂ حب الوطنی
کو جوش میں لانا یا اس کا پرزور اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے تو سطح ارض کے جس مخصوص حصہ
میں کوئی قوم و ملت آباد ہوتی ہے وہاں کے خصوصیات کو اس معاملے میں نمایاں جگہ دی جاتی
ہے۔ حب الوطنی کے لئے کسی مرکز انہماک کے وضع کرنے کے واسطے تخیل کو اسی تجسیم
کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جب ہم "جزیرۂ نگین بحر" "انگلستان"، "پری تمثال فرانس" یا جرمنی
"پتر دیش" کا خیال کرتے ہیں تو ہم اکثر اپنے اس تصور میں قوم کو ملک سے جدا نہیں خیال
کرتے بلکہ دونوں کو ایک ہی میں ملا دیتے ہیں اور ایک سے زیادہ واقعے ایسے ہوئے ہیں
جن میں اس امتزاج کا یہ اہم سیاسی اثر پڑا ہے کہ کوئی حصۂ ملک جو نمایاں طبعی حدود کے
ذریعے سے باقی قطعۂ ارض سے علیحدہ ہو اس کا ایک ہی سلطنت کی قلمرو ہونا طبعی اور جائز
معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی استعجاب سے خالی نہیں ہے کہ جس طرح ہم جدید زمانے کے لوگوں
کو لفظ "ملک" کے تصور کے عناصر مخلوطہ اس قدر طبعی اور مانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ان
عناصر میں تمیز کرنے کے لئے کسی قدر فکر و کوشش کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح ہم لفظ

"پولس" (Polis) کا تصور نہیں کرتے بلکہ یونانیوں نے اس لفظ کا جو مخلوط تصور قائم کر رکھا تھا اسے مشکل و پیچیدہ سمجھتے ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ زمانہ جدید کے بہت سے لوگ جب یونانی زبان سیکھنا شروع کرتے ہیں تو انھیں کسی قدر حیرت ہوتی ہے کہ جو زبان دقیق و نازک امتیازات سے اس قدر پُر ہو اس میں "بلدیہ" اور "سلطنت" کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہو۔

بہر حال تیسری صدی قبل مسیح کے سیاسی واقعات کی طرح سیاسی خیال کے تغیر و تبدل کی بھی یہ ایک دلچسپ شہادت ہے کہ پولی بیوس کی تاریخ اکائیائی لیگ کی تاریخ میں اکثر لفظ "ایتھنوس" (Ethnos) (قوم) لفظ "پولس" (Polis) کے بجائے استعمال ہوا تھا اور ہر ایک یونانی قوم (Ethnos) کا معمولی دستور سیاسی وفاقی دستور سلطنت ہو گیا تھا، اور اب قوم (Ethnos) ہی جذبہ حب الوطنی کی اولیں موضوع بن گئی تھی۔

۲۔ سرسری قسم کی وفاقیت ابتدائی تاریخ کی مختص خصوصیت ہے، درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونان اور نیز جرمانیہ میں قبائلی حالت میں بڑا سے بڑا سیاسی نظم معاشرت قبائل زیرین یا کینٹن (Canton) کی ایک بہت ہی نامربوط سی وفاقیت ہے جس کا سیاسی اتحاد تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ قبیلہ زیریں یا کینٹن کو ایک طرح پر مواضعات کی وفاقیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہیں سے وہ قدیم طریق "اجتماع" (سیونوسے کیزموس) نکلا جس نے مجموعہ مواضعات سے شہری سلطنت بنادی اسکے بعد یونان میں شہری سلطنت کے نشوونما نے مزید اختلاط کو روک دیا بلکہ آرکیڈیا وغیرہ کی ایسی بعض صورتوں میں تو وسیع تر قومی اتحاد کو بھی روک دیا۔ پس یونان کی تاریخ کے شاندار دور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے پسماندہ حصوں ہی میں وفاقیت کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مورخین سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکائیا و ایتولیائی لیگوں کے علاوہ یونان کے عروج و اقبال کے زمانے میں اس قسم کا ایک اتحاد اہل اکارنانیا اور اہل ایپروس میں بھی موجود تھا اور جس اتحاد کو تاریخی حیثیت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ اہل بیوتیا کا اتحاد تھا۔ لیکن اس آخری مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وفاقیت کی واقعی و موثر ترقی سے کس قدر گہری مخالفت پیدا ہو گئی تھی، اور یہ مخالفت اس زمانے میں اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ سیاسی تہذیب کی ترقی نے جذبہ حب الوطنی کو ایک ہی شہر پر مرکوز کر دیا تھا، یہ جذبہ ہر قسم کے اتحاد کی مخالفت کی طرف مائل نہ تھا کیونکہ دوسرے شہروں کو اپنے زیر فرمان رکھنے میں شہری

سلطنتوں کے احساس سیاسی اور ان کے جذبۂ حب الوطنی میں ایک شان پیدا ہو جاتی اور اس قسم کے موقع سے فائدہ اٹھانے میں انھیں مسرت ہوتی تھی لیکن مساویانہ سطح پر اتحاد و یکجہتی کی جانب سے اسے سخت تنفر تھا اور وفاقیت کی روح در اصل یہی ہے۔ پس جہاں تک ہمیں معلوم ہے بیوٹیا کی لیگ میں چھوٹے چھوٹے شہروں کی حیثیت برابر گرتی رہی، یہاں تک وہ ایک حقیقی وفاقیت کے ارکان ہونے کے بجائے تھیبس کے ماتحت آگئے، اور جنگہائے ایران کے بعد اتھنز نے جو لیگ قائم کی اس کی نشو و نما میں بھی یہی تماشا نظر آتا ہے۔ اس لئے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مقدونوی غلبے کے قبل یونانی جماعت کے انھیں حصص میں صحیح وفاقیت موثر طور پر قائم ہوئی جو زیادہ پسماندہ تھے اور خاصکر ان حصص میں جہاں دیہاتی کینٹن (مجموعہ مواضع) سے بلدیہ کی حالت تک پوری طرح ترقی عمل میں نہیں آئی تھی۔ بقول فریمین ایتولیا کی لیگ موخر متفقی دور میں بھی کینٹنوں (مجموعہائے مواضع) کی لیگ تھی شہروں کی لیگ نہ تھی۔

اس امر کا سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ یونانی نسل کی پسماندہ و قدیم شاخیں اس ارتقا میں اپنے زیادہ کامیاب و مستعد بھائیوں سے کیونکر گوئے سبقت لیگئیں جو قبائل اہل ایتولیا یا اکارنانیا کی سی حالت میں ایک کم آباد ملک میں دیہاتوں کے اندر پھیلے ہوئے تھے، ان کا سیاسی احساس غیر مکمل طور پر ترقی پاتا تھا، اس لئے جسطرح وہ آسانی کے ساتھ متفرق ہو جاتے تھے، اسی طرح آسانی کے ساتھ متحد بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن شہر جو سلطنت کا کالبد مادی تھا اس کے نشو و نما کے ساتھ جس نسبت سے سلطنت کے خیال کی اہمیت بڑھتی گئی اسی نسبت سے اتحاد زیادہ مشکل ہوتا گیا۔

۴۔ اکائیا کی قدیم لیگ انھیں وفاقی اتحادات میں سے نسبتاً غیر اہم شہری سلطنتوں کی ایک لیگ تھی، اس لئے بعد کی لیگ اکائیا کی مخصوص دلچسپی یہی ہے کہ وہ ایسے شہروں کی لیگ تھی جس میں قدیم شہری سلطنتوں کے تفرد کو مغلوب کر دیا گیا تھا اور پھر بھی اس کے ممتاز خصوصیات بدستور باقی تھے، یہ صحیح ہے کہ اسپارٹا اور اتھنز بالکل علٰحدہ رہے اور انھوں نے وفاقیت کو قبول نہیں کیا، اور قبول بھی کیا تو بہت ہی رو ا روی اور برداشتہ خاطری کے ساتھ، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ کورنتھ، میگارا، ارگوس، اور آرکیڈیا کے جدید "شہر اعظم" کے ایسے قدیم امتیاز کی دوسری سلطنتوں نے بطیب خاطر اسے قبول کر لیا تھا

اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ فعل موخر مقدونوی غلبے کے خلاف جدوجہد نے جاری رکھنے کی غرض سے تھا اور یہ جدوجہد ایک وقت میں کسی قدر کامیاب بھی رہی۔

بالفاظ فریمین "یونانی آزادی کا یہ نمونہ مابعد" ۳۲۲ ق م کی (جنگ لامیا) کے چالیس برس بعد میں یعنی ۲۸۱ء سے شروع ہوا اس جنگ کے بعد سے یونانی آزادی کا قدیم دور ختم ہو گیا اور سکندر کے انتقال کے بعد اسی جنگ میں یہ بیکار کوشش کی گئی تھی کہ مقدونیہ کے غلبہ کو برطرف کر دیا جائے"۔ مسٹر فریمین ہی[1] کہتے ہیں کہ "جانشینوں کی لڑائیوں کے اثنا میں یونان متخاصم حکمرانوں کی معرکہ آرائی کا خاص میدان بن گیا یہ ضرور تھا کہ اکثر مختلف شہروں کی خوشامد اور چاپلوسی کی جاتی تھی، چنانچہ پہلے پولیس پیرخوں نے اور اس کے بعد دیمتریوس نے خود کو یونان کے آزاد کنندہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن ان دونوں نے شہروں کو صرف اس لئے آزاد کر دیا کہ وہ خود ان کے مالک بن جائیں۔ عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ یونان کا ہر ایک شہر ایک قلعہ بن گیا تھا جس کے لئے کشاکش برپا تھی اور ان نو دولتوں میں سے جو خالص شخصی جھگڑوں میں یورپ و ایشیا کو ویران کر رہے تھے کبھی ایک کبھی دوسرا ان شہروں پر قابض ہو جاتا تھا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اکائیا کی قدیم لیگ کی تجدید ۲۸۱ء میں ہوئی، مگر شہری سلطنتوں کے تفرد کو زیر کرنے کی شدید کارروائی تیس برس بعد تک شروع نہیں ہوئی، ۲۵۱ء میں سیاسی قابلیت کے ایک شخص ارائوس نے سکیون کے قدیم شہر کو داخلہ کی درخواست کرنے پر راغب کیا، اس وقت تک لیگ کے شہر فرد اً فرد اً بے حقیقت سے تھے مگر سکیون کو تاریخی امتیاز حاصل تھا، اس وقت سے لیگ نے ترقی شروع کی۔ کورنتھ اس میں ۲۴۳ق م میں شامل ہو گیا اور اس کے بعد میگارا اور شمالی مشرقی پیلوپونیز کی دوسری سلطنتوں نے شمولیت کی۔ اس کے بعد ارکیڈیا کے "شہر اعظم" میگالوپولس اور دوسرے شہروں نے شمولیت کی (شہر اعظم کے خودسر حکمراں نے خود انخلاع کر دیا تھا) بعد ازاں ۲۳۰ء میں خودسروں کا خود اپنی مرضی سے مزید انخلاع واقع ہوا اور لیگ میں قدیم شہرت

[1] "حکومت وفاقی" صفحہ ۱۷۷ (طبع دوم)

[2] حسب بالا صفحہ ۱۸۰

رکھنے والے شہر ارگوس کا اضافہ ہو گیا[۱]۔

(سنہ ۲۲۱ ق م میں) اسپارٹا کے ساتھ ایک بد قسمت معرکہ ہونے کے بعد لیگ اکائیا کی کمزوری اور مقدونیہ پر انحصار کا دور شروع ہوا مگر صدی کے ختم ہونے کے قبل پھر اس نے عروج حاصل کیا اور جب روما کی ناقابل مقاومت طاقت نے یونان میں غلبہ حاصل کرنا شروع کیا تو جس طرح شمال یونان میں ایتولیا کی ایک سربرآوردہ سیاسی جماعت کی حیثیت رکھتی تھی وہی حال جنوب میں اکائیا کی لیگ کا تھا اس دور میں ایتھنز سیاسی حیثیت سے کالعدم تھا اور اسپارٹا میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ وہ لیگ کی ہمسری کر سکتا۔

عام الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ وفاقیت کا اساسی اصول یہ تھا کہ جو سلطنتیں اس لیگ کے اندر شامل تھیں وہ لیگ کے باہر کی قوموں کے تعلقات کے لحاظ سے ایک سلطنت ہو جاتی تھیں مگر تمام داخلی معاملات میں وہ اپنی قدیم آزادی اور تعدد کو قائم رکھتی تھیں۔ اکائیا کی ایک قوم تھی اور اس کی ایک قومی جمعیت[۲] تھی جس میں وفاقیت کی ہر ایک ریاست کو ایک رائے کا حق حاصل تھا ایک قومی جماعت عاملانہ تھی اور اس کے ساتھ قومی عدالتیں بھی تھیں جنکی براہ راست اطاعت اکائیا کے ہر ایک شہری پر اسی طرح واجب تھی جسطرح خود مجلس کی اطاعت۔ "کوئی ایک شہر خود اپنے اختیار سے صلح و جنگ یا دوسری سلطنتوں سے معاہدہ نہیں کر سکتا تھا" اور لیگ کے عام قانون کے موافق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی شہر باہر سفیر نہیں روانہ کر سکتا تھا مگر لیگ کے بعد کے زمانہ میں جبکہ غیر رضامند شہر بزور لیگ میں شامل کر لئے گئے تھے، اس قاعدے کی خلاف ورزی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ دوسری طرف ہر ایک شہر کامل آزادی کے ساتھ اپنے سیاسی دستور سلطنت اور اپنے قوانین کا تعین کرتا تھا اور اس میں مرکزی حکومت کی طرف سے مطلق مداخلت نہیں ہوتی تھی لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفاقیت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہو گیا تھا کہ اس کے ایک شہر کے شہری لیگ کے دوسرے شہروں میں شہریت کے ذاتی حقوق میں داخل کر لئے جاتے تھے یعنی وہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے اور جائداد

۱۔ فریمین، حکومت وفاقی صفحہ ۲۰۲ (طبع دوم)

۲۔ فریمین، حکومت وفاقی صفحہ ۲۰۳

غیر منقولہ رکھ سکتے تھے[۱]

قومی حکومت ضابطے کی رو سے عمومی و غیر نیابتی تھی، لیگ کے تمام شہروں کے تیس برس سے اوپر کی عمر کے شہری قومی جمعیت میں شامل ہونے اور اس میں تقریر کرنے کا حق رکھتے تھے اور ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ہر ایک شہر کی واحد رائے اس کے عند الموقع شہریوں کی کثرت رائے سے متعین ہوتی تھی مگر یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کیوں کر محض حالات و ماحول کی قوت سے مجلس نے عملاً پر زور نیابتی و اعیانی حیثیت حاصل کر لی۔ اس سے صرف اس ایک شہر کا عنصر مستثنیٰ تھا جس میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ جمعیت کی حاضری کا معاوضہ نہیں ملتا تھا اور دوسرے شہروں کے زیادہ غریب آزاد اشخاص اپنا وقت اور روپیہ قربان کرنے کے لئے بطیب خاطر آمادہ نہیں ہوتے تھے[۲]

مزید براں، اگرچہ دستور سلطنت کی رو سے مجلس کو سب سے اعلیٰ قوت حاصل تھی مگر بکثرت جلسوں کے منعقد کرنے کی عملی مشکل کی وجہ سے وہ روزمرہ کے معاملات کا اس طرح پر انتظام کرنے سے معذور رہتی جس طرح ایتھنز اور دوسری شہری سلطنتوں کی عام جمعیتیں ان معاملات کا انتظام کرتی تھیں۔ درحقیقت اس کے معمولی جلسے سال میں دو مرتبہ تین تین

ع۱۔ فریمین، حکومت وفاقی صفحہ ۲۰۱۔

ع۲۔ [ایک بولے "مجلس شوریٰ یا سینیات" بھی تھی لیکن ہماری اسناد میں اکثر یہی معلوم ہوتا ہے کہ] مجلس شوریٰ اور جمعیت عملاً مرادف تھیں۔ [پولی بیوس کے بعض ٹکڑوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ دونوں لفظ ہم معنی تھے، بہر نوع میرا خیال یہ ہے کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جمعیت بالعموم صرف "بولے" "مجلس شوریٰ" پر مشتمل ہوتی [دوسرے ارکان اغلباً شریک نہیں ہوتے تھے۔]

ہورٹز وغیرہ کے متعلق جو کچھ ہم سنتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومانیوں کے حلیف کی حیثیت سے بعض یونانی شہروں کی نیم خود مختاری کے موخر دور میں عمومیت کے اور واقعات بھی ایسے تھے جنہیں شہریوں کی عمومیت کی باضابطہ حکومت محض دکھانے کے لئے رہ گئی تھی [ممسرز جمہوریہ حصہ سوم ۵۰۳] ممسرز کے اس بیان کے ساتھ پالیس کے بیان کو ملانے سے اس نتیجے کے نکالنے سے کوئی شخص باز نہیں رہ سکتا کہ مجلس شوریٰ اور جمعیت کے "ارکان" عملاً ایک ہی تھے۔

دن کے لئے ہوا کرتے تھے اور اگرچہ فوری ضرورت کے موقع پر غیر معمولی اجلاس طلب کئے جا سکتے تھے مگر ان اجلاسوں کے طلب کرنے کا اختیار حکام عاملانہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے از خود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دس حکام جو سال بسال منتخب ہوتے تھے اور سپہ سالار کے زیر صدارت (جس کا انتخاب سالانہ ہوتا تھا) جماعتِ عاملانہ کا کام انجام دیتے تھے، ان کو جسقدر اختیار حاصل تھا وہ عملاً اس سے بہت زیادہ تھا جو ایتھنز کے بجز عمومی شہری سلطنتوں میں عام طور پر کسی جماعتِ حکام عاملانہ کے ہاتھ سے انجام پاتا رہا ہو۔

خطبۂ دہم

روما

۱۔ اب میں اپنے موضوع کے اس حصے پر پہنچ رہا ہوں، جس میں علم السیاسیات کے نقطۂ نگاہ سے اس کے ماسبق اور اس کے مابعد ابواب کے مقابلے میں خاص مشکل کا سامنا ہے۔ عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ تاریخ ہمارے سامنے حکومت اور سیاسی نظم معاشرت کی جو شکلیں پیش کرتی ہے ان کی علمی اور محض تاریخی بحث میں فرق یہ ہے کہ خالص تاریخ میں ہمیں اول و اقدم تعلق مخصوص واقعات سے ہوتا ہے اور عام قوانین و طرز ہائے حکومت، اسباب و علل اور رجحانات و میلانات سے غرض صرف ثانوی حیثیت سے پڑتی ہے۔ اس کے برعکس علم سیاسیات میں ہمیں اول و اقدم تعلق عام قوانین و طرز ہائے حکومت سے ہوتا ہے اور کسی خاص واقعے سے تعلق صرف اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ اس شہادت کا ایک جزو ہوتا ہے جس سے ہم اپنے عام نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یونان کی تاریخ کی بحث میں تو اس امتیاز کا قائم رکھنا آسان ہے کیونکہ یونان کی شہری سلطنتوں کے دستوروں سے متعلقہ معلومات میں غور عظیم کے باوجود ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے ہمیں مزید دشواری کے بغیر ان عام نتائج کے اخذ کرنے کا موقع ملجاتا ہے کہ شہری سلطنت کے ارتقا کے مختلف دوروں میں حکومت کے کن کن مختلف طرزوں کے شیوع کی طرف میلان زیادہ تھا اور وہ عام اسباب بھی معلوم ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے سیاسی دستور، حکومت کی ایک شکل سے گزر کر دوسری شکل اختیار کر لیتا تھا۔ مگر جب ہم روما کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس شہری

سلطنت کے شہنشاہی کی وسعت تک پہنچ جانے کا قدم بقدم پتہ چلائیں تو پھر تعمیم کے یہ وسائل جواب دے دیتے ہیں۔ متوسع، جذاب، فاتح و شہنشاہانہ روما تاریخ میں ایک نادر شئے ہے بقول رومانی شاعر کے اس کا کوئی "مثیل و ثانی نہیں ہے" خالص شاہی حکومت کے تحت میں بہت سی عظیم الشان شہنشاہیاں ہو گزری ہیں، مگر ایسی کوئی شہنشاہی نہیں ہوئی ہے جسے جمہوری طرز حکومت کی کسی شہری سلطنت نے قائم کیا اور اپنے قبضہ میں رکھا ہو، اور خود یہ سلطنت اس اثنا میں "ملکی سلطنت" کی وسعت پیدا کرتی جارہی ہو۔ اس لئے ایک ایسے نادر وقوعہ کو زیر بحث لانے میں علم السیاسیات کے لئے جس قسم کی بحث موزوں و مناسب ہے اسے معمولی تاریخ کی بحث سے ممیز کرنا دشوار ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس مشکل میں ہمیں یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے سیاسیات متقابلہ سے مدد لیں، وہ اس طرح کہ ارسطو نے یونانی سیاسی زندگی کے نوع بنوع واقعات کی تحریر و ترتیب کے متعلق جو خیالات مہیا کر دئے ہیں ان کا اطلاق رومانی نظم حکومت پر کریں اور مشابہات و متغائرات دونوں پر نظر رکھیں۔

عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ارسطو نے جن دستوروں کا مطالعہ کیا تھا، ان میں روما بھی شامل تھا، مگر اس کے متعلق اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب کا سب ضائع ہو گیا ہے، اور اس یقین کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس نے اس معاملے پر خاص توجہ مبذول کی ہو اس نے یہ پیش بینی نہیں کی تھی کہ اس کے انتقال کے نصف صدی کے اندر اندر وہ یونانی نوآبادیاں جنھوں نے جنوب و مشرقی اطالیہ کو "یونان اعظم" کے نام سے یونان بنادیا تھا، ۲۷۲ ق م میں، ٹارنٹم کی حوالگی کے بعد وہ سب کی سب بالکلیہ روما کی قلمرو میں داخل ہو جائیں گی، اور پھر اس کی نصف صدی بعد (یعنی ۲۲۹ ق م تک) طاقتور اطالوی جمہوریت" (جو اب بلا رد و کد تمام اطالیہ پر حکمراں ہو گئی تھی) الیریا کے قزاقان بحری کے مقابلے میں یونانیوں کی حفاظت کے لئے مداخلت کرے گی، اور اس لئے وہ خاکنائے کورنتھ کے "کھیلوں" میں اور الیوسیس کے "اسرار" میں یونانی اقوام کی معاشری اتحاد کے رکن کی حیثیت سے باضابطہ طور پر داخل کر لی جائے گی، اور پھر ایک نسل بعد (۲۰۰ - ۱۹۰ ق م) یونان بہ حیثیت مجموعی بڑی سے بڑی دانشمندی اسی میں سمجھے گا کہ مقدونیہ کے مقابلے میں رومانی افواج کا جانبدار ہو جائے اور رومانی سپہ سالار سے جو بہانگ دہل یونانی علم و تہذیب کا مداح

تھا "حکمی آزادی" حاصل کرے، "حکمی آزادی" اس شرط سے کہتا ہوں کہ دونوں الفاظ اجتماع ضدین نہ سمجھے جائیں، پھر اس پر پچاس برس اور گزر جائیں اور رومانی کورنتھ کو تباہ کر کے عملی طور پر یونانیوں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیں۔

مگر ہم سے ان واقعات کا تعلق صرف ثانوی و تحتانی حیثیت سے ہے، ہمارے لئے یہ سوال زیادہ موزوں ہے کہ رومانی دستور سلطنت کو جسطرح ہم جانتے ہیں اگر ارسطو بھی اسی طرح اس کو جانتا ہوتا تو وہ اس کی نسبت کیا خیال قائم کرتا؟ میری مراد اس دستور سلطنت سے ہے جو اس کے وقت میں چوتھی صدی قبل مسیح کے ربع آخر کے ابتدا میں موجود تھا یعنی جبکہ لیکنیو سکستیانی قوانین سے پیٹریشین اور پلیب طبقوں کے طولانی مناقشے کا عملاً خاتمہ ہو گیا تھا اور روما اپنے قریبی ہمسایوں کو مغلوب کر کے اور کسی قدر ان کو اپنے میں جذب کر کے جزیرہ نما میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے سامنیوں سے آخری معرکہ آرائی کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

سب سے پہلے تو اس پر یہ واضح ہو جاتا کہ "آئینی حکومت" کو جس خاص اصطلاح کے طور پر اس نے استعمال کیا ہے، اس کے وسیع ترین مفہوم میں یہ بھی ایک قسم کی "آئینی حکومت" تھی یعنی یہ ایک ایسا سیاسی دستور تھا جس میں اصول عدیدیت و عوامیت کے درمیان ایک طرح کا امتزاج یا توازن پیدا کیا گیا تھا مگر یہ توازن عدیدیت کی طرف مائل اور اس قسم کا تھا کہ اس لفظ کے عام وسیع استعمال میں اسے "اعیانیت" کہہ سکتے تھے کیونکہ معاملات کا عام نظم و نسق زیادہ تر مجلس سینات کے ہاتھ میں تھا، اور اس میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ سب سے پہلے ان لوگوں سے پُر کی جاتی تھیں جو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہو چکے ہوں اور ان عہدوں پر ان کا انتخاب جمعیت قومی کی رائے سے ہوا ہو میرا خیال یہ ہے کہ ارسطو یقیناً اس رائے پر قائم ہو جاتا کہ وہ "معدودے چند" اور "کثیر التعداد" کے درمیان جس قسم کے توازن کو پسندیدہ سمجھتا تھا وہ رومانی نظام سلطنت میں حاصل ہو گیا تھا، کثیر التعداد کو معاملات عامہ کے انتظام کا اختیار نہیں حاصل تھا مگر انھیں اپنے حکام کے انتخاب کرنے اور درآں صورت کہ یہ حکام اپنے اختیارات کو نہایت ناجائز طور پر استعمال کریں ان سے جواب طلب کرنے کا اختیار حاصل تھا اور ارسطو کا خیال یہ تھا کہ اگر لوگ آزاد و قانع شہری رہنا چاہتے تھے، تو ان کے قبضے میں اس اختیار کا ہونا ضروری تھا، مگر یہ توازن

جس طرح حاصل ہوا تھا اس سے اہم اعتبارات سے ارسطو کی رائے اور خیال سے کچھ بھی مناسبت نہ تھی۔

سب سے پہلے تو ارسطو کو یہ ایک بہت ہی عجیب امر معلوم ہوتا کہ جمعیت عام ایک نہیں بلکہ دو تھیں اور دونوں مختلف طریقوں سے مرتب ہوتی تھیں، ایک تو کل قوم کی جمعیت سنتوریوں کے اعتبار سے تھی اور دوسرے پلیبیوں کا جلسہ قبیلوں[1] کے اعتبار سے تھا، ان میں سے اول الذکر کی تنظیم میں موخر الذکر کی بہ نسبت عمومیت کو کم دخل تھا، اس مقدم الذکر کی تنظیم سرویوس تولیوس کی جانب منسوب ہے، اول اول اور غالباً اس زیر بحث زمانہ میں، ایسی تھی جس سے محصول اور فوجی ساز و سامان کا بار ذی املاک اشخاص پر زیادہ پڑتا تھا اور اس کے ساتھ سیاسی اختیار کا زیادہ حصہ بھی انھیں کے ہاتھ میں آجاتا تھا، ان لوگوں کی ترتیب بلحاظ اوصاف جائداد کے زینہ بہ زینہ درجات میں کی گئی تھی، پس اس طرح، فوقیت خوش حال طبقہ کے ہاتھ میں آجاتی تھی، اور وہ رائے بھی اور لوگوں سے پہلے دیتا تھا مگر پلیبیوں کے جلسوں سے قدیم خاندان کے شرفا خارج رکھے گئے تھے، ارسطو کو یہ امر نہایت عجیب معلوم ہوتا کہ جہاں اول الذکر جمعیت کو قنصل، پریٹر اور سنسر کے سے اعلیٰ انتظامی عہدوں کے انتخاب کا حق حاصل تھا، وہیں موخر الذکر (پلیبیوں) کی جمعیت[2] کو بشمول ان خاص حکام کے جو اس کی رہبری کرتے تھے، یہ آئینی حق حاصل تھا کہ حکام سے ان کی مدت ملازمت کے ختم ہو جانے کے بعد محاسبہ کرے اور ان پر جرمانہ کرے، مگر موت کی سزا کا آخری تصفیہ جمعیت سنتوریہ کے لئے محفوظ تھا، مجھے یونان میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہے جس سے حکمراں جماعتوں میں اس قسم کے دو عملی اختیار کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا ہو، ارسطو کی نظر میں ان عمومی حکام کا عہدہ بھی کچھ کم عجیب نہ رہتا جو پلیبین کے جلسہ کی رہنمائی کرتے تھے اور جن کا انتخاب انھیں پلیبیوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا، یہ حکام ٹریبیون کہلاتے تھے، انتظامی اعتبار سے ان کا اختیار اگرچہ بمنزلۂ نفی کے تھا مگر جو کچھ اختیار حاصل تھا وہ بالکل غیر محدود تھا۔ ٹریبیون اثباتی طور پر صرف جمعیت عمومی کے

---

[1] قبائل ابتداءً مقامی و انتظامی حصے تھے جنھیں پلیبیون کی جمعیت کے انتخابات کی وجہ سے سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

[2] Concilium plebis

سرگروہ کی حیثیت سے کام کر سکتا تھا جمعیت سے علحدہ اسے امتناع کا اختیار حاصل تھا امر کا اختیار نہیں تھا، مگر کوئی انتظامی کام ایسا نہیں تھا جو اس کی مداخلت سے رو کا نہ جا سکے، اور ان حکام عوام کے ذریعہ سے جو تحفظ حاصل کیا گیا تھا اسے زیادہ کامل طور پر موثر بنانے کے لئے ٹربیون کی ذات ایک ایسے تقدس سے مامون و مصئون کی گئی تھی کہ کسی دوسرے حاکم کو یہ تقدس نہیں حاصل تھا، ٹربیون جب گفتگو کر رہا ہو اس کی گفتگو میں دخل دینا بھی ایک بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔

لیکن یہ دیکھنا اور بھی زیادہ تعجب خیز ہے کہ قوم کی قانون سازی کا زیادہ حصہ آخر الامر اسی بڑھی ہوئی عمومی جمعیت کے ہاتھ میں آ پڑا، اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اس جمعیت سے پٹریشین (یعنی قدیم خاندان کے شرفا) خارج رکھے گئے تھے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس وقت سے بہت پہلے ایک قانون یہ منظور ہوا تھا کہ اس جمعیت پلیب کی قرار دادوں کی پابندی تمام شہریوں پر عائد ہوگی جن میں پٹریشین بھی داخل سمجھے جو اس جمعیت کے رکن نہیں تھے، اور اگرچہ ارسطو کے زمانہ میں پلیب جمعیت کا یہ تشریعی اختیار ہنوز آئینی حیثیت سے کسی نہ کسی طریقے پر جس کی نسبت مورخین میں باہمی اتفاق نہیں ہے سنیاتی یا پٹریشینی نگرانی کے تابع تھا، مگر بعد میں (یعنی ۲۸۷ق م) یہ قیود رفع ہو گئے تھے اور اس کے قبل کہ روما بلا شرکت غیرے اطالیہ کا مالک ہو جائے پلیبی جمعیت کی تشریعی قابلیت مکمل ہو گئی تھی۔

ارسطو اگر اس نادر آئینی نتیجہ کی تاریخی تشریح کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھتا تو اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ جمہوریہ کی تاریخ کے پہلے دور میں روما کے اندر قدیم خاندان کے لوگوں اور نئے شہریوں یعنی طبقۂ پلیب کے درمیان جس شدت و سختی کے ساتھ کشمکش جاری رہی تھی، یہ اسی کا اثر تھا۔ یہ معرکہ دونوں جانب سے اس شدت کے ساتھ جاری رہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پلیب طبقہ سلطنت کے اندر ایک سلطنت بن گیا تھا۔ اور ان کی خود اپنی جمعیتیں اپنے منتخب کردہ عہدہ داروں کے تحت میں قائم ہو گئی تھیں اور انہوں نے شرفا کو مجبور کر دیا کہ وہ ان عہدہ داروں کا یہ حق تسلیم کریں کہ سنیات یا معمولی حکام کے جس فعل کو یہ عہدہ دار آزار دہ قرار دیں اسے جس حد پر چاہیں روک دیں، اور آخر میں انھیں اس حد تک مجبور کیا کہ ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس پلیبی جمعیت کی قرار دادوں

کو قانونی اقتدار حاصل ہے۔

۲- پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کے ان باہمی مناقشوں کی طولانی و شدید نوعیت اس وجہ سے اور بھی قابل لحاظ ہے کہ شرفا کے مختصر امتیازات کے شکست کرنے کی کارروائی کا ابتدائی زمانہ گزر گیا تھا اور اس جنگ و جدل کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا اور روما ہنوز شاہی حکومت کے تحت میں تھا۔

رومانی قوم کی ابتدائی جمعیت (یعنے مجلس کیوریہ (Comitia curia) کی تنظیم اس طریق پر ہوئی تھی جسے ہم "اُصول عشیرہ" کہہ سکتے ہیں، اور اگرچہ بعد میں طبقۂ پلیب کا دخل بھی اس میں ہو گیا تھا مگر اس کے اندر قدیم خاندانوں کی قوت و طاقت بے بحث و جدل قائم تھی یہ وہی حالت تھی جو ابتدائی عدیدیت کے زمانہ میں عام طور پر یونانی سلطنتوں میں پائی جاتی تھی، لیکن اگرچہ اس جمعیت کا وجود قائم رہا، مگر جمہوریۂ روما کی تاریخ کے کسی وقت میں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسے کچھ سیاسی اہمیت حاصل رہی ہو۔ حکام کے منتخب کرنے، موت کی سزا دینے، اور ابتداءً قانون سازی کے فرائض یہ سب مجلس سنتوریہ کے قبضے میں چلے گئے تھے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں یعنے یہ جمعیت خاندان و عشائر کی جمعیت نہیں تھی بلکہ ان آزاد اراضی داروں کی جمعیت تھی جن پر فوجی خدمت عاید تھی اور اس جمعیت میں پیٹریشین اور پلیب، دونوں تشخیص جائداد کے مطابق طبقات میں ترتیب دئے گئے تھے، تشخیص جائداد کا یہ طریقہ کسی قدر اس طریقے کے مطابق تھا جسے ایتھنز میں سولن کے دستور سیاسی میں اختیار کیا گیا تھا، لیکن اگرچہ جمعیت میں پیٹریشین اور پلیب کا فرق رفع ہو گیا تھا مگر پیٹریشینوں کا یہ حق مختص قائم تھا کہ اعلیٰ حکام کے عہدوں پر انھیں کا انتخاب ہوا کرے اور اس فرق و امتیاز سے آخری طور پر نجات حاصل کرنے میں دو صدی کا زمانہ صرف ہو گیا، قطعی کارروائی ۳۶۷ء میں ہوئی جبکہ لیکینیو سلستیانی قانون کی رو سے مختتم طور پر یہ طے پا گیا کہ دو قنصلوں میں سے ایک ہمیشہ پلیب ہوا کرے گا۔ اسی کشمکش کے ابتدائی حصہ میں یہ ہوا کہ پلیبوں نے اپنے خاص حکام یعنے ٹریبیون کی صدارت

عـ۵ - یعنی اس وقت تک کہ خالص پلیب جمعیت نے توضیع قانون کا متوازی اختیار نہیں حاصل کر لیا تھا۔

ہیں، اپنی خاص جمعیت کی صورت میں اپنے کو منتظم کیا اور ان ٹربیونوں کے لئے مستقل حکومت کے قانون کی ممانعت کر دینے کا حق حاصل کر لیا۔

میرا خیال ہے کہ رومانی تاریخ کے بہت سے پڑھنے والے اس تحیّر میں پڑے ہوں گے کہ اس دستور سلطنت کے تحت میں حکومت کی کل چلنے سے بالکل رک کیوں نہ گئی، اور اس سے بالیقین یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رومانیوں کی قوم ایک ایسی قوم تھی جس میں عجیب و غریب عملی سیاسی قابلیت موجود تھی کہ وہ عملاً ایک ایسی تفہیم باہمی کے چلانے پر قادر تھی جو نظریۃً اس درجہ ناقابل عمل معلوم ہوتی تھی مگر پلیب جب اس آئینی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے اور اپنی پلیبی جمعیت کی قرار دادوں کے لئے قانون کی قوت حاصل کر لی تو پھر اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فتح کو کامل عمومیت کی حد تک کیوں نہ پہنچایا گیا؟ ایسا کیوں ہوا کہ اس کشمکش کے ختم ہونیکے ڈیڑھ صدی بعد تک جبکہ روما بحر روم کے ارد گرد کی دنیا کو فتح کر رہا تھا معاملات کا انصرام حقیقتاً عیانی رنگ میں چلتا رہا؟ اور اس طرح پلیبی جمعیت وضع قوانین کا آلہ بن گئی جو معمولی حالت میں مجلس سینات کی ہمنوائی اور اسی کے زیر اثر کام کرتی تھی، اور ٹربیون کا عہدہ عام مخالفین کی سرگروہی کے بجائے ایک باقاعدہ عہدہ ہو گیا جسے متمول و موروثی امتیاز کے پلیب اس غرض سے حاصل کرتے تھے کہ اس زینہ سے وہ قنفسل کے رتبہ اور مجلس سینات کی رکنیت تک پہنچ جائیں، مختصر یہ کہ مدت تک قومی جمعیت اور اس کے حکام اور عوام کی جمعیت، اور ان کے حکام کے درمیان فرق صرف ایک گزری ہوی مخاصمت کی یادگار کے طور پر باقی رہگیا تھا اور قوم پر عملی حکمرانی شرفا کی تھی۔

میں اسے زیادہ تر بیرونی کشاکش کے دباؤ کی طرف منسوب کرتا ہوں، جن میں اگرچہ انجام کار میں ہمیشہ روما کو کامیابی ہوتی رہی ہے مگر ان کامیابیوں کے لئے بسا اوقات انتہائی کوشش و قربانی کی ضرورت پڑا کرتی تھی، اس قسم کی کشاکش میں حب الوطنی اور جنگی جوش سے کام لینا پڑتا تھا اور اس طرح ان صفات میں غلظت و شدت پیدا ہو جاتی تھی، اور ایک محب وطن و جنگجو قوم میں جو یہ سمجھتی ہو کہ اس کی رہبری خوبی و کامیابی کے ساتھ ہو رہی ہے، موجودہ حکومت کی اطاعت کی عادت قوت پکڑتی جاتی ہے۔

مگر میرا خیال ہے کہ اس انقیاد کی توجیہہ کا ایک اہم جزو اس زمانہ کے رومانی

طبقہ پلیب کی ایک دوسری خصوصیت میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اتھنز کے عامۃ الناس سے نہایت نمایاں طور پر ممیز ہو جاتے ہیں۔ وہ خصوصیت یہ تھی پلیبی جمعیت میں رایوں کا فیصلہ افراد کی کثرت سے نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ فیصلہ اس تقسیم کے مطابق ہوتا تھا جو ابتداءً مقامی و انتظامی تقسیم تھی اور جسے قبائل کہتے تھے، اس تقسیم کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ دیہاتی عنصر نہایت قطعی طور پر خالص شہری عنصر پر غالب آجاتا تھا۔ یہ کہنا حد سے تجاوز کرنا نہیں ہے کہ روما کی کامیابی کا بہت بڑا سبب یہ تھا کہ خوش نصیبی سے سلطنت کی ہیئت ترکیبی میں شہری دیہاتی عناصر کا توازن ایک خاص خوبی کے ساتھ قائم تھا۔ ایک طرف لاطیوم میں روما کی بلند حیثیت تھی جس سے پہلے تو اسے لاطینی عہد نامہ کی سرگروہی حاصل ہوگئی اور پھر بعد کو اس سے وہ اس قابل ہوگیا کہ دوسری لاطینی قوموں کو اپنے میں جذب کرلے، اس بلند حیثیت کی بنا یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریائے ٹائبر پر اس کا محل وقوع ایسا تھا جو تجارت کے لئے موزوں تھا، اس سے روما میں شہری زندگی کو اس حد تک وسعت حاصل ہوئی کہ کوئی دوسرا لاطینی شہر اس کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا[1]۔ دوسری طرف روما کے سیاسی نظم میں خالص شہری عنصر خاص طور پر دبا کر رکھا گیا تھا کم از کم جمہوریت کے زوال کے شروع ہونے تک تو یہی حالت تھی۔ ابتداءً جمعیت قبائلی میں حق رائے دہی ملکیت اراضی پر مشروط تھا، رومانی شہری جن کثیر التعداد قبائل میں تقسیم تھے (اور جو جمہوری دور میں بڑھتے بڑھتے پینتیس تک پہنچ گئے تھے)، ان میں سے ابتدائی شہری آبادی صرف چار قبائل تک محدود تھی اس کے بعد شہر کی ترقی کے ساتھ قوم کے بے زمین ارکان کو جمعیت میں شامل کرنا پڑا تو ایک وقت تک وہ انھیں چار شہری قبائل تک محدود رہے اور اس وجہ سے یہ قبائل امتیاز میں دوسرے قبائل سے پست ہو گئے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کے آخور بن گئے تھے جن میں آزاد آبادی کے سب سے زیادہ نفرت انگیز اجزا (یعنی وہ آزاد شدہ اشخاص جن کے پاس ایک معینہ مقدار سے کم زمین تھی) مجتمع ہو گئے تھے پس جمہوریت کے زمانۂ عروج میں روما کے پلیب کا لا اس قسم کے تھے جیسے لوگ ارسطو

---

[1]۔ روما کی شہری مرکزیت کی وجہ سے سابینیوں کے بالمقابل لاطینیوں کو جو عظیم سیاسی قوت تحریک حاصل ہوگئی تھی اسے مومسن نے موثر طور پر دکھایا ہے۔

کے خیال میں معتدل یا آئینی جمہوریت کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ ایسے لوگ بھی دہقانی کاشتکار تھے جو حکمرانی کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ صرف مفسدۂ حکومت سے مامون رہنا چاہتے تھے، اور ہم اس میں ایک اور اضافہ کر سکتے ہیں جو ارسطو کی رسائی ذہن سے خارج تھا، وہ یہ کہ صرف رومانیوں ہی کے ایسے عامۃ الناس سے (جو تلوار کے زور سے فتح کرتے مگر اپنے فتوحات پر ہل کے ذریعہ سے قابض رہتے تھے) یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک شہری سلطنت کو ایک مضبوط شہنشاہی ملکی سلطنت تک وسعت دیدینا ممکن کر دکھائیں۔

پس اس طرح یہ ہوا کہ جب ایک طولانی کشمکش کے بعد رومانی قوم نے اپنے حکمراں طبقہ پر قیود و نگرانی کا ایک ایسا موثر نظم قائم کر دیا جس کی نسبت یونانی تشبیہوں کی رو سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ باغلب وجوہ وہ کامل عمومیت تک پہنچ جائے گا اس وقت وہ دو صدیوں تک اس نقطہ پر ٹھہر گئے جس نے مغربی تمدن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ انھوں نے معاملات کے انصرام کو ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جنھیں ارسطو کے اور نیز ہمارے مفہوم میں اعیانی جماعت کہنا چاہئے[۱]

۳۔ حکمران جماعت کی ہیئت ترکیبی اور محکوم کے ساتھ اس کے تعلقات کے متعلق، رومانی تاریخ کے مختلف دوروں کے درمیان غور و فکر کے ساتھ فرق قائم کرنا چاہئے بادشاہی کے زوال[۲] کے پچاس برس بعد تک رومانی تاریخ میں جو کشمکش زیادہ نمایاں رہی، وہ پٹریشین اور پلیبین طبقوں کی کشاکش تھی مگر یہ کشمکش معدودے چند اہل دولت اور کثیر التعداد غرباکے درمیان ایک سیدھا سادہ معرکہ نہیں ہے۔ ایک حدتک ایسا ہے مگر ایک بالکل ہی مختلف کشمکش سے اس میں پیچیدگی پڑ گئی تھی، یہ کشمکش قدیم و جدید خاندانوں

[۱]۔ میں ایک مختص خصوصیت کا ذکر کر سکتا ہوں جس کے لحاظ سے رومانی حکومت (جبتک کہ وہ فتح کے اثر سے پست اخلاق نہیں ہو گئی اس وقت تک) وہ ارسطو کے اس تصور کے مطابق تھی جو اس نے عددیت کے بالمقابل اعیانیت کے متعلق قائم کیا تھا، یہ خصوصیت پاکیزگی و سادگی اخلاق سے انکا تعلق ہے اور قانون و احتساب کے ذریعہ سے عیش پرستی کے روکنے کی کوشش تھی کہا جاتا ہے کہ ۲۷۵ ق م میں ایک شخص جو دو مرتبہ قنصل رہچکا تھا سینات سے اس وجہ سے خارج کر دیا گیا کہ اس کے پاس کثرت سے چاندی کے ظروف تھے

[۲]۔ جس طرح شاہی سے جمہوریت کا قالب اختیار کرنے کی صحیح نوعیت غیر متیقن ہے، اسی طرح اس زوال کی تاریخ بھی غیر متیقن ہے۔

کے درمیان تھی یعنی دولتمند پلیبی یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ سرکاری امارتوں اور عہدوں میں وہ اپنا حصہ حاصل کر سکیں۔

اس کی بہت نمایاں توضیح و تشریح لیکینیو سکتیانی قوانین سے ہوتی ہے (جنکا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے اور) جو دس برس کی سخت معرکہ آرائی کے بعد ۳۶۷ق م میں منظور ہوئے تھے، انھیں قوانین سے پیٹریشین اور پلیبیوں کی کشاکش میں نہایت اہم دورِ نو قائم ہوا، ایک طرف تو ان قوانین کا مقصد یہ تھا کہ دو بلند ترین عہدہائے سرکاری یعنے مناصب قنقصل میں سے ایک عہدہ قدیم خاندانوں کے محدود گروہ کے باہر کے شہریوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے دوسری طرف اس کی غرض یہ تھی کہ سرکاری املاک پر کسی ایک شہری کو جس قدر بھیڑ بکری یا دوسرے مویشی چرانے کا اختیار ہو، اور جس قدر سرکاری زمین کسی ایک شخص کے قبضے میں رہ سکے اسے محدود کر دیا جائے اصولاً تو یہ قبضۂ اراضی عارضی ہوا کرتا تھا مگر عملاً دائمی ہو جاتا تھا اور اس طرح دولتمند شہری سرکاری زمین کو اپنے تصرف میں کر لیتے تھے۔ نیز یہ بھی غرض تھی کہ مالکان اراضی کو مجبور کیا جائے کہ غلاموں کے ایک خاص تناسب سے آزاد مزدوروں کو بھی کام میں لگائیں، اور نیز یہ کہ قرضداروں کو ان کے قرض کے پورے بار سے اس طرح سبکدوش کیا جائے کہ سود میں جو رقم دیجا چکی تھی اسے اصل میں وضع کیا جائے۔ ضوابط کے اس مجموعہ میں صاف طور پر دو متضاد عناصر شامل تھے، ایک عنصر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نودولت قدیم خاندان والوں سے معرکہ آرا تھے اور دوسرے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غربا، امرا سے برسرِ جنگ تھے۔ چھوٹے چھوٹے دہقانی کاشتکاروں کا جمِ غفیر یہ چاہتا تھا کہ اسے آزار رساں حرفتی مقابلہ اور بڑے سرمایہ داروں کی مداخلت سے نجات ملجائے دوسری طرف لیکینیوس اور دوسرے سربرآوردہ پلیب اس فکر میں سرگرداں تھے کہ اعلیٰ عہدوں میں ان کے داخل ہونے کا راستہ کھل جائے۔ اس حیرت انگیز واقعے کے بیان سے متضاد عناصر کے اجتماع کا نقش اور بھی دل پر جم جاتا ہے کہ لیکینیوس ہی وہ پہلا شخص تھا جو اپنے ہی مقرر کردہ قانون کی حد اجازت سے زیادہ زرعی زمین پر قابض ہونے کا مجرم پایا گیا۔

اس لئے ہمیں اس امر کے معلوم ہونے سے کچھ حیرت نہیں ہوتی کہ جب فتح ہو گئی تو پھر سربرآوردہ پلیبیوں نے قدیم امرا کے ساتھ اتحادِ عمل اختیار کر لیا اور اس طرح

ایک نیا طبقہ امرا کا بن گیا جس میں اعزاز اعلیٰ پر نشین نسل میں ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسے اسلاف کی اولاد ہونے کی وجہ سے عطا ہوتا تھا جو اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اس میں کبھی بھی اس حد کی بندش نہیں ہوئی جو قدیم خاندان میں تھی پست رتبہ نسل کے قابل افراد کو موقع حاصل ہو گیا تھا اور وہ اپنی سعی و کوشش سے عہدۂ قنصل تک پہنچ سکتے تھے خاصکر پلیبیوں کے لئے عہدۂ قنصل پر فائز ہونے کی اجازت کی پہلی صدی میں [جبکہ روما اطالیہ کو فتح کر رہا تھا (۳۶۰-۲۷۲ ق م)] تاہم فی الجملہ معدودے چند حکمراں افراد کا میلان نمایاں طور پر موروثیت ہی کی طرف تھا اور بتدریج ایک ایسی صورت حالات پیدا ہو گئی جس میں "قنصلی" و "سینیاتی" خاندانوں کے اسلاف سرکاری عہدوں اور سینیات کی خالی جگہوں کو بلا شرکت غیرے تنہا اپنے قبضہ میں تو نہیں کر لیتے تھے مگر اس کے شریک غالب بن جاتے ہیں[۱]۔

یہی نیا طبقۂ امرا ہے جو اس طرح پر مرتب ہوا تھا اور جس کی نمائندگی مجلس سینات کے ذریعے سے ہوتی تھی، وہی اس زمانے میں جب روما اپنے فتوحات سے شہنشاہی کی طرح اس کے انصرام معاملات پر حاوی و غالب تھا لیکن اگرچہ یہ حکومت غالب طور پر عدیدی حکومت تھی تاہم یہ ان "معدودے چند افراد کی حکومتوں" میں کسی حکومت کے مشابہ نہیں تھی جن کا ذکر ارسطو نے کیا ہے۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ روما کے آئینی نظریئے میں آزاد شہریوں کی جمعیت اپنی مخصوص دہری صورت میں، قوم میں سب سے اعلیٰ صاحب اقتدار کی حیثیت سے قائم رہی اور اسے اپنے اقتدار اعلیٰ کا پورا ادراک و احساس بھی تھا۔ جمعیت سنتوریہ قنصلوں، پریٹروں اور سنسروں کا انتخاب کرتی تھی اور کبھی عوام کا کوئی امیدوار طبقۂ امرا کی خواہش کے خلاف کامیاب بھی ہو جاتا تھا اور جب عملاً حکمرانی کرنے والے ذی اقتدار اشخاص کے درمیان کوئی شدید تصادم پیدا ہو جاتا تھا تو قومی جمعیت آخری عدالت مرافعہ کا بھی کام دیتی تھی۔ جارحانہ جنگ کے اعلان کرنے کا حق ہمیشہ تنہا اسی کو حاصل رہا اور مجلس سینات کی یہ عادت تھی کہ صلح و مخالفت کے مشکل و نامطبوع مسائل اسی

---

[۱] ۔ پالس، فاتح مقدونیہ اپنی لیاقت کی وجہ سے منتخب ہوا تھا، اوس کے بابت ماسن کہتا ہے کہ یہ ۱۶۸ ق م کا ایک نادر واقعہ تھا

کے سامنے پیش کرتا تھا۔ تمام نئے قوانین یا اس جمعیت سے منظور ہوتے تھے یا پلیبیوں کی جمعیت قبائل سے، اگرچہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں قانون سازی کا کام زیادہ تر پلیبی جمعیت میں انجام پاتا تھا اور اس واقعے سے حیرت انگیز طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس سینیات کا اختیار عوام کی رضا جوئی اور انھیں کے قابو میں رکھنے سے قائم رہتا تھا نہ کہ انھیں دھمکی دینے اور سیاسی حقوق سے خارج کرنے سے۔ اگرچہ پیٹریشنیوں اور پلیبیوں کے قدیم تنازعات عملی طور پر ختم ہونے اور ٹائی بیریس اور گائیس گراکھوس کے آغاز کردہ انقلابی دور کے درمیان تقریباً دو پر از اہمیت صدیوں تک عملاً سینیات ہی اکثر و بیشتر حالات میں یہ تصفیہ کرتی تھی کہ کیا قوانین منظور ہونا چاہئے لیکن اسے سہولت اسی میں معلوم ہوتی تھی کہ وہ اس کام کو خصوصیت کے ساتھ پلیبی جمعیت اور پلیبی حکام کے توسط سے انجام دے (غالباً اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی کارروائیوں کے متعلق عوام کی مخالفت رک جائے) اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وقتاً فوقتاً اس سے دب کر ایسی کارروائیوں کے منظور ہو جانے کی اجازت دینا پڑتی تھی جو اعیان کے مذاق کے موافق نہیں ہوتی تھیں، اگرچہ ہر ایک ٹریبیون کا یہ اختیار کہ وہ دوسرے ٹریبیون اور دوسرے حکام کے افعال کو روک سکے، اس کارروائی کے روکنے کے لئے ایک قابل قدر آئینی ہتیار تھا۔

۴۔ لیکن یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا وجہ ہوئی کہ غربا اور امرا کا وہ قدیم تصادم جو پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم طبقۂ امرا اور پلیبیوں کی کشاکش میں ایک نمایاں مستقر بنا ہوا تھا، تیسری اور دوسری صدی میں فضیلی اور سینیاتی خاندانوں کی نئی اعیانی حکومت کے دور حکمرانی میں اسی طور سے جاری نہیں رہا؟ کیوں یہ تصادم اس وقت تک کے لئے فرو ہو گیا جب تک کہ دوسری صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں برادران گراکھی نے انقلاب کی روح کو برانگیختہ کیا؟

اس کا جواب ان مسلسل کامیاب لڑائیوں کے نتائج میں ملیگا جنھیں روما نے اس دور میں برپا کر رکھا تھا، کیونکہ فتح کے اوس دور میں رومانی حکومت نے زرعی بد دلی کو جس تدبیر سے اوپری اوپر اوڑا دیا اسی تدبیر سے اس نے اس پیچیدہ و سخت مسئلہ کو بھی حل کر لیا کہ کیونکر ایک شہری سلطنت ایک وسیع شہنشاہی کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھ سکتی ہے (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) اطالیہ کو رفتہ رفتہ زیر کیا گیا تھا

اور اس کارروائی کے اثنا میں روما کا طریق عمل یہ تھا کہ مفتوحین سے ان کی زمین کا ایک حصہ بھی بزور لے لے۔[1] یہ زمین اولاً قوم کی ملک ہوتی تھی اور اس کے بہت بڑے حصے برائے نام لگان پر امرا کے قبضہ میں چلے جاتے تھے، پھر بھی کبھی کبھی نئے فتح کردہ سرزمین کے بہت ہی وسیع قطعات رومانی شہریوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے اور اس پر انھیں کامل حقوق ملکیت حاصل ہوتے تھے کلیتہً نہیں مگر ایک بڑی حد تک نوآبادی قائم کر کے ایسا کیا جاتا تھا لیکن اس میں اور یونان کی معمولی نوآبادیوں میں فرق ملحوظ رکھنا چاہئے کیونکہ یہ آبادکار کسی نئی خود مختار سلطنت کی خشت اول کا کام نہیں دیتے تھے۔[2] کبھی یہ لوگ کامل الحقوق رومانی شہری رہتے تھے، اور اکثر ان کی حیثیت وہ ہوتی تھی جو قدیم ایام میں لاطیوم کے باشندوں کی تھی جو روما کے شہری نہیں تھے، یعنے وہ بعض امتیازات کی وجہ سے روما کے دوسرے تابع حلیفوں سے ممیز تھے۔ ان امتیازات میں سب سے زیادہ اہم امتیاز یہ تھا کہ کسی لاطینی نوآبادی میں کسی عہدے پر فائز ہونے سے رومانی شہریت کے حقوق حاصل ہو سکتے تھے۔ اس طرح ان شہروں کے سب سے زیادہ قابل اور پرحوصلہ عناصر (روما کی) حاوی و غالب شہری سلطنت میں برابر جذب ہوتے رہتے تھے کچھ تو اسطور پر اور کچھ زبان و نسل کی یکجہتی کے احساس سے ان لاطینی نوآبادیوں کا ربط روما کے ساتھ (خاصکر) اس کی سخت ترین وقت کے وقت (یعنی ہانیبال کے حملے کی تاریک ترین ساعت) میں کافی مضبوط ثابت ہوا۔ پس لاطینی نوآبادیوں، نیز وہ رومانی شہری جو بدستور اس حال میں رہے، ان سے قلعہ نشین فوج کا ایک زبردست جال بچھ گیا تھا اور یہ سب رومانیوں کی مشہور عالم فوجی سڑکوں کے ذریعہ سے ملے ہوئے اور اطالیہ کے دیگر حصص میں رومانی تسلط کو قائم کئے ہوئے تھے معہذا وہ ایسے مرکز بن گئے تھے جہاں سے لاطینی زبان اور لاطینی تہذیب بتدریج تمام جزیرہ نما پر پھیلتی جاتی تھی۔ پس جس تغیر نے کنار ٹائیبر کی شہری سلطنت کو ایک ایسی ملکی سلطنت میں بدل دیا جو تمام اطالیہ پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سیاسی دستور کی اس صورت کو بھی قائم رکھا جو ایک شہری

---

[1] معمولاً ایک ثلث، اگرچہ اس مقدار میں فرق ہوتا رہتا تھا، کبھی کبھی تو کل زمین ضبط ہو جاتی تھی۔

[2] یہ لوگ اتھنز کے "کلیروخیوں" کے مشابہ تھے۔

سلطنت کے لئے موزوں ہے، یعنے رومانی شہریوں کی جمعیت جو روما کے بازار میں جمع ہوتی تھی آئینی طور پر بدستور حکومت کی اعلیٰ کارکن بنی رہی، اس تغیر کی نمایاں و نادر کاروائی میں ان آبادکاروں نے بھی اہم حصہ لیا۔

نیز جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ رہا تھا یہ نو آبادیاں ایسے منافذ تھے جنکے ذریعہ سے وہ زرعی مطالبات رفع کئے جاتے رہے، جو وقتاً فوقتاً ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں میں پیدا ہو جاتے تھے جن سے رومانی جمعیتوں اور فوجوں کا حصۂ کثیر مرتب تھا، چنانچہ کبھی کبھی اس مطالبے کا کچھ حصہ یوں پورا کر دیا جاتا تھا کہ بغیر فوجی خدمت کے سرکاری زمین کے کچھ قطعات انھیں دے دئے جاتے تھے۔

لیکن رومانی آبادکاروں کی حیثیت و حالت نقصان سے بھی پاک نہیں تھی یہ خود ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ اول تو جن مقامات پر وہ بھیجے جاتے تھے وہاں کے قدیم باشندوں سے ان کے تعلقات کسی طرح بھی دوستانہ نہیں رہتے تھے۔ یہ قدیم باشندے زیادہ تر جبراً رومانی سلطنت کے رکن بنائے جاتے تھے مگر سیاسی اختیارات انھیں حاصل نہیں ہوتے تھے اور یہ امر کچھ بھی تعجب انگیز نہیں ہے کہ ہم کبھی کبھی یہ سنتے ہیں کہ کسی نو آبادی نے بغاوت کر کے ان رومانی دخیلوں کو قتل کر ڈالا یا انھیں خارج کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ قدیم باشندے نئے شہریوں سے متفق ہو گئے اور اکثر انھیں حق شہریت (Suffragium) مل گیا، پس اس طرح رومانی سلطنت دو قسم کے شہریوں پر مشتمل ہو گئی ایک تو وہ دائمی جماعت تھی جو روما کے گرداگرد قطعات پر آباد تھی اور نئے انجذاب سے برابر وسعت پذیر ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس انتہائی حد پر پہنچ گئی کہ شہری سلطنت کے اردگرد کے قطعۂ ارض کو وسیع کرنا ممکن نہ ہو گیا دوسرے نو آبادیوں کا جال تھا جس کے باشندے تمام حالتوں میں تو نہیں مگر بعض حالتوں میں رومانی شہریوں کے پورے سیاسی و ملکی حقوق کو محفوظ رکھتے اور انھیں اپنے ورثا کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے۔ البتہ سیاسی حق شہریت اس وقت تک عملاً معطل رہتا تھا جبتک کہ یہ لوگ نو آبادیوں میں قیام پذیر رہتے لیکن اگر کبھی وہ روما میں منتقل

ہوجاتے تھے تو اس حق سے وہ کام لے سکتے تھے۔

پس اس طرح مفتوح باشندوں کو جذب کرنے اور خود اپنی جماعت کی توسیع کا موقع نکالنے کی دہری دہری کارروائی سے کنارِ تائبر کی آبادکاری بڑھتے بڑھتے ایک ایسی سلطنت بن گئی جس میں دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں ۲،۴۰۰۰ ہتیار بند شہری ہتیار اٹھانیکے قابل موجود تھے ارسطو کی نظر میں تو یہ ایک ہیبت ناک سلطنت تھی۔

اس حد پر پہنچکر اس کی ترقی کچھ زمانے کے لئے رک گئی بلکہ عارضی طور پر ترقی معکوس ہوگئی ۱۸۰ ق م کے بعد ہم باستثنائے پیکے نوم کی ایک نوآبادی ۱۵۷ ق م کے اور کہیں بھی قطعات زمین کے عطا کئے جانے کا حال نہیں سنتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اطالیہ میں اب تقسیم کے لئے سرکاری زمین باقی نہیں رہی تھی بجز اس کے کہ جو متمول اشخاص کے قبضہ میں تھی اور یہ لوگ بغیر سخت کشاکش کے اس کے دینے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے مگر زمین کے لئے غریب تر شہریوں کا مطالبہ بدستور جاری تھا اور یہی مطالبہ توسیع کیلئے ایک اہم معاشری سبب تھا، پس جب انقلاب کی صدی شروع ہوئی، جو تائبریس گراکوس کے ٹربیون مقرر ہونے کے وقت سے جنگ ایکٹیم تک جاری رہی، اور جو جنگ وجدل، ابتری و مصیبت، حیران و پریشانی ظلم و خونریزی کی صدی تھی، اور جس میں سے گزر کر جمہوریہ نے نئی اس شہنشاہی کی صورت اختیار کی جو مشرق میں کسی نہ کسی صورت میں ازمنۂ جدیدہ کے عین آغاز تک چلتی رہی، تو جس سوال سے انقلاب کی اس صدی کا آغاز ہوا وہ وہی پرانا زرعی سوال تھا جو پٹریشنیوں اور پلیبیوں کے درمیان موضوع کشمکش رہچکا تھا گراکوس کا زرعی قانون سمپرونیا لیکینیوس کے زرعی قانون کی تجدید تھی جو تقریباً ڈھائی صدی قبل منظور ہوچکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قانون سمپرونیا کے عمل میں لانے میں وسیع قطعات ارض تقسیم کئے گئے تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ برسوں کے اندر اندر ہتیار اٹھانے کے قابل شہریوں کی تعداد چار لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ توسیع کی روایتی روش کے مطابق اب مزید وسعت کا امکان دشوار تھا، اب دوسرا اقدام صرف یہی ہوسکتا تھا کہ دوسرے اطالیوں کو جو اس وقت تک زبان و تہذیب میں بالکل ہی رومانی آبادکاروں کے برابر لاطینی ہوگئے تھے اور رومانیوں کے امتیازات ان محروم الحقوق اشخاص کی نظروں میں خلاف عقل و انصاف

ہوئے تھے اُنھیں بھی حقوق شہریت میں داخل کر لیا جائے یہ کارروائی دوسری صدی کے اختتام کے بعد ہی بہت جلد شروع ہو گئی تھی مگر روما کو جبراً اسے خانہ جنگی کے نتیجہ کے طور پر اختیار کرنا پڑا اور اسباب و نتائج کے اعتبار سے اس کا تعلق انقلاب کی طولانی کارروائی سے ہو گیا تھا

۵ - یہ امر میرے احاطۂ فرائض میں داخل نہیں ہے کہ میں اس انقلاب کی کارروائیوں کے ہر جزو کو بیان کروں تاہم میں اس کے بعض خاص صور و اسباب کا مختصراً ذکر کروں گا -

اول یہ کہ اس تمام طول طویل تماشہ کے ہر ایک ایکٹ میں ژرف نگاہ مبصر کو بہت صاف نظر آجاتا ہے کہ جو چیز شکست ہو رہی تھی وہ خالصتاً عدیدیت یا اعیانیت کی حکومت نہیں تھی بلکہ وہ ایک ایسی عدیدیت کی حکومت تھی جس کی معمولی اعلیٰ کارکن جماعت (یعنی مجلس سینات) اپنے تمام دور حکمرانی میں ایک عمومی جمعیت کے آخری اقتدار اعلیٰ اور اس کے منتخب کردہ حکام کے عاملانہ اختیار کو تسلیم کرنے پر مجبور رہی تھی لیکن فی الواقع اس نے پھر اس جمعیت سے عملاً یہ کام لیا کہ اسے قانون سازی کا خاص مرکز بنائے رکھا۔ "اطاعت کی عادت" جس پر تمام منتظم و باامن حکومتوں کا مدار کار ہوتا ہے اس کی کیفیت رومانی سلطنت میں یہ تھی کہ لوگ ان قوانین کی اطاعت کے عادی ہو گئے تھے جو پلیبیوں کی جمعیت قبائلی نے اپنے ٹربیونوں کی تجویز پر منظور کئے ہوں، یہ عادت ویسی ہی مستحکم تھی جیسی سینات کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی عادت تھی پس جبکہ سینات کو انقلاب کے خلاف روایتی امن و نظم کو بحال رکھنا تھا ایسی حالت میں بالتخصیص رومانیوں کی سی آئین پذیر قوم میں یہ امر واقعہ ایک اساسی اہمیت رکھتا تھا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انقلابی دور کے آغاز میں جب ایک متمرد ٹربیون ٹائبریس، گراکوس نے امرا سے سرتابی کی اور اس کی سرگروہی میں جمعیت عوام امراء کے قابو سے نکل گئی اور ان کے مقاصد کے خلاف بیخ کن تجاویز منظور کیں تو کیوں اس پر غرور طبقہ امرا میں جو بظاہر اپنی قائم شدہ قوت اور روایتی اختیار میں اس درجہ مستحکم و مضبوط معلوم ہوتا تھا براہ راست مقاومت کی ایسی حیرت انگیز کمی نظر آئی۔ وجہ یہ تھی کہ بلاواسطہ مقاومت یعنی ٹربیونوں پر ہاتھ ڈالنا یا ایسی جمعیت کی مرضی سے بجد و کد مخالفت کرنا جس کا تشریعی اختیار ان کے انتظامی اختیار ہی کے طرح مسلم و قدیم تھا یہ خود

انقلاب کے ہم معنی ہو جاتا۔ اور نظم و امن کے حامی ہونے کی حیثیت سے انھیں جو فوائد قابضہ حاصل تھے انھیں باطل کر دیتا۔ انھوں نے عمومی وضع قوانین کے سیل کو اپنے سر سے گزر نے دیا اور اپنے موقع کے انتظار میں لگے رہے جب گراکھوس کے ایسے لوگ ٹربیون نہیں رہے تو پھر انھوں نے سخت انتقام لیا مگر اس وقت بھی اس کی جرات نہ ہوئی کہ عوام کے وضع کردہ قوانین کے نہایت ہی اہم جزو کو بدل دیں۔

جمہوریت سے بادشاہی تک تغیر پذیر ہونے کی طولانی کارروائی نے جو صورت اختیار کی اس کے متعین کرنے میں یہ سیاسی حالت ایک اہم جزو تھی مگر جن اسباب نے اس تغیر کو لابدی بنا دیا تھا وہ حکمران طبقہ کی اخلاقی حالت کی گرانی میں مضمر تھے۔ وہ امرا، جن میں اتنی ہمت و دانائی موجود تھی کہ بحر روم کے اردگرد کے متمدن رقبہ کو فتح کر لیں ان میں اس وقت جبکہ یہ ممالک فتح ہو گئے اتنا ضبط نفس باقی نہیں رہا کہ وہ اس پر انصاف کے ساتھ حکمرانی کرتے۔ پرہوس کے سفیر نے جس جماعت کو شاہوں کی مجلس کہا تھا وہ اب بڑی حد تک وقت پرست و طامع جفاکاروں کا غول بن گئی تھی مگر یہاں بھی اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان کی حکومت کے حالات ایسے تھے کہ ان کی خرابی کے ساتھ جمعیت عوام کی خرابی بھی لازم و ملزوم تھی۔ ہم جب تاریخ کے اس تاریک باب کو پڑھتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف عدیدیت میں پستی آگئی تھی بلکہ ایک ہنوز نارسیدہ عمومیت میں بھی ابتذال پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی قوت کو قائم رکھنے کے لئے صوبوں کے غارتگر اپنی غارتگری میں سے مٹھیاں بھر بھر کر ابنائے وطن کے دامنوں میں ڈالتے جاتے تھے اس کی صورتیں یہ تھیں کہ تفریحوں اور نمائشوں میں روز افزوں شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ غلہ اول اول تو کم نرخ پر اور بعد میں بالکل ہی برائے نام قیمت پر تقسیم ہونے لگا اور انتخابات کے موقع پر بڑی بڑی رقمیں رشوت میں دیجاتی تھیں بس اس طرح پر (اور خاصکر غلہ کی تقسیم سے جبکہ یہ تقسیم باقاعدہ اور فی الاصل مفت ہو گئی تھی) صاحب عزم، ایماندار اور فوجی طبیعت رکھنے والے کاشتکار شہریوں کی وہ قدیمی جمعیت جن میں رائے دینے کے لئے یہ لوگ عظیم الشان بازار والے شہر میں ملکی فرائض کے سچے احساس کے ساتھ جمع ہوتے تھے ایسی جمعیت دار الصدر کے غوغائیوں کا مجمع بن گئی تھی جس میں دور دور از کے نہایت ہی ابتر دماغی شہری بھرے ہوئے تھے جو شہر میں اس امید سے پہنچ

جاتے تھے کہ مفت کے ٹکڑے ملیں گے۔[1]

یہ ضرور ہے کہ رومانی سلطنت اور اس کے مشترکی اطالوی حلیفوں کے درمیان جب سنہ ۹۰-۸۹ ق م میں جنگ ہوئی اور اطالویوں کے عام طور پر رومانی شہریت میں داخل ہونے سے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو شہریت کی اس وسعت سے اس تغیر میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی اور اس طرح قبل اس کے کہ تقیب کا زمانہ آئے جو عملاً بادشاہی کے مرادف تھی روما کی جمعیت عوام کا اختیار قانون سازی و انتخاب حکام، مجلس سینات کے نظم و نسق سلطنت کے اختیار کے بہ نسبت زیادہ نمایاں و مایوسی افزا طور پر رخصت ہو چکا تھا۔

---

[1] یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ جن پینتیس قبائل میں رومانی قوم منقسم تھی اون میں سے کسی قبیلہ کی رکنیت اگرچہ اول کسی خاص حلقہ میں رہنے کے ساتھ مشروط تھی مگر مدت سے اس کی صورت یہ ہوگئی تھی وہ موروثی شخص حق کے طور پر ان شہریوں کے خاندانوں میں چلی آتی تھی جسنے ابتداً اس رکنیت کو قیام کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا اور جمہوریہ کی تاریخ کے آخری دور میں کسی قسم کی جائداد کی ملکیت کی شرط بھی پیش رہی تھی۔

خطبۂ یازدہم

روما (بہ سلسلہ سابق)

۱۔ اپنے آخری خطبے میں میں نے یہ کوشش کی تھی کہ عددیت و عمومیت کے مابین اس مخصوص توازن کے نشو و نما کا مختصراً پتا چلاؤں جسے رومانی دستور سلطنت ہمارے پیش نظر کر دیتا ہے؛ یہ توازن تلخ و ناگوار تصادمات اور تدریجاً بناکردہ مصالحات سے شروع ہو کر شہری جماعت کی خوشحال وسعت پذیری اور شہنشاہانہ حکمرانی کے توسع کے شاندار دور سے گزر کر آخرالامر تنزل اور شاہی کی صورت میں منقلب ہو گیا تھا۔

مگر اس کے قبل کہ ہم اس حکومت کے خصوصیات پر غور کرنے کی طرف توجہ کریں جو قدیم جمہوری دستور سلطنت کو تباہ کر کے تعمیر ہوئی تھی، مجھے یہ اشارہ کر دینا چاہیے کہ پولی بیوس نے اپنے زمانے (یعنی دوسری صدی قبل مسیح کے نصف اول) میں رومانی سلطنت کی جو کیفیت بتائی ہے اس میں اسے ایک "شاہی" عنصر بھی نظر آتا ہے جسے میں نے اس وقت تک پس پشت ڈال رکھا ہے، وہ روما کے دستور سلطنت کو ان تینوں شکلوں کا مجموعہ سمجھتا ہے جو رائج الوقت ترتیب میں مروج تھیں یعنی شاہی، اعیانیت و عمومیت، منشا یہ ہے کہ وہ قنصلوں کو شاہی عنصر کا نمائندہ خیال کرتا اور در حقیقت یہ کہتا ہے کہ تینوں عناصر ایسی موزوں طرح پر منقسم و متوازن ہیں کہ ایک ملکی باشندہ بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہ سکتا کہ کون سا عنصر غالب ہے۔ یہ ایک صاحب

بصیرۃ و بافکر ہمعصر کا اہم فیصلہ ہے' اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ روما میں اعلیٰ ترین حاکم کا اختیار و اعزاز دونوں یونان کی ان تمام شہری سلطنتوں کے ہمپایہ حاکموں سے زیادہ تھا جن کا علم پولی بیوس کو تھا اور یہ اختیار ایک بڑی حد تک شاہی اختیار و اعزاز سے قریب آگیا تھا' لیکن فی الحقیقت اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے کہ یونان میں عدیدیت کے زیادہ قدیمی طرز میں دستور سلطنت کی ایسی مثالیں نہیں ملتیں جو اس خصوص میں رومانی نظم سلطنت کے مشابہ ہوں گو ہمیں اتفاقی طور پر کسی ایسی مثال کا علم نہیں ہے' اور ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ پولی بیوس کو بھی کسی ایسی مثال کا علم نہیں تھا۔ اس فرق کا تعلق اس واقعے سے ہے جو ابھی ابھی مذکور ہو چکا ہے کہ رومانی قومی جمعیت نے حکمرانی کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اپنے حکمرانوں کے منتخب کر دینے اور انتہائی صورتوں میں ان سے جواب طلب کرنے کے اختیار پر قانع رہی' دوسری طرف مجلس سینات اگرچہ عملی طور پر نظم و نسق کی اعلیٰ کارکن بن گئی تھی مگر نظری طور پر وہ ایک مجلس مشورہ تھی جس سے حاکم اعلیٰ تمام اہم معاملات میں صلاح لینے پر مجبور تھا' وہ ایسی حکمراں جماعت نہیں تھی جس کی اطاعت پر حاکم اعلیٰ آئینی طور پر مجبور ہو۔

برادران گرامی کے آغاز کردہ دور انقلاب کے قبل کی حکومت روما پر غور کرتے وقت اس خیال کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ مجلس سینات کا عملی اقتدار اس کے باضابطہ اختیار سے بہت بڑھا ہوا تھا' ایک طرف تو جمعیت جن معاملات کا باضابطہ تصفیہ کرتی تھی ان میں وہ بالعموم انھیں فیصلوں کو قبول کرتی تھی جو مجلس سینات کی طرف سے تجویز ہوتے تھے' دوسری طرف حکام جن معاملات میں باضابطہ طور پر آزادانہ کارروائی کر سکتے تھے ان میں مستحکم طور پر یہ عادت قائم ہو گئی تھی کہ وہ مجلس سینات کا ادب ملحوظ رکھتے تھے' تاہم عمال و جمعیت متحد ہو کر (خواہ یہ عمال اور یہ جمعیت پلیب ہی کیوں نہ ہو) مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کئے بغیر مجلس سینات کی مرضی کے خلاف بھی نہایت ہی اہم تغیرات کر سکتے تھے' اور جب تک کہ ہم اس امر کو ملحوظ خاطر نہ رکھیں تو (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ہم اس دور انقلاب کے واقعات عجیبہ کی صحیح طور پر تعبیر نہیں کر سکتے۔

بایں ہمہ' میں یہ خیال نہیں کرتا کہ عہدہ قنصل جیسا کچھ کہ ارسطو یا پولی بیوس کے زمانے میں تھا' اس میں ارسطو شاہی کے خصوصیات کو تسلیم کر لینا' کم از کم شہریوں کے

ساتھ قنصل کے تعلقات کا جہاں تک واسطہ تھا اُس میں تو ایسا نہ کرتا۔ میں شہریوں کا لفظ استعمال کرتا ہوں کیونکہ قنصل قائم مقام قنصل (پرو کانسل) یا قائم مقام پریٹر (پرو پریٹر) کے اختیارات ہم کے سپاہیوں اور رومانی سلطنت کی رعایا پر بہت زیادہ وسیع تھے۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ قائم مقام قنصل صوبوں میں اپنی میعاد تقرر کے اندر، شاہانہ طور پر حکمرانی کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی (جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے) کہ قائم مقام قنصل کا یہ اقتدار جب مستقلاً ایک شخص واحد کے ہاتھ میں آگیا تو اس سے ابتدائی شہنشاہوں کے اختیار کا خاص عنصر تیار ہوگیا۔

مگر شہریوں کے تعلقات کے لحاظ سے، ارسطو کے زمانے میں اور نیز اسکے بعد قنصلوں کے اختیارات اس سے بہت ہی مغائر تھے جنھیں ارسطو شاہانہ اختیار کہہ سکتا۔ (۱) نہ صرف یہ کہ دو دو قنصلوں کا ہونا اختیارات کی بہت بڑی تحدید تھی (۲) بلکہ آئینی طور پر ٹریبیون کو روک تھام کے جو اختیارات دیئے گئے تھے ان سے بھی قنصلوں کے اختیارات محدود ہو گئے تھے۔ (۳) مزید براں، چوتھی صدی کے نصف آخر میں قنصلوں سے عدالتی فرائض نکل گئے تھے، یہ فرائض ان سے علحدہ کرکے پریٹروں کو تفویض ہو گئے تھے اور سیناتیوں کی فہرست پر نظر ثانی کرنے کا اہم کام اب سینسروں سے متعلق ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اپنے تمام زیادہ اہم فرائض میں وہ معمولاً محض مجلس سینات کے عامل کے طور پر کام کرتے تھے اور حقیقی طور پر وہ اس جماعت کے ماتحت تھے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ابتداً قنصلی اختیار کو شاہی اختیار سے زیادہ قریبی مشابہت حاصل تھی اور تقلیب کی ان دو کارروائیوں کو غور سے دیکھنا بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ جو شاہی اختیارات ایک جگہ مجتمع تھے اولاً انکی قطع و برید سے حکام کو فرداً فرداً وسیع اختیارات عطا کئے گئے اور پھر جب جمہوریت نے شاہی کا قالب بدلا تو جدید شہنشاہی اختیار نے انہیں منقسم عناصر کے بعض اجزا کے اتحاد ثانی سے ملکر ترقی کی، کیونکہ اگرچہ روما میں شہنشاہی حکومت شدید بدنظمی کے طولانی دور کے بعد قائم ہوئی تھی، لیکن اس کی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے ہم اسے حقیقتاً اس قدر بیضابطہ و خلاف آئین نہیں سمجھ سکتے جیسی کہ یونان کی مطلق العنانی ہوا کرتی تھی۔ اس کے برعکس آگسٹس کی ان کوششوں سے زیادہ کوئی امر عجیب و غریب نہیں کہ اس نے جدید مطلق العنانی کو آئینی اقتدار کا جامہ پہنانا چاہا اور یہ سعی کی کہ اختیارات کا جو پیچ در پیچ تاریخی نظام پہلے سے قائم تھا اس کو شہنشاہی کے جسم پر چسپ کردے۔

۲۔ پہلے شاہی سے بدل کر جمہوریت کا ہونا اور پھر پانچ سو برس کے بعد جمہوریت کا بدل کر شاہی کی صورت اختیار کرنا، ان دونوں میں سے اول الذکر ارتقا کے حالات تو افسانوں کی نقاب میں اس طرح روپوش ہو گئے ہیں کہ ان پر غائر نظر ڈالنا مشکل ہے۔ (جیسا کہ ہم سابق کے ایک خطبے میں دیکھ چکے ہیں)[عہ] مگر اس تبدیلی کے عقب میں، شاہی کے تصور کے متعلق جیسا شدید و دیرپا روایتی عنصر پیدا ہو گیا تھا اس سے ہم یہ یقین کر سکتے ہیں، کہ یہ تقلیب اپنے طرز و طور میں نہایت ہی زیادتی آمیز رہی ہو گی، یہ تنفر ایسا تھا کہ عمومیت کے قدیم تر دور میں جب کوئی سرگروہ عوام ہیبتناک حد تک پہنچ جاتا تھا اور اس کی سرکوبی کی ضرورت پڑتی تھی تو اس تنفر کی وجہ سے طبقۂ امرا کو بزور مدد حاصل ہو جاتی تھی، بلکہ پلوٹارک کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت کے اختتام تک یہ کیفیت تھی کہ قیصر کے خلاف سازش کرنے والوں نے عوام کے اس روایتی تنفر پر اعتماد کیا تھا اور ہم یہ بھی یقین کر سکتے ہیں، کہ ایتھنز کے ان اولین حکام کی طرح جو ایک محدود زمانے کے لئے اپنے عہدے پر قائم رہتے تھے، قدیمی قنصل بھی زیادہ تاریخی زمانے کے قنصلوں کی بہ نسبت اپنے حدود اختیار کے اعتبار سے بادشاہوں کی سی شان رکھتے تھے۔ ابتدائی قنصلوں کو عدالتی اختیار بھی حاصل تھا، جو بعد کو (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ان سے علیحدہ کر کے پریٹروں کو دے دیا گیا تھا، جمعیت کا دخل صرف اتنا تھا کہ موت کی سزا میں اس کے پاس مرافعہ ہو سکتا تھا، یہ قدیم قنصل مجلس سینیٹ کی فہرست پر نظر ثانی کرتے تھے، اور خالی جگہوں کے پر کرنے میں انھیں بلا شک و شبہ اس سے بہت زیادہ آزادی حاصل تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں رواجاً محتسبوں کو دی گئی تھی، اور اس زمانے میں ان پر روک ٹوک کرنے کے لئے ٹربیونوں بھی نہیں تھے۔ ان کے اختیار اور شاہی اختیار میں فرق صرف وہی تھا جو قلیل المیعاد عہدوں سے لازماً پیدا ہو جاتا ہے، جس سے وہ اپنی میعاد کے اختتام پر ان خلاف قانون افعال کے قطعی طور پر ذمہ دار ہو جاتے تھے جو اس دوران میں ان سے سرزد ہوئے ہوں اور ایک روک وہ بھی تھی جسے اہل جرمنی "رفاقت" کہتے ہیں اور جسے میں نے "دوگونگی" سے تعبیر کیا ہے یعنی عہدۂ قنصلی کی شرکت اس میں شک نہیں کہ یہ "دوگونگی" اسی مقصد سے رائج کی گئی تھی۔ پہلے یہ بات رومانیوں کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ بلند ترین حاکم پر اس کے عہدے کی میعاد کے دوران

عہ۔ خطبۂ چہارم

میں کوئی خارجی نگرانی (حکومت کے اثر و اقتدار میں مداخلت کئے بغیر) عمل میں آسکتی ہے۔ جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوجائے اس وقت اس سے جواب طلب کیا جاسکتا تھا اور اسے سخت سزا دی جاسکتی تھی لیکن اگر نظم و امن کو قائم رکھنا منظور تھا تو قنفسل جبتک قنفسل تھا، اس کے احکام کی اطاعت ہونا چاہئے تھی خواہ وہ حسب آئین دستور سلطنت ہوں یا نہوں، پس مطلق العنانانہ کارروائیوں کے روکنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ دو قنفسل ہوں، جن میں سے ہرایک کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ دوسرے کے احکام میں دخل دے سکے اور انھیں ساقط العمل کرسکے۔ منقسم حکومت کے خطرے اور خاصکر نازک وقت کے خطرے سے بھی چشم پوشی نہیں کی گئی تھی مگر (یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ) اس خطرے کو کافی طور پر اس طرح رفع کردیا گیا تھا کہ ہرایک قنفسل کے لئے یہ اختیار محفوظ رکھا گیا تھا کہ وہ چھ ماہ کے لئے کسی کو حاکم مطلق نامزد کرے۔ لیکن چونکہ دونوں قنفسل قدیم خاندانوں کے محدود طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے جمہوریت کی پہلی ڈیڑھ صدی کے اندر اس "ردعمل" سے جو روک پیدا ہوتی تھی اسے پلبیین بالطبع ناکافی سمجھتے تھے اور اس لئے پلیبیوں کو قنفسلوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ٹربیبیوں کا عہدہ قائم کیا گیا، اسے امتناع کا غیر محدود اختیار حاصل تھا مگر ایجابی حکم دینے کا حق اسے حاصل نہیں تھا۔

پھر (جیساکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں) شاہی اختیار کے دوسرے اہم عناصر بھی ٹکڑے ٹکڑے کرکے نکال لئے گئے اور اسی طرح کے ثنائی یا جمعی جداگانہ انتظام کے تحت میں کردئے گئے۔ اول مالیات کے انتظام اور موقت طور پر شہریوں کی فہرست پر نظر ثانی کرنے اور ان کے مال و سائل کے اعتبار سے انھیں فوجی و ملکی اغراض کے لئے مختلف طبقات میں ترتیب دینے کے لئے سینسر کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اور (جیساکہ میں کہہ چکا ہوں) سینسر کا یہ بھی کام تھا کہ سیناتیوں کی فہرست میں جو جگہیں خالی ہوں ان کو پر کرے اور فاحش بداخلاقی اور انتہائی عیش پرستی کی وجہ سے سیناتیوں اور نائبوں کے اعلیٰ مناصب سے لوگوں کو خارج کرنے کا اہم اختیار بھی اسے حاصل تھا۔ اس نازک فرض کے انجام دینے میں عہدۂ سینسر کی دوگونگی بلاشک و شبہ نہایت اہمیت رکھتی تھی کیونکہ ذاتی عناد و عداوت کے اثر کو اس طرح روک دیا گیا تھا کہ اس نشان تذلیل کے لئے دونوں سینسروں کا متفق ہونا ضروری تھا۔

مزید براں، جب ۳۶۷ ق م کے نازک برس میں قنفسلی کا ایک عہدہ پلیبیوں کے لئے

محفوظ کر دیا گیا تو عدالتی فرائض، جہاں تک کہ دیوانی کے اختیارات کا تعلق تھا، اس واشدہ عہدے سے نکال لئے گئے اور یہ فرائض قنصلوں کے ایک رفیق کو سپرد کر دئے گئے، جو پہلے ایک ہی ہوتا تھا اور پریٹر کے قدیم نام سے نامزد ہوتا تھا۔ اس سے ڈیڑھ صدی بعد ایک دوسرے پریٹر کا اضافہ ہوا جس سے غیر ملکیوں یا اہل ملک اور غیر ملکیوں کے مقدمات کا تصفیہ متعلق تھا، پھر جب رومانی تسلط اطالیہ کے باہر تک وسیع ہوا تو بتدریج چار اور پریٹر بڑھائے گئے اور کل تعداد چھ تک پہنچ گئی۔ اولاً یہ اضافہ روما کے چار ماورائے بحر صوبوں کے لئے ہوا تھا، مگر آخر میں فوجداری کے مقدمات کے لئے خاص مستقل عدالتوں کے قائم ہو جانے سے یہ چھیوں پریٹر بلکہ سولا کے بعد آٹھوں پریٹر عدالتی فرائض میں لگ گئے۔ اس طرح صوبے قطعی طور پر نائب قنصل اور نائب پریٹر کے حوالہ کر دئے گئے، (لفظی ترجمہ ان کا قائم مقام حاکم تھا) مگر یہ لوگ حسب معمول قنصل و پریٹر تھے اور ان کا "اقتدار" (Imperium) (یعنی غیر شہری اور زیر خدمت سپاہیوں پر ان کا اختیار) ان کے عہدے کے سال کے ختم ہو جانے کے بعد ایک برس تک اور بڑھا دیا جاتا تھا۔ جس طرح صوبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اسی طرح ان قائم مقاموں سے کام لینے کا دستور بھی بتدریج باضابطہ و وسیع ہوتا گیا، پریٹر صرف پہلے چار صوبوں کے لئے مقرر ہوئے تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس اثنا میں ٹربیون کا عہدہ بھی قائم ہو چکا تھا اور اس طرح جمہوریت کے شباب کے وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قدیم شاہی اختیار، (جس نے شہنشاہی و تمدن کی ترقی کے ساتھ وسعت اور نشو و نما حاصل کر لی تھی) ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف حکام کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہونے لگا تھا، اور جہاں تک اہل ملک کے دیوانی اختیار سے تعلق تھا، اس میں "ہم عملی" کا طریق جاری تھا، مگر غیر اہل ملک اور زیر خدمت سپاہیوں پر "اقتدار اعلیٰ" (Imperium) کا نفاذ نائب قنصل اور نائب پریٹر تنہا عمل میں لاتے تھے۔

اس سلسلۂ بیان میں ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ عاملانہ اختیار کے اس طرح پارہ پارہ کرنے سے مجلس سینات کا عملی اختیار بالطبع بڑھتا جاتا تھا، کیونکہ سینات ہی سے وہ اتحاد عمل حاصل ہوتا تھا جس کی ضرورت ہر ایک موثر حکومت کو اپنے نظم و نسق میں ہوتی ہے۔ یہ ویسا ہی اتحاد عمل تھا جو انگلستان میں کابینہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے

عاملانہ محکموں کے سردفتروں پر کابینہ کا اقتدار بھی سینات کے اقتدار کی طرح یوں ہی ترقی کرتا گیا کہ عملی ضروریات کو پورا کرتا تھا اور نہ باضابطہ آئینی طور پر کابینہ کو کوئی اختیار اس قسم کا نہیں دیا گیا ہے۔ اگر وقت اس کی اجازت دیتا تو مجلس سینات کی تدریجی نشو و نما پر بحث کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوتا کہ کیوں کر وہ ایک ایسی مجلس سے جس کے فرائض خالصتہً مشورتی تھے، اور قدیم بادشاہ اور ان کے بعد ابتدائی قنصل رسماً و رواجاً اس سے صلاح لیا کرتے تھے، وہ ترقی کر کے عام نظم و نسق کی عملاً سب سے اعلیٰ کارکن جماعت بن گئی اور قانون سازی پر بھی اس کا اثر جاری ہو گیا، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں انقلابی دور کے شروع ہونے تک یہی حالت رہی۔ یہاں میں صرف اس قدر کہوں گا کہ شہنشاہی کو جس قدر وسعت اور تہذیب و تمدن میں جسقدر ترقی ہوتی گئی اسی قدر مجلس سینات کا اختیار بالطبع بڑھتا گیا کیونکہ کام کی مقدار اور اس کے تنوع کے بڑھنے سے ضرورت تھی کہ ایام قدیم کی بہ نسبت محکموں کی زیادہ باقاعدہ تقسیم و تعیین کی جائے۔ پس مجلس سینات ہی مختلف صوبوں کو حکام و نائب حکام کے درمیان تقسیم کرتی تھی اور ہر ایک کے لئے فوج، روپیہ اور عملے کے سامان کا تعین کرتی تھی، اور اس طرح انجام کار سرکاری مالیات کا تمام اعلیٰ انتظام، ترقی پذیر شہنشاہی کی جملہ حکومت غیر ملکی معاملات کا کل انتظام و انصرام، یہ سب عملاً مجلس سینات ہی کے ہاتھ میں آگیا۔ چونکہ یہ مجلس مادام الحیات رکنیت کے اصول پر زیادہ تر سابق عہدہ داروں سے مرکب تھی اس لئے حکمت عملی کی یکسانی کے قیام اور سیاسی تجربات کے نتائج کے استحفاظ و انتقال کے لئے اس کی یہ ترتیب و ترکیب نہایت ہی خوب واقع ہوئی تھی، ورنہ حکام کے سالانہ انتخاب کے طریقے میں ان امور کا برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا۔

۲۔ اب ہمیں اس ارتقائی کیفیت کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ ایک شہنشاہانہ دولت عام نے ایسی شہنشاہی کی صورت اختیار کی جس پر شاہی طرز سے حکمرانی ہوتی تھی۔ میں یہ پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ اس تبدیلی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ حکومت کی جو شکل ایک شہری سلطنت کے لئے موزوں تھی وہ شہنشاہی حکومت کے کام کے لئے مکتفی نہیں تھی۔ اس عدم اکتفا کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک (۱) رومانی سلطنت کے شہریوں کے اعتبار سے اور دوسرے (۲) اس کے حلفا و رعایا کے اعتبار سے۔

جہاں تک شہریوں کا تعلق تھا، یہ انتظام ناکافی ثابت ہوا کیونکہ شہری سلطنت

کے حدود کچھ تو توسیع کی کارروائی سے اور کچھ اپنے ہمسایوں کو گونہ جبری طور پر جذب کر لینے
سے (جس کا بیان سابق کے خطبہ میں ہو چکا ہے) اس قدر بڑھ گئے تھے کہ ان کا سنبھالنا مشکل
ہو گیا تھا اس کے ساتھ ہی دوسرے نقطۂ نظر سے یعنی روما کو اس کے فاتحانہ و شہنشاہانہ کام
کے لئے مادی حیثیت سے کافی مضبوط کرنے کے لئے یہ وسعتِ حدود ضروری تھی۔ اگر رومانی
سلطنت خود کو انھیں حدود کے اندر مقید رکھتی جنھیں یونانی ارباب فکر موزوں خیال کرتے
تھے۔ [اور ایک شہری سلطنت جس کا اعلیٰ اختیار باضابطہ طور پر شہریوں کی اس جمعیت
کو تفویض ہو جس کا اجلاس فورم میں ہوتا ہو اس کے سیاسی ادارات کو قابل اطمینان طور
پر چلانے کے لئے ایسے ہی حدود مناسب بھی تھے] تو اس صورت میں اہل روما فرداً فرداً
کیسے ہی جری و شجیع کیوں نہ ہوتے مگر محض قلت تعداد کی وجہ سے ان کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا
کہ وہ شہنشاہی پر قابض ہو کر اسے اپنے قابو میں رکھ سکتے تاہم، روما سے جس کام کو تکمیل کو
پہنچانے کی توقع کی گئی تھی اس کے لحاظ سے یہ وسعت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نہیں تھی
مگر اس سے یہ لازم آگیا تھا کہ اتنی وسعت یافتہ قوم کے لئے حکومت کی یہ صورت ناموزوں
ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی جب گراکوس نے (۱۳۳ ق م میں) انقلابی صدی کا آغاز
کیا تو (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) سلطنت دوسرے نقطۂ نظر سے ضرورت سے زیادہ محدود تھی
کیونکہ جب لاطینی تہذیب و تمدن تمام جزیرے میں پھیل گیا، اور اطالوی حلفا ہنوز غیر ملکی رہے،
تو پھر اطالیہ کے اندر رومانی شہریوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان یہ سیاسی فرق زمانۂ
سابق کی ایک ایسی یادگار رہ گیا جسکے قائم رکھنے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں تھی، آخری
امر یہ ہے کہ اطالیہ سے باہر جہاں تک روما کے صوبجاتی رعایا کا تعلق ہے حکومت ناکافی تھی
اور یہ نتیجہ تھا اس نامکمل نگرانی کا جو مرکزی حکومت ان "قائم مقاموں" پر قائم رکھتی تھی جو
اپنے اپنے صوبوں میں شاہانہ اختیار استعمال کرتے تھے اور اپنے اختیارات کو اپنے ذاتی
نفع کے لئے اکثر نہایت بے باکانہ طور پر کام میں لاتے تھے۔

بعد ازاں، (جیسا کہ میں آخری خطبے میں تشریح کر چکا ہوں) شہنشاہی کے
زیر اثر مرکزی حکومت کی خوبی کار اپنے اعیانی و عمومی دونوں اعتبارات سے یکساں
طور پر برابر گھٹتی گئی، صوبوں کی لوٹ کی وجہ سے حکمران طبقۂ امرا کی تخریب کے ساتھ ہی ساتھ
جمعیت عمومی بھی اس لوٹ میں حصہ لینے کی وجہ سے ابتذال میں مبتلا ہو گئی، اور اس

آخری نتیجے میں اس وجہ سے اور بھی زیادتی ہوگئی کہ شہریت ان حدود سے زیادہ وسیع کردی گئی جن حدود کے اندر ملکی جذبے کے ساتھ ایک پر زور قوم اور روما کی جمعیت میں شہریوں کی قابل لحاظ نیابت قائم رہ سکتی تھی، اور حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ایک نقص کے رفع کرنے سے دوسرے نقص میں اور زیادتی ہو جاتی۔

مختصر یہ کہ جب روما نے اپنی محیط الاطراف مملکت اور اس سے خارج، متنور الاعتراف شہریت والی نو آبادیوں کے وسیع جال کے اندر، چار لاکھ شہری سپاہیوں کو اپنے دامن میں لے لیا تو پھر یہ شہری سلطنت اپنی حد غایت کو پہنچ گئی، مگر جب آخر الامر رومانیوں اور ان کے اطالوی حلیفوں کے درمیان سیاسی عدم مساوات فی الجملہ رفع کردی گئی اور موخر الذکر شہریت کے حلقے میں بزور داخل ہو گئے اور رومانی سلطنت جزیرہ نما میں برابر پھیلتی گئی، یعنی پہلے دریائے پو تک اور بعد ازاں کوہستان آلپس تک پہنچ گئی تو پھر دار الصدر کے ازدحام عوام کا یہ ادعا کہ وہ اس سلطنت کی نیابت کرتے تھے جو اب عملاً ایک ملکی سلطنت ہو گئی تھی، صریحاً ناممکن معلوم ہونے لگا، اور ازدحام عوام کی حالت خود بھی اور ابتر ہو گئی۔

مزید براں، اس کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی ایک مہتم بالشان تغیر واقع ہو گیا، جائداد کے بعض شرائط کے ساتھ شہریوں پر جو فوجی فرض عائد تھا اس کا قدیم خیال دوسری صدی کے آخر تک قوت کے ساتھ قائم تھا، شہریوں کی فوج محافظ خود کو یہ سمجھتی تھی کہ وہ رومانی مسلح قوم ہے، ملکی جذبے کے جس رشتے سے فوج کے ارکان ایک دوسرے سے وابستہ تھے وہ ایک حقیقی و مضبوط جذبہ تھا، اور ان کے اجتماعی جذبۂ و احساس میں، روما کی آئینی سلطنت سے تعلق رکھنے کا خیال کسی خاص سپہ سالار کی فوج میں ہونے کے خیال سے زیادہ قوی تھا، مگر میریس کے بعد پہلی صدی قبل مسیح میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔ حق شہریت کی وسعت سے ملکی جذبہ کم ہوتا گیا، فوج کے وسعت پذیر حصے، یعنی سوار، ہلکے ہتیار رکھنے والے اور گوپھنوں والے سپاہیوں میں غیر شہری داخل ہوتے گئے۔ پیدل سپاہ تک کے لئے جائداد کی قدیم شرط ترک کردی گئی اور فوج کی ترکیب بلا امتیاز، تمام شہریوں کی رضامندانہ بھرتی سے ہونے لگی۔ روز بروز اس میں آبادی کا نسبتاً زیادہ غیر مستقل حصہ داخل ہوتا گیا، اور غنیمت کی توقع اور آخر میں زمین کا عطیہ ان کے لئے تحریص کا باعث ہو گیا اور اس کے لئے ان کی نظر اپنے سپہ سالار کی طرف بڑھنے لگی۔ پس اس طرح وہ رشتہ جس سے فوج اپنے سپہ سالار کے ساتھ

وابستہ ہوتی تھی ملکی فرض کے جذبے کی بہ نسبت زیادہ مستحکم ہوتا گیا، اور فوج، عسکری مطلق العنانی کے لئے ایک موزوں و مناسب آلہ بن گئی۔

تقلیب کے اسباب میں غالباً یہ سبب سب سے زیادہ قطعی عنصر ہے۔ سولاؔ سے یہ ہو سکتا تھا کہ وہ قدیم اعیانی طریقے کو دوبارہ قائم کردے، اور سینات کو سابق کی بہ نسبت باضابطہ طور پر زیادہ اختیار دے دے مگر یہ اس سے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ فوجوں کے سرداراں پر شہر (روما) کی حکومت کی فوقیت بحال کردے۔

جب میریس و سولاؔ، پومپی اور سیزر کی مثالوں سے فوجی سرداروں کا یہ لابدی غلبہ روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا تو پھر نظم و ترتیب اور شہنشاہی کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نظر آتی تھی کہ فوجوں کی امارت مستقلاً ایک ہی شخص واحد کے ہاتھ میں جمع کردی جائے، لیکن شہنشاہی کے پہلے دور میں کسی کو علانیہ بادشاہ بناکر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ جن اختیارات کو جمہوریہ کے پروکانسل تائم مقام کانسل ہمیشہ صوبوں میں استعمال کرتے تھے، انھیں ایک ہی شخص کے ہاتھ میں مجتمع کردیا اور منتقل بنادیا گیا۔ اس کے بجائے متعدد پروکانسل قائم مقام کانسل اور پروپریٹر (قائم مقام پریٹر) یکے بعد دیگرے مقرر ہوتے رہتے اور عملی طور پر ان کے اختیارات اپنے اپنے صوبوں میں تقریباً خود مختارانہ حد کو پہنچے ہوتے اور انھیں بظاہر صرف اتنا ہی خوف ہوتا کہ مبادا ان کی واپسی کے بعد ان پر مقدمہ چلایا جائے، اور اس کے بعد وہ پھر نئی حرص و ہوس کے ساتھ تھوڑے زمانے کے لئے صوبوں کو لوٹنے کے لئے پہنچ جایا کریں، یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ ان سب کے بجائے ایک اعلیٰ پروکانسل مقرر ہو جائے جس کے اختیارات تمام صوبوں اور تمام فوجوں پر وسیع ہوں۔ اس میں بھی شک نہیں ہو سکتا کہ باوجود ان تمام دشواریوں کے جو شہنشاہی کے مشتبہ انتخاب سے پیدا ہوتی تھی، اس تغیر سے ابتدائی شہنشاہی کے دور میں صوبوں کو بہت نفع پہنچا، شام، مصر، ہسپانیہ، گال، افریقہ ان سب کے لئے ابتدائی شہنشاہی صریحی و نمایاں مادی بہبود کا زمانہ تھی۔

پس ابتدائی شہنشاہی اقتدار کا اولین عنصر اس پر مشتمل تھا کہ قائم مقام قنصل کے اختیارات ایک جگہ مجتمع و منتقل ہو جائیں۔ شہنشاہ، رومانی شہریوں کا بادشاہ نہیں بلکہ رومانی شہریوں کے تیس لشکروں کا امیر تھا اور یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس قسم کا تغیر روما کے آئینی جذبے کے لئے اس سے بہت کم باعث آزردگی تھا کہ آگسٹس دائمی قنصل (جیسا کہ اس کا

پہلے ارادہ تھا) یا حاکم مطلق بن جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ قائم مقام قنصل کا اختیار صرف اہل صوبہ وزیر خدمت سپاہیوں پر نافذ ہوتا تھا، اور اس اختیار کے نسبت ہمیشہ سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ شہر روما کے حکام کے اختیار کے بہ نسبت بہت زیادہ غیر معین و دیرپا ہے۔ اس تقلیب کو اور بھی زیادہ نرم کرنے کے لئے آگسٹس نے یہاں تک فکر کی کہ جن صوبوں کا انتظام سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد کے بغیر ہو سکتا تھا انھیں سیناتی صوبے قرار دیدیا تاکہ ان پر نائب قنصل اور نائب پریٹر اسی طرح حکمرانی کرتے رہیں جیسے جمہوری زمانے میں کرتے تھے۔ البتہ اس کے وسعت دادہ امپریم (اقتدار اعلیٰ) (Imperium) میں غیر ملکی معاملات، صلح، جنگ و معاہدات وغیرہ پر غیر محدود نگرانی شامل تھی اور آئینی طور پر یہ امور زمانۂ قدیم سے جمعیت تعلق رکھتے تھے تاہم خانگی معاملات میں شہنشاہی کی پہلی صدی میں اطالیہ اور صوبوں کے درمیان عام طور پر فرق قائم رکھا گیا تھا[عله]۔ روما پر بظاہر اب بھی سینات، قنصل اور پریٹر کی حکومت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ آگسٹس کے تحت میں ان عہدوں کے انتخابات کسی حد تک واقعی آزادانہ طور پر عمل میں آتے تھے، رومانی شہریوں سے متعلق شہنشاہ معمولاً جو اختیار استعمال کرتا تھا وہ زیادہ تر ٹریبیون کے اختیارات تھے۔ اس کے سوا آگسٹس میں اور اوصاف بھی تھے۔ جب ضرورت ہوتی تھی وہ احتسابی اختیار سے بھی کام لیتا تھا، مذہباً وہ مستقل طور سے سب سے بڑا امام تھا اور قنصلی عہدے کی شان بڑھانے کے لئے کبھی کبھی قنصل بھی ہو جایا کرتا تھا، مگر وہ خود کو رومانی قوم کے سامنے سب سے اول و اقدم اس حیثیت سے پیش کرتا تھا کہ اسے سال بسال ٹریبیون کے اختیارات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ٹریبیون کے نام کے ساتھ عامۃ الناس کا شغف و تعلق، اس عہدے کی خاص تحریم و تقدس اور کم از کم اقتناعی حیثیت میں اس کے اختیارات کا روائیتاً غیر محدود ہونا یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے آگسٹس نے تقلیب کی ضرورت کے لئے اس عہدے کو منتخب کیا۔

مگر ان سب امور سے بالا و برتر شہنشاہ کو صراحتاً یہ غیر معمولی اختیار حاصل تھا کہ سلطنت کی عزت و بہبود کے لئے وہ جو کارروائی کہ مناسب سمجھے اسے

عله۔ میں اطالیہ اور صوبوں میں فرق کے لئے عام طور کا لفظ استعمال کرتا ہوں کیونکہ بعض ہور و غنایت صوبجاتی شہروں کو رومانی شہریت کے خاص امتیازات حاصل تھے جیسا کہ انجیل کی کتاب اعمال سے معلوم ہوتا ہے۔

عمل میں لائے اور اس میں شک نہیں کہ اول ہی سے اس کی مرضی ناقابل مقاومت معلوم ہوتی تھی۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ نیم جمہوری ادارات کے زینے توڑ دیے گئے اور غیر محدود الاختیار بادشاہ کے سامنے سے پردہ اٹھ گیا اور وہ تمام اعلیٰ تشریعی، عاملی و عدالتی اختیار میں رومانی قوم کے جائز جانشین کے طور پر جلوہ نما ہو گیا۔ اس کے بعد جب تیسری صدی مسیحی کے آغاز میں کاراکالا کے تحت میں رومانی شہریت کے حقوق روما کی تمام رعایا کو عطا کر دیے گئے تو اطالیہ اور صوبوں کے فرق امتیازی کے یہ آخری آثار بھی محو ہو گئے اور قدیم شہری سلطنت آخر الامر شہنشاہی کے اندر فنا ہو گئی۔

خطبۂ دوازدہم

حکومت کے فرائض اور یونان وروما میں حکومت سے قانون کا تعلق

۱۔ اب میں یونانی ورومانی نظم حکومت پر ایک دوسرے ہی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میں اس وقت حکومت کی شکل اور خاص کر اس کے اس حصے کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا جس میں اعلیٰ اقتدار مرکوز ہوتا ہے اور جس کے متعلق عام ترتیب وتقسیم یعنی عددیت وعمومیت وغیرہ کے تحت میں بحث کی جاتی ہے، بلکہ اس وقت میں حکومت کے فرائض اور خاص کر قانون کے ساتھ اس کے تعلق پر غور کرنا چاہتا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یونانی رومانی نظم سلطنت کے اندر فرائض حکومت کا جو عام تصور قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق ایک خیال وسعت کے ساتھ شائع ہے اور اس میں صداقت بھی بہت کچھ موجود ہے مگر جیسا کہ بارہا بیان ہو چکا ہے یہ خیال یکطرفہ وگمراہ کن ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ "جدید دستوری حکومتوں کے برعکس "قدیم مختار مطلق حکومتیں" "سلطنت کے حقوق کے مقابلے میں انفرادی حقوق کو جانتی ہی نہ تھیں" اور نیز یہ کہ افراد کو قطعی طور پر سلطنت کے تابع رکھنے کے بارے میں یونان کا روما سے ایک ذرہ برابر بھی کم نہ تھا"[۱] یہ ملحوظ رہے کہ اس قسم کے مقابلے میں ہم "جدید دستوری سلطنت" سے محض وہی سلطنت

[۱] مسٹر وڈرو ولسن کی کتاب "مملکت" صفحہ ۱۳۶ اور بلنچلی کی کتاب "نظریہ مملکت" کتاب اول باب ششم دیکھنا چاہیے۔

مراد نہ لیں جس میں حکومت کی ہئیت کسی ایسے سیاسی دستور کے ذریعے سے معین کر دی گئی ہو جسکے بموجب حکومت کے اندر قوم کو براہِ راست اپنے نمائندوں کے ذریعے سے دخل دینے کا موقع دیا گیا ہو، بلکہ ہمارا مقصود اس حکومت سے ہوگا جس میں حکومت کا اختیار انفراداً اہل ملک کے بعض اساسی حقوق سے محدود کر دیا گیا ہو (مثلاً آزادی مطابع، آزادی جلسہ، آزادی اعمال مذاہبی وغیرہ وغیرہ) اگرچہ انگریزی دستور سلطنت کے اندر جس میں بادشاہ، امرا و عوام (پارلیمنٹ) کے اختیار کی کوئی معین حد تسلیم نہیں کی گئی ہے، یہ حقوق صریحاً مسلم نہیں ہیں مگر ممالک متحدہ امریکہ اور مغربی یورپ کے دستوروں میں یہ حقوق صریحاً تسلیم کر لئے گئے ہیں۔

لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ افرادِ قوم کی زندگی کی تہذیب و ترتیب کی نسبت قوم کے اختیار پر اس قسم کی کوئی قطعی حد بندی قائم کرنا، یونان و روما دونوں جگہ کی سلطنتوں کی تخئیل کے قطعاً منافی تھی[عله] یہ نہیں ہے کہ افلاطون یا ارسطو سلطنت کی کوئی غایت افراد کے بہبود سے بالاتر قرار دیتے تھے، لیکن وہ حکومت کی نسبت یہ خیال نہیں رکھتے تھے کہ محکوم کے بہبود کی ترقی دینے میں افراد کے اساسی حقوق کی وجہ سے جائز طور پر اس کی کوئی ایسی حد تھی جس میں دخل نہ دینے پر وہ مجبور ہو، اور فلسفیوں خاصکر افلاطون کے خیال میں تو افراد کی خانگی زندگی میں بہت ہی وسیع و تفصیلی مداخلت مناسب سمجھی جاتی تھی۔

لیکن جب ہم نظریے سے گزر کر واقعات کی طرف پلٹتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ یونانی یا رومانی حکومتوں نے واقعاً کیا کیا، تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسپارٹا سے باہر فرائض حکومت کے قدیم و جدید تصور کے درمیان عملی فرق بہت ہی کم تھا، یہ یقینی ہے کہ اسپارٹا کے شہریوں کے ضوابطِ زندگی جدید کیفیت و حالت سے نہایت ہی نمایاں طور پر مختلف تھے اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) فی الحقیقت اسپارٹا ہی وہ نقطۂ انفصل ہے جو فلسفیوں کو اپنے تصور کی ہئیت ظاہری قائم کرنے کے لئے عالم واقعات میں ہاتھ آتا ہے۔ (مثلاً) ہمیں یہ معلوم ہے کہ اسپارٹا میں اگر کوئی شخص تاخیر سے عقد کرتا، یا خراب طرح پر عقد کرتا یا تجرد کی زندگی بسر کرتا تو

عله۔ اگرچہ بہ حیثیت انسان، انسان کے حقوق طبعی کا تصور، جن پر یہ تحدیدات مبنی ہیں، کسی حد تک اس کی نمایت یونانیوں کے اس فلسفہ پر مبنی تھی جو انھوں نے رومانی قانون کے متعلق قائم کیا تھا، چنانچہ آگے چل کر اس کا حال معلوم ہوگا۔

ان سب باتوں کے لئے اس پر مقدمہ قائم کیا جا سکتا تھا[1] اور افلاطون نے (اپنی کتاب قوانین) میں یہ تجویز کی ہے کہ اگر کوئی شخص پینتیس برس کی عمر کے بعد بھی شادی نہ کرے تو اس پر جرمانہ ہو سکتا اور اسے اور بھی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ مگر ازمنۂ تاریخی کے یونان میں اسپارٹا کی حالت سب سے علیحدہ سی ہے۔ اگر ہم ایتھنز کو لیں تو اس کا اثر دل پر کچھ اور ہی پڑتا ہے اور ہم اس بارے میں افلاطون کی دلیل پہلے درج کر چکے ہیں کہ عمومیت عمدہ حکومتوں میں بدترین اور خراب حکومتوں میں بہترین حکومت ہے مطلب یہ ہے کہ اس میں حکمرانی بہت کم ہوتی ہے۔ یہ امر بالتخصیص اسپارٹا کے برعکس تھا۔

زیادہ قریب سے دیکھنے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو قدیم و جدید سلطنتوں میں دو عام فرق ہیں جن کی وجہ سے سلطنت کو دو طریقوں پر زیادہ مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ (۱) (قدیم سلطنت میں) مذہب و سلطنت کے فرق کا پتا نہیں تھا، اس لئے بالطبع یہ خیال ہوتا ہے کہ مذہبی رسوم کا اجرا و انضباط عام حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ ارسطو پجاریوں اور دوسرے مذہبی کارکنوں کو لازماً سلطنت کے عہدہ داروں میں شامل کرتا ہے اس سے از خود یہ بات پیدا ہوئی کہ "عدم احترام مذہبی" ایک ایسا معاملہ تھا جس کے لئے عام جرم کے طور پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا[2] (۲) جنگ کا زور، اور اس لئے شہریوں کے جنگی فرائض کا (خاص کر صنعت و حرفت کے مقابلے میں) غلبہ، اس کی رفتار زیادہ تر تمدن کے پست تر درجہ پر تھی جس میں جنگ کی ناکامیابی کی وجہ سے بہت زیادہ مصائب کا پیش آنا ممکن تھا۔ بایں ہمہ، یونانی سلطنتوں کا انگلستان یا ممالک متحدہ امریکہ سے مقابلہ کرتے وقت اگرچہ یہ فرق بہت نمایاں نظر آتا ہے لیکن مغربی یورپ کی براعظمی سلطنتوں کے مقابلے میں یہ فرق بہت زیادہ قوی نہیں ہے خاص کر جبکہ چوتھی صدی میں اجیر سپاہیوں سے کام لینے کی وجہ سے عام شہریوں کے دلوں سے لڑنے کا خوف اٹھ گیا تھا۔

[1] خطبہ ہفتم

[2] سقراط کا مقدمہ اسی نوع کا ہے تاہم، ارسطو فانیس یہ ظاہر کیا ہے کہ احترام کا فرض مذہبی کی سی سختی کے ساتھ ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔

مذہب و جنگ کو علیحدہ کر کے، اگر ہم اہل ملک کی پر امن دنیاوی زندگی میں قومیت و وقعت کی طمانیت کے لحاظ سے، اور جائداد، معاہدہ و وراثت کے معاملات میں، حکومت کی مداخلت پر غور کریں تو کوئی ایسا اصولی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ جب ہم ایتھنز کے سرکاری و شخصی کاموں کی فردیا ناں کے عہدہ داروں کی فہرست پر نظر کرتے ہیں یا ان عہدوں کو دیکھتے ہیں جنھیں ارسطو نے حسب معمول قرار دیا ہے تو ہمیں کسی حد سے بڑھے ہوئے قدغن کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ ہم بازاروں کے نگران (یعنی محتسب) کا ذکر سنتے ہیں جس کا کام دغا و فریب اور بدنظمی کو روکنا تھا۔ اس میں شہر کے کمشنر (ماہور) کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جس کا یہ کام تھا کہ سرکاری سڑک کو لوگوں کے ذاتی مکانوں میں دب جانے سے بچائے رکھے لیکن دغا و فریب بدنظمی اور سرکاری سڑکوں کے دبا لینے کی روک تھام یہ ایسے معاملات ہیں جو نہایت ہی سخت انفرادی نظم کے اندر بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ دخل دہی کے انواع و اقسام میں ایتھنز میں صرف ایک اہم صورت ایسی تھی جسے زمانۂ جدید کے انفرادی خیالات سے نمایاں طور پر مختلف قرار دے سکتے ہیں، وہ صورت یہ تھی کہ مصنوعی طور پر سامان زیست کے وافر حصول کے لئے نہایت مشرح و شدید ضوابط مقرر کئے گئے تھے۔ غلے کی درآمد ممنوع قرار دیگئی تھی، ایتھنز کے سوا کسی اور بندرگاہ کی طرف غلہ بھیجنا ایک ایسا جرم تھا جسکی سزا موت تھی ایتھنز کے بندرگاہ پر ائیوس میں جو غلہ غیر ملکی جہازوں پر آتا تھا اس کا دو ثلث ایتھنز میں فروخت کرنا ضروری تھا، بازار میں غلے کی خریداری یا اس کی قیمت بڑھانے کے متعلق سازش کرنے کی سزا موت تھی، دس یا میس "ناظران غلہ" درآمد غلہ کی یادداشت تشریحی مرتب رکھتے اور یہ دیکھ بھال کرتے رہتے تھے کہ اجناس مناسب قیمت پر فروخت ہوں، چکی والے جو کے آٹے کی قیمت ایسی لیں کہ وہ جو کی قیمت سے مناسبت رکھتی ہو اور نان بائی روٹی کے دام گیہوں کی قیمت سے مناسب رکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ضابطہ اتنا سخت و شدید تھا کہ جدید یورپ میں اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی تاہم آدم اسمتھ کا اثر پڑنے کے قبل تک، جدید یورپ کا اقتصادی خیال بھی اسی طریقے کے عام انداز کی کلی تائید میں تھا۔

بہر حال جہاں تک عام شہری زندگی (معاشرت) اور معاملات کا تعلق ہے، ان کے متعلق، جن حکومتوں کو زمانۂ قدیم کی "مختار مطلق" حکومت کہتے ہیں، ان کے اور زمانۂ جدید کی حکومتوں کے عملدرآمد میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ہے۔

۲۔ لیکن جب ہم قدیم و جدید خیالات کے مطابق حکومت کے ساتھ قانون کے عام

تعلق پر بحث کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس مقابلے کا نتیجہ کچھ اور ہی برآمد ہوتا ہے
حکومت کے لئے قانون سازی کا جدید خیال، قدیم خیال کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے، تہذیب
کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس تعلق کا عام خیال بھی مختلف مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ ارتقا
کے مدارج سابقہ کے مقابلے میں مدارج مابعد میں یہ تعلق مختلف اور زیادہ قریبی نظر آتا ہے
حکومتی فرائض کے متعلق اپنے اس زمانے کے خیال کے مطابق ہم عام طور پر (۱) تشریعی
(۲) عاملانہ[۱] اور (۳) عدالتی فرائض کے امتیازات قائم کرتے ہیں اور جس حصے[۲] سے مقصد
اول پورا ہوتا ہے اسے بالطبع اعلیٰ قرار دیتے ہیں کیونکہ اس حصے سے ان قواعد کا تعین وتشخص
ہوتا ہے جن پر حکام عدالت کاربند ہوتے اور حکام عاملانہ انھیں نافذ کرتے ہیں اور طبعاً یہ حصہ
ہمیشہ مشغول بکار رہتا ہے، بیشک ہم یہ فرض نہیں کرتے کہ کوئی خاص مجلس وضع قوانین جبقدر
تغیرات عمل میں لائے گی وہ ان تغیرات کے مقابلے میں جو پہلے سے چلے آرہے ہیں کوئی
بڑی نسبت رکھتے ہوں گے مگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ از روئے آئین اس مجلس کو یہ حق
حاصل ہوتا ہے کہ وہ قدیم قوانین کے جس حصے کو چاہے بدل دے، یہ حق خواہ معمولی مجلس
وضع قوانین کو حاصل ہو یا جماعت مرتب نظام سلطنت کو ہو[۲] اور نیز یہ کہ
معمولی مجلس وضع قوانین جسے گاہ بگاہ جماعت مرتب دستور (نظام سلطنت سے امداد
ملتی رہتی ہو' اس کا عام فرض یہ ہے کہ حالات ظاہری کے تغیر یا خیالات واحساسات کے
تبدل سے نظم معاشرت کی ترقی جن تغیرات کی متقاضی ہو انھیں برابر جاری کرتی رہے، ہم
یہ خیال کرتے ہیں کہ جو قانون غیر مبدل رہتا ہے اس کی نسبت مناسب طور پر یہ رائے
قائم کی جاسکتی ہے کہ اس کا قیام اس وجہ سے ہے کہ مجلس وضع قوانین یا جماعت
دستور ساز جسے اسکے بدلنے کا اختیار ہے وہ اس میں تبدیلی نہیں کرنا چاہستی،

---

[۱] میں یہاں پر ان قوتوں[؟] حکومت کے داخلی فرائض کی نظر سے بحث کرتا ہوں غیر ملکی معاملات کے لئے "عاملانہ" کا لفظ
ایک ناقص لفظ ہے، غیر ملکی معاملات میں بہت کم معاملات عام قواعد کے تحت میں منضبط ہو سکتے ہیں۔

[۲] اس فرق کو بالعموم جدید سلطنتوں میں ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کچھ اساسی قواعد یا اصول ایسے ہوتے ہیں جو سیاسی دستور
سلطنت کے جزو ہوتے ہیں اور کچھ عام قواعد ہوتے ہیں۔ انگریزوں کو اس پر سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت
ہے کیونکہ ان کا دستور سب سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جس میں یہ فرق باضابطہ طور پر داخل نہیں کیا گیا ہے

اور اس طرح ہم آسٹن کے تصور تک پہنچ جاتے ہیں کہ قانون ایجابی، ان احکام و قواعد کے مرادف ہے جو کسی فرد واحد، کسی جماعت یا کسی مجموعۂ جماعات نے صادر کئے ہوں اور آخر میں وہ سب پر حاوی ہوگیا ہو، پس اس طرح قانون و حکومت کے اساسی تخیلات میں باہم عمیق و ناممکن التفریق تعلق موجود ہے۔

مگر قانون اور مقتدر اعلیٰ یا حکومت اعلیٰ کے عمیق تعلق کا یہ خیال ارتقا کے زیادہ قدیم مدارج پر عائد نہیں ہوتا ہے، مین کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ امر اچھی طرح واضح و روشن ہے کتاب "قانون قدیم" باب اول و دوم سے ارتقائے قانون کی بحث میں اس کے برعکس مفہوم پیدا ہوتا ہے اور "ادارات کی تاریخ قدیم" کے باب دوازدہم و سیزدہم میں آسٹن پر تنقید کرتے ہوئے زیادہ صاف الفاظ میں اس کا دعوی کیا گیا ہے۔ مین نے یہ دکھایا ہے کہ آریہ نسل کی ابتدائی حالت میں "وہ جماعت کارکن جو ابتدائی گروہوں میں بمنزلہ ہماری مجلس وضع قوانین کے ہوتی تھی، وہ دیہی تھی، کبھی تو یہ جماعت گاؤں میں بسنے والے تمام لوگوں کو جواب دہ ہوتی تھی اور کبھی کسی موروثی سردار کا اقتدار و اثر اس پر حاوی ہوجاتا تھا مگر کلیتہً ناپید کبھی نہیں ہوتی تھی"[۱] لیکن جیسا کہ اس نے تشریح کی ہے، جب ہم گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ دیہی مجلسیں حقیقت میں قانون ساز نہیں ہوتی تھیں "مجلس دیہی کو انواع و اقسام کے جو اختیارات سپرد کردئے جاتے تھے، وہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتے تھے اور نہ صاف طور پر یہ عیاں ہوتا تھا کہ قانون بنانے، قانون کے اعلان کرنے اور قانون کے خلاف ارتکاب جرم کرنے والے کو سزا دینے میں کیا بین فرق ہیں، اگر اس جماعت کے اختیارات کو جدید اصطلاحات میں ظاہر کرنا ضروری ہو تو جو اختیار سب سے زیادہ پس پشت نظر آئے گا وہ تشریعی اختیار ہوگا اور جو سب سے زیادہ نمایاں ہوگا وہ عدالتی اختیار ہوگا۔ جن قوانین کی اطاعت ہوتی تھی ان کی نسبت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ سے قائم ہیں، اور جو رواج واقعی نئے ہوتے تھے ان کو واقعی پرانے رواج کے ساتھ خلط ملط کردیا جاتا تھا، پس دیہی جماعتیں جب تک کہ وہ قدیم اثر کے تحت میں رہتی تھیں، اصلی قانون سازی کے اختیار کا استعمال نہیں کرتی تھیں"[۲] اور یہ آخری بیان ان وسیع تر جماعتوں

[۱] ۔ "ادارات کی تاریخ قدیم"، صفحہ ۳۸۸۔

[۲] ۔ "ادارات کی تاریخ قدیم" صفحہ ۳۸۸ - ۸۹

کی نسبت بھی صحیح ہے جو حقیقی یا فرضی قرابتداروں کے جداجدا آبادکاریوں میں زیادہ قریبی ارتباط پیدا کر کے قائم کی جاتی تھیں، جیسا کہ یونان کی شہری سلطنتوں کے آغاز تاریخ میں نظر آتا ہے۔ وہ عام قواعد جو اہل قبائل کے معاشری عادات واطوار پر حکمراں ہوتے تھے وہ کسی حکمراں فرد یا جماعت کے عام احکام نہیں ہوتے تھے، بلکہ قدیم ترین وقت میں جسکی جھلک ہومر کی نظموں میں نظر آتی ہے، ہنوز یہ امور درحقیقت قطعی طور پر عام قواعد سمجھے ہی نہیں جاتے تھے، بقول مین، "حق و باطل کا با اقتدار بیان صرف وہ عدالتی فیصلہ ہوتا تھا جو ظہور واقعات کے بعد[ع۱] قدیم زمانے کے بادشاہ کی طرف سے جو واضع قانون کی حیثیت سے نہیں بلکہ جج کی حیثیت سے صادر ہوتا تھا۔

تاریخی دور کے آغاز کے وقت یہ حالت گزر چکی تھی، اور جیسا کہ میں خطبۂ چہارم میں بیان کر چکا ہوں جب یونان میں قدیم بادشاہی کے بجائے ابتدائی عدیدیت قائم ہوئی تو اس وقت ملک قطعی طور پر اس زمانے میں پہنچ گیا تھا جسے مین "قانون رواجی کا دور" کہتا ہے، یہ قانون غیر تحریری ہوتے تھے مگر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ حکمران طبقے کو وہ قطعی طور پر معلوم تھے، اور معدودے چند حکمرانوں نے اپنے عدالتی فیصلوں کے اندر (جن میں اس رواجی قانون کا اعلان و نفاذ ہوتا تھا)، اسے کتنا ہی اپنے جماعتی مفاد کی طرف کیوں نہ پھیرا ہو، پھر بھی یہ صاف عیاں ہے کہ خود ان کو یا ان کے زیر حکم رعایا کو کبھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ ان قوانین کا وضع کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔

بعد ازاں، جیسا کہ میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں، غیر تحریری قانون کے عدیدی انتظام سے بددلی اور (باضافہ مین)، فن تحریر کی اشاعت کی وجہ سے، ان جماعتوں میں تحریری ضوابط کا عام رواج ہو گیا[ع۲] مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قانون کو کوئی ایسی شئے سمجھا جاتا تھا

ع۱۔ قانون قدیم صفحہ ۸۔

ع۲۔ دیکھئے خطبۂ ششم صفحہ ۹۸۔۹۰ مقابلہ کیجئے از مین: "قدیمی قانون"، باب اوّل۔ مین سے میں اس امر میں اتفاق نہیں کر سکتا کہ ان مجموعہائے قوانین میں عام طور پر نیا قانون نہیں شامل ہوتا تھا، مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سولن نے کس قدر جدت طرازی کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے نئے اضافوں کو مبالغہ سے بیان کیا گیا ہے مگر اس گمان کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں اس کے طبعزاد قانون کو مطلق دخل نہیں ہے۔

جس میں از روئے دستور حکومت آنکھ بند کرکے رد و بدل کرنے کی مجاز تھی، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے دل و دماغ میں اس خیال نے کبھی بھی کامل طور پر جگہ پائی ہو۔ ارسطو تک کے خیال میں قانون سازی کو وہ جگہ نہیں حاصل ہے جو اسے حکومتی فرائض کی زمانہ جدید کی کسی تجویز میں حاصل ہوگی۔ ارسطو، حکومتی فرائض میں قانون سازانہ، عاملی اور عدالتی فرائض کے امتیازات نہیں قائم کرتا بلکہ وہ ان فرائض کو مباحثی، عاملی یا ناظمی اور عدالتی فرائض میں منقسم کرتا ہے، اور مباحثی جماعت خواہ کسی عمومیہ کے شہریوں کی جماعت عام ہو یا کسی عدیدیہ کی جماعت محدود ہو، دونوں میں اس کے فرائض کے اندر اگرچہ قانون سازی کا ذکر آگیا ہے مگر اسے کوئی بلند جگہ نہیں دی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "مباحثی عنصر کو جنگ و صلح کے معاملات میں مخالفوں کے انفساخ و توکید میں اقتدار حاصل تھا، وہ قوانین کی منظوری صادر کرتا، موت، جلاوطنی، ضبطی جائداد کی سزائیں دیتا، اور حکام کے حسابات کی تنقیح کرتا تھا"[عله]۔ صاف عیاں ہے کہ یہاں پر وضع قوانین کی حالت بالکل ثانوی ہے، اور ارسطو نے کسی دوسری جگہ اس کے متعلق دلیل بھی دی ہے کہ کیوں ترمیم قانون کا اختیار (جسے صاحب اقتدار اعلیٰ کے سپرد ہونا چاہئے) علی التسلسل عمل میں نہ آنا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ "گاہ بگاہ، خاص خاص صورتوں میں قوانین میں تغیر ہونا چاہئے، مگر اس میں بڑی حزم و احتیاط کی حاجت ہے، کیونکہ سہل طریقے پر قانون کے بدلدینے کی عادت ایک خرابی ہے، اور جبکہ اس کا نفع کم ہو تو شارع کی بعض غلطیوں کو بدستور چھوڑ دینا بہتر ہے، اس تغیر سے اہل ملک کو اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا صاحب اقتدار کی عدم اطاعت کی عادت سے نقصان ہوگا۔ فنون سے اس کی مشابہت غلطی میں ڈالنے والی ہے، کسی فن کے قواعد میں تغیر اور ہی چیز ہے اور قوانین سلطنت کا تغیر ایک دوسری ہی شئے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قانون کی قوت کا انحصار اطاعت کی عادت پر ہے اور یہ عادت مرور ایام ہی سے پیدا ہو سکتی ہے چنانچہ قدیم قوانین کو بدل کرنے، قوانین نافذ کرنے کے لئے آمادہ رہنے سے قانون کی قوت میں ضعف آجاتا ہے"[عله]۔

دیکھنا یہ چاہئے کہ ارسطو نے قانون کے تغیر کا اس طرح ذکر کیا ہے گویا کہ وہ حکومت کی

عله۔ "سیاسیات" کتاب ۶ (۴)، باب چہاردہم۔

عله۔ "سیاسیات" کتاب ۲۔ باب ہشتم۔

عدم اطاعت کے مترادف ہے'۔ اس سے میرے خیال میں پرزور طور پر یہ فرق ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارے نظم معاشرت میں وضع قوانین کو سیاسی زندگی کا ایک معمولی عنصر خیال کیا جاتا ہے۔ اور ارسطو کی تصنیف کے مطالعہ کرنے والے بالطبع اس کی نسبت کچھ اور ہی رائے رکھتے تھے۔ اگرچہ ایتھنز اور یونان کی دوسری شہری سلطنتوں میں قوانین برابر بدلتے رہتے تھے پھر بھی قانون کے متعلق اہل یونان کا خیال اس سے بہت دور تھا کہ وہ اسے محض مرضی عامہ کا حاصل سمجھے' درحقیقت ارسطو کی رائے ایک طرح کی دلچسپ درمیانی رائے ہے' ایک طرف وہ دور ہے جب قدیم غیر تحریری رسم و رواج کو قانون کی منزلت حاصل تھی یا کچھ تحریری قواعد ایسے تھے جن میں محض تاویل کے پیرایہ میں تبدیلی ہو سکتی تھی' اور دوسری طرف ہماری قانون سازی کا یہ جدید دور ہے جس میں حکومت اعلیٰ کو معمولی طور پر قوانین میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ارسطو کی رائے ان دونوں کے بین بین ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک جانب تو وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ مباحثی جماعت (اور عمومیت میں ایک ذی اقتدار جمعیت عوام) وضع قوانین کے معاملات میں سب سے اعلیٰ ہوتی ہے' اور دوسری جانب وہ اس عمومیت کو بدترین قسم کی عمومیت قرار دیتا ہے جس میں جمعیت عوام کے فیصلے مسلمہ قوانین پر غالب آجاتے ہوں حقیقت یہ ہے کہ کامل ترقی یافتہ عمومیت کے دور یعنی چوتھی صدی میں ایتھنز کے اداروں قانون کے متعلق اس رائے و خیال کے موافق تھے کہ قانون کوئی ایسی شئے ہے جس میں تغیر تو ہونا چاہئے مگر سہل طور پر اس میں ترمیم کرنا خطرناک تھا۔ اولاً (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں[1]) اگرچہ صرف اہل ایتھنز کی جمعیت ہی قانون میں تغیرات کی ابتدا کر سکتی تھی مگر آخری فیصلہ اس جمعیت کا نہیں ہوتا تھا' آخری فیصلہ مقننین کی ایک منتخب جماعت کو سپرد ہوتا تھا جو دس سال کے پابند سوگند جوریوں میں سے اس موقع کے لئے مقرر کی جاتی تھی۔ ثانیاً یہ کہ اس سے زیادہ حیرت افزا یہ ہے کہ کسی غیر مصلحت آمیز قانون کا پیش کرنا قابل مواخذہ جرم تھا' جس کے لئے ایک سال بعد تک مقدمہ چلایا جا سکتا تھا' اس زمانۂ جدید کے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال اس درجہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ ایک ممتاز عالم ماڈوگ نے اس کے غیر ممکن ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ قانون کی غیر مصلحت آمیزی ایک خارج از بحث سوال تھا' جسے فیصلہ صادر

---

[1] خطبۂ ہفتم۔

کرنے والی عظیم التعداد عام جوری پر اثر ڈالنے کے لئے یونانیوں کے انداز میں شاعرانہ طور پر زیر بحث لایا جاتا تھا ورنہ اصل مقدمہ کی بنا صرف یہی ہوتی ہوگی کہ وضع قوانین کے لئے قانوناً جو طریقہ معین تھا اس کی تطبیق میں کوئی کوتاہی ہو جاتی ہوگی، مگر اتھینز کے دستور سلطنت کے جو حالات اور حال میں دریافت ہوئے ہیں ان سے کوئی شک اس امر میں باقی نہیں رہتا کہ قانون کی غیر مصلحت اندیشی باضابطہ طور پر مقدمہ کی بنا تسلیم کی جاتی تھی[1]۔

۳۔ اب ہم روما کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہاں ہم زیادہ مکمل طور پر یہ پتا چلا سکتے ہیں کہ حکومت کے معمولاً وسلسلاً تشریعی ہونے کا خیال و واقعہ کس طرح سے صورت پذیر ہوا یہ ضرور ہے کہ وہ پہلا درجہ جس میں "قانون" رواج کے بہ نسبت زیادہ تر "عادت" تھا اس کا پتہ تاریخی طور پر اتنا نہیں چلتا جتنا ہم اسے فرض کر لیتے ہیں[2]، یہ وہ حالت تھی جس میں خاندان، جائداد اور معاہدے کے ادارات اصلاً و واقعاً عہدی شکل میں تھے، جس میں قبیلے کے ارکان معمولاً ان باہمی ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے جو ان ادارات کے ہوتے ہوئے لازم تھے مگر انھیں یہ احساس و ادراک نہیں ہوتا تھا کہ ان کا ایسا کرنا کسی قاعدے کے تحت میں ہے، جب ان مستور قواعد میں سے کسی قاعدے کی نمایاں طور پر خلاف ورزی ہوتی تھی اور مناقشہ برپا ہوتا تھا صرف اس وقت اس کے تصفیے کے لئے کسی مسلمہ رواج کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، اور جب قواعد کی خلاف ورزی نہایت درجہ سخت و شدید سمجھی جاتی تھی، اس وقت اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس خلاف ورزی کرنے والے کو قوم کے خلاف ارتکاب جرم کا ملزم قرار دیا جائے۔ بیشک اس قانونی حکم سزا کا صدور بادشاہ کی طرف سے ہوتا تھا، جس کے داخلی فرائض غالباً اور حکموں کی طرح یہاں بھی ابتدا میں زیادہ تر عدالتی ہوتے تھے۔ یہیں سے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس عادت سے بتدریج ان صریحی غیر تحریری رواج یا قوانین کے احساس و ادراک نے نشو و نما پائی جنھیں اہل روما احترام و افتخار کی نظر سے دیکھتے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ رواج و قوانین ان کی خاص ملک اور ان کے دوسرے ہموطنوں کی زیادتی اتحکم، ظلم و ستم کے مقابلے میں ان کا خاص ذریعۂ حفاظت ہیں، مگر جب تک کہ قانون غیر تحریری رہا اس وقت تک اس امر کی حفاظت

[1] ۔ "دستور اتھینز" ۵۹
[2] ۔ مقابلہ کیجئے مین کی تصنیف "قانون قدیم" صفحہ ۸ ۔

کافی ووافی نہیں ہوتی تھی کہ حاکم کو یہ ترغیب نہ ہو کہ جس طبقے سے اس کا تعلق تھا اس کے مفید مطلب رواجی قانون میں تاویلات کردے یا اپنے طبقے کے کسی ستمگار رکن کی جانبداری کا میلان ظاہر کرے۔ یہیں سے ایک مجموعۂ ضوابط کا تقاضا شروع ہوا جس کا انجام (۴۵۰ق م کے قریب) بارہ تختیوں کے قانون پر ہوا جسے "عشاریہ" کے مشہور کمیشن (مامورین) نے مرتب کیا تھا۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ مشہور مجموعۂ ضوابط غیر تحریری قانون کو بعینہ تحریری جامہ پہنا دینے پر بس نہیں کرتا تھا جیسا کہ مین کا خیال ہوگا (قانون قدیم صفحہ ۱۴-۱۵) بلکہ اسمیں غیر تحریری قانون سے کچھ باتیں زیادہ تھیں اور کچھ کم۔ کم اس وجہ سے کہ متعدد شاخہائے قانون جن کی نسبت (ہمارے خیال میں) کوئی شدید بحث نہیں پیدا ہوئی تھی صرف اتفاقی و جزوی طور پر زیر بحث لائے گئے تھے۔ یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ ادارات خاندان، وراثت کے قوانین اساسی (وغیرہ) اور قانون انتقال جائداد، معاہدہ و قرضہ کی قانونی طرز تحریر کے ایسے نہایت ہی اہم اور مانوس عام قوانین کا علم عام طور پر لوگوں کو ہوگیا ہے۔ مختصر یہ کہ بارہ تختیوں کا عملی مقصد یہ تھا کہ طبقۂ پلیب جن حصص قوانین کے متعلق غیر مساویانہ، ناقص یا اپنے لئے آزاردہ ہونے کی شکایت کرتے تھے ان کا اعتماد عود کر آئے، اور جن معاملات کے متعلق قانونی قواعد وضع ہوئے ان کا تعین اس عملی مقصد کو پیش نظر رکھکر ہوا تھا، لیکن دوسرا امر یہ ہے کہ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ حق کے متعلق رومانیوں کا احساس، رسم ورواج اور روایات قدیمہ کے ساتھ اس قدر مضبوطی کے ساتھ وابستہ تھا کہ ان کے لئے بیرونی دنیا کی کسی بڑے یا اہم تغیر کا قبول کرنا بعید تھا، پھر بھی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مجموعۂ ضوابط کے مرتب ہونے سے قبل ایک وفد یونان اور جنوب اطالیہ کے یونانی شہروں کو اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے قوانین کا مطالعہ کرے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بارہ تختیوں میں سولن کے وضع کردہ قوانین کی تقریباً بالفظی نقل شامل ہے، تو پھر میری رائے میں یہ خیال کرنا دشوار ہے کہ اس وفد کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ رواجی قانون جو ناقابل تبدیلی سمجھا جاتا تھا، اسے کس طرح بیان کیا اور ترتیب دیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ سابق کے سلسلۂ قانون میں کچھ رد و بدل قبول کیا گیا تھا، اور رومانی اس قانون کے نفس مطلب اور اس کی شکل ظاہری دونوں کے متعلق یونانیوں کی دانش سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار تھے۔ دس اشخاص کا وہ مامور یہ جسے ترتیب ضابطہ کا کام سپرد ہوا تھا، اس کی نسبت یہ سمجھنا چاہئے کہ کسی حد تک اسے قانون سازی کا بھی اختیار دیا گیا تھا، اگرچہ

اس میں شک نہیں کہ جو تغیرات داخل کئے گئے تھے وہ مجموعی تناسب کے لحاظ سے زیادہ نہیں تھے۔ ایک قوم جس نے (تقریباً ۵۰۹ سنہ ق م میں اپنے رواجی قانون عامہ میں اس قدر عظیم تغیر کیا ہو کہ بقول مین "شاہی کو محض ایک مامور یہ مرکب کی حیثیت دیدی ہو" اور اس طرح اس نے اس آئینی تغیر کی زندگی میں قدم رکھ دیا ہو جس پر ترتیب ضابطہ کے وقت تک پچاس برس سے زائد گزر گئے تھے، ایسی قوم کی نسبت درحقیقت یہ خیال دل میں لانا مشکل ہے کہ وہ ہنوز اپنے شخصی قانون (یعنی اہل ملک کے باہمی تعلقات) کے انضباطی قانون کی بابت یہ سمجھتی ہو کہ یہ قوانین (اہل مدیہ اور ایرانیوں کے قوانین کے مانند) بالکل ہی ناقابل تغیر تھے اور اگرچہ اس مجموعۂ ضوابط کی اشاعت کے بعد دو صدی سے زائد تک شخصی قانون میں بہت کم تبدیلی کی گئی پھر بھی یہ طریقہ بالکل معدوم نہیں ہوگیا تھا، چنانچہ ہم ایسے قوانین کا حال پڑھتے ہیں جن کا تعلق ازدواج، سود، دستاویزی قرضہ، مقدمات قرضہ کے تغیرات، اور جائداد وغیرہ کے نقصان کے معاوضے سے تھا۔

۴۔ بایں ہمہ اگرچہ قوانین کسی قدر بنتے رہتے تھے لیکن اس دور بلکہ فی الحقیقت اس کے بعد کی کئی صدیوں تک قوانین کا وضع کرنا وہ وسیلہ نہیں تھا جسکے ذریعہ سے معاشری حوائج واحساس کے تغیرات کے حسب خواہ، قانون کا نشوونما عمل میں آتا رہا ہو، دو صدیوں سے زائد تک قانون میں تغیر کرنے کا خاص طریقہ تاویل کے پردے میں "علما کے جوابات" پر چلتا رہا، ابتدائً ایک مذہبی سے یہ کام لیا جاتا رہا بعد میں پیشہ ور مقنن اسے انجام دینے لگے۔ مین ارتقا کے اس طریقے کو اُس طریقے کے مثل قرار دیتا ہے جس سے انگریزی قانون عامہ میں عدالتی فیصلوں کے ذریعے سے ترمیم ہوا کی ہے، فرق صرف یہ تھا کہ انگلستان میں جو جج حقیقتاً قانون میں تغیر کرتا مگر ظاہر یہ کرتا ہے کہ وہ قانون کی تشریح کر رہا ہے، وہ خود ایک اول درجے کا ماہر قانون ہوا کرتا تھا اس کے برعکس، روما میں جو حاکم قانونی کارروائی کا نگران ہوتا تھا وہ قانون داں ہونے کی بہ نسبت زیادہ تر مدبر ہوتا تھا، [چنانچہ ۳۶۷ سنہ ق م تک قنصل اور اس کے بعد پریٹر (Pruetor) اس کام کو انجام دیتے رہے ہیں۔] پس اس دور اول میں بقول مین، "روما میں حقیقی تغیر کن اثر وکلا کا تھا نہ کہ منصفوں کا" اور جس قدر تہذیب و تشخص میں ترقی ہوتی گئی، اسی قدر ذی علم مشیران قانونی روز بروز مقننوں کا ایک پیشہ ور طبقہ بنتے گئے۔

یہ عیاں ہے کہ تاویل کے پردے میں قانون کے اس طرح بدلنے کا طریقہ خود

اپنی ہی کامیابی کی وجہ سے محدود و محدود تر حلقے میں مقید ہوتا گیا، کیونکہ تاویل کے ذریعے سے ابتدائی غوامض جسقدر یکے بعد دیگرے صاف و مشخص ہوتے گئے، اسی قدر معتد بہ تغیرات کا امکان مزید گھٹتا گیا۔ پس اگرچہ مشیران قانون (Prudentes) کی محنت بڑھتی جاتی تھی اور فی الحقیقت روز بروز یہ کام ماہرین کا ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ روز بروز یہ کام حقیقتاً تاویل ہی کا کام ہوتا جاتا تھا، اور اس ذریعے سے قانون میں اہم رد و بدل نہیں ہوتے تھے۔

جب صورت حال اس حد تک پہنچ گئی تو پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری طرز تبدیلی وضع قوانین ہی ہو گیا ہو گا اور جمہوری دور کے اختتام کے قریب جمعیت عامہ کی قانون سازی، نئے قوانین کا ایک زوردار سرچشمہ بن گئی ہوگی، مگر اس سے قبل انگریزی قانون کی طرح رومانی قانون میں بھی ایک دوسرا طریقہ زور کے ساتھ عمل میں آ رہا تھا، یعنی حکام اپنی معدلت گستری کے عمل سے قانون کو بہت کچھ زیر کر دیتے تھے۔ روما میں، جمہوریت کی تاریخ کے آخری حصے میں، اس کا خاص آلہ پریٹر کے فرامین ہوا کرتے تھے جن میں ہر سال یہ اعلان ہوا کرتا تھا کہ پریٹر اپنے دوران کارگزاری میں کن کن مفاسد کا کیا علاج کرے گا۔ یہ فرمان اگرچہ قطعی طور پر صرف ایک ہی برس کے لئے نافذ العمل رہتا تھا مگر عملاً ایک حاکم سے دوسرے حاکم کی طرف منتقل ہو جاتا تھا اور انسان اپنی عقل و رائے سے جس امر کو حق و صواب سمجھتا تھا، اس کے موافق قانون میں تغیر کرنے کا یہ ایک مسلسل ذریعہ تھا۔

اور اس میں شک نہیں کہ حاکم غیر ملکیاں Praetor peregrinus کے ہاتھ میں جا کر اس کارروائی میں قانون اجانب (Jus gentium) کے نشو و نما سے مدد ملگئی تھی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ حاکم غیر ملکیاں وہ حاکم تھا کہ جس کا تقرر اواسط تیسری صدی قبل مسیح کے بعد ہی اس خاص اختیار کے ساتھ عمل میں آیا تھا کہ غیر ملکیوں یا رومانیوں اور غیر ملکیوں کے مابین جو قانونی تنازعات پیدا ہوں ان کا تصفیہ کرے۔ ادھر رومانی قانون بلدیہ میں حاکم بلدیہ Praetor urbans کے فرامین سے ترمیمات ہو کر ترقی ہو رہی تھی اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شخصی قانون کے ایک ایسے منتظم طریق کے عمل میں لاتے سے جس کا نفاذ غیر ملکیوں اور رومانیوں دونوں پر ہوتا ہو (اور جو ان قدیم شہری سلطنتوں کی تاریخ میں ایک نیا امر تھا) اس کا اثر بازگشت ان بلدی قوانین کی ترقی پر بہت ہی اہم ہوا تھا۔

۵۔ یہ صاف عیاں ہے کہ اس قسم کے قانون کی ترقی جسے بعد میں "قانون اجانب"

(Jus gentium) کہنے لگے تھے، تمام تر عملی ضروریات کی وجہ سے ظہور میں آئی تھی، اور ہم اس کا تعلق رومانی تجارت کے نشو و نما کے ساتھ قرار دے سکتے ہیں۔ فتوحات سے جس قدر روما کی قوت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اسی قدر اس کی تجارت میں ترقی ہوتی جاتی اور اس کی وسعت و سمت بڑھتی جاتی تھی۔ صور، قرطاجنہ، یونان، سسلی، مسالیہ وغیرہ کے غیر ملکی تاجر روما میں کاروبار قائم کرنے کے لئے آگئے تھے، اور غیر ملکیوں کی اس آمد سے اجنبیوں کا شمار یوماً فیوماً برابر بڑھتا جاتا تھا۔ بعد ازاں تیسری صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے دوران میں یونانی اثر کی وجہ سے روما میں اجنبیوں کے متعلق زیادہ وسیع الخیالی پیدا ہوئی اور اسے قوت حاصل ہوتی ہوگی۔ اس لئے قانونِ اجانب کی ترقی کے لئے یہ دور ایک طبیعی زمانہ رہا ہوگا اور اس قانون کی بنا لامحالہ ایسے اصول پر رہی ہوگی جنھیں ان مختلف اقوام کے ارکان جن کے لئے یہ قانون وضع ہوا تھا عام طور پر قابل پذیرائی سمجھتے رہے ہوں گے۔[1] ابتداً اس کی نسبت کسی نہج سے یہ خیال نہیں تھا کہ یہ روما کے ملکی قانون سے فائق تھا بلکہ اس کے برعکس یہ موخر الذکر قانون شہریوں کا امتیاز خاص تھا، اور روایتی خیال کے موافق دوسری سلطنتوں کے شہری محض معاہدے کے ذریعے سے جزاً اس میں شرکت کر سکتے تھے۔

---

[1] قانون اجانب کے متعلق مین نے اپنی تصنیف "قانون قدیم" کے باب سوم میں مختلف اطالوی قوموں کے حالات پر نظر کر کے کسی قدر زائد از ضرورت دانستہ تحقیق و استقرا کا خیال ظاہر کیا ہے، مگر میرے خیال میں یہ عمل اس طرح پر نہیں ہوا ہے، وجہ یہ ہے کہ (۱) ہمیں اطالیوں کے ساتھ ہی ساتھ یونانیوں اور قرطاجنوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ حاکم غیر ملکیاں کے تقرر کے بہت پہلے سے روما، قرطاجنہ سے ایک معاہدہ کر چکا تھا، اور (۲) یہ کارروائی کسی باقاعدہ تحقیق و استقرا کی صورت میں نہیں ہوئی تھی، انصاف کرنے کی کوشش نے انھیں اس راستہ پر لگایا کہ قانون کے عنصر مشترک پر توجہ کریں۔ قانون اجانب کی ترقی کو تمام و کمال حاکم غیر ملکیاں کے کام کی طرف منسوب نہ کرنا چاہئے۔ قانونِ اجانب کے نفاذ کے عملیات کا بہت بڑا حصہ ملکی تھا، محض اعزازی نہیں تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ایک بڑی حد تک اس کے اصول قانون ملکی کے اصول سے ماخوذ تھے۔ بایں ہمہ، حاکم غیر ملکیاں کے اثر کے اہم ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

لیکن محض اسی وجہ سے کہ مختلف اقوام کے معاملات پر جس قانون کا عملدرآمد ہوتا تھا وہ لامحالہ مختلف اقوام کے تاریخی خصوصیات سے معرا تھا، اس لئے وہ دقیانوسی ظاہر پرستیوں اور دقیانوسی پابندیوں کے اثرات باقیات سے بھی پاک تھا، لہٰذا رومانیوں اور ان کے ہمعصر قوموں کے اذہان حق طبعی و انصاف کے تخیلات کی جس منزل پر پہنچ گئے تھے اس کا اظہار اس قانون کے ذریعے سے زیادہ سادگی اور زیادہ تکمیل کے ساتھ ہوتا تھا اس لئے قانونِ ملکی کے مقابلے میں قانون اجانب آہستہ آہستہ فروتر حیثیت سے نکلکر برتر حیثیت پر پہنچ گیا۔ اولاً یہ کہ رومانیوں نے اصول پر نظر ڈالے بغیر یا قانون و مملکت (Res publica) کے حقیقی تعلق کے قدیم خیال کو کسی طرح پر ترک کئے بغیر اپنی قانون سازی کی عملی ذہانت کو ان ضرورتوں پر عائد کیا جو غیر ملکیوں کے روابط کی وجہ سے حقیقتاً محسوس ہونے لگی تھیں اور ایک بین الاقوام شخصی قانون مرتب کر لیا، اس کے بعد یونانیوں اور خاص کر رواقیوں کے فلسفے کے اثر سے ایک ایسے قانون فطری کے تصور کو غلبہ ہو گیا جو انسان پر بہ حیثیت انسان کے عائد ہوتا ہو اور جو مخصوص سلطنتوں کے احکام سے بالاتر ہو۔ آخری مرحلہ یہ تھا کہ جب روما نے ترقی کر کے عالمگیر حیثیت پیدا کر لی، اور رومانیوں کے زیادہ باعمل دلوں پر یونانی خیالات کا اثر پڑا تو قانون طبعی اور قانون اجانب کے تصورات متحد ہو گئے اور رومانی قوانین کے بعد کے تغیرات کے لئے بہت بڑا مخزن[1] مہیا ہو گیا۔ سیسرو کے وقت سے قبل اس امتزاج کا شروع ہونا معلوم نہیں ہوتا، بہ سن پہلی صدی قبل مسیح سے اس کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ سیسرو کے رسالہ میں قانون فطری اور قانونِ اجانب کا تعلق بہت ہی ابتدائی حالت میں ظاہر ہوتا ہے، اور فی الحقیقت وہی پہلا شخص معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے یونانی فلسفہ کو روما میں قبول عام حاصل ہوا، اگر اس کے وقت سے یہ فلسفہ برابر ترقی کرتا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی شہنشاہی کے مقنن کی تصانیف پر اس کا زبردست اثر پڑا ہے۔

---

[1] عله - مین کے اس خیال کو مشتبہ سمجھتا ہوں کہ رومانی ایک قانون فطری کے تصور کی وجہ سے یونانی قانون کے نقائص سے بچ گئے۔ نہ مجھے اس کی کوئی صاف شہادت نظر آتی ہے کہ بے حس و حرکت صلابت کے رد کرنے میں قانون فطری کا نظریہ کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ شہری سلطنت کی سیاسی عدم استقامت اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے کافی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ رومانی تاریخ دستوری سے ثابت ہوتا ہے۔

لیکن فی الواقع یہ امر میرے حدود بحث کے اندر داخل نہیں ہے کہ قانونِ اجانب نے پریٹر کے فرامین کے ذریعے سے نافذ ہو کر جو تغیر کن اثر پیدا کیا میں اس کے مکمل بیان کا کوئی سرسری خاکہ بھی کھینچ سکوں، مگر اس قانون کے عمل کے متعلق دو خاص شکلوں پر نظر ڈالنی چاہیے، جنکی توضیح وتشریح مین کے آخری ابواب میں ہوئی ہے۔

(۱) ورثہ کی تقسیم میں "رشتۂ خون کا لحاظ"۔ اس کی وجہ سے غالباً شہنشاہی دور کے اوائل میں، پریٹروں نے (بزرگ خاندان کے اقتدار سے) آزاد اولاد کو غیر پابند اولاد کے مساوی قرار دیا اور قدیم صلبی وراثت کے اصول کے مقابلے میں ذوی الارحام کے حقوق کو بھی تسلیم کیا۔ (۲) معاہدے یا دوسرے قانونی معاملت کے نفس مضمون کے متعلق ان کے ضابطے کے الفاظ سے جداگانہ، فریقین معاہدہ کے اصلی منشا پر لحاظ کیا جاتا تھا، جیسا کہ مین نے وصیت ومعاہدہ دونوں کے بارے میں واضح کیا ہے۔ یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ ان دونوں اصول میں سے ہر ایک اصول اور خاص کر موخر الذکر اصول، ان غیر ملکیوں سے متعلقہ نفاذ قانونی میں اغلباً پہلے شائع ہو جائے گا جو معاہدے اور وصیت کے متعلق رومانی ضوابطِ ظاہری سے واقف نہیں تھے یا اس سے کام نہیں لینا چاہتے تھے اور جن میں صلبی وراثت کا قدیم قاعدہ یا تو کبھی رائج ہی نہ تھا یا انھوں نے اس سے اپنی گلو خلاصی کر لی تھی۔

شائد یہ خیال ہو کہ میں نے ان معاملات پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا ہے جو ارتقائے نظم سلطنت کے مطالعہ کرنے والے کی بہ نسبت قانونی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ انجام کار میں جو تصور، رومانی معدلت گستری پر حاوی ہو گیا تھا وہ اگرچہ رومانیوں کے لئے محض قانونی اہمیت رکھتا تھا مگر ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ میں [۱] اسے بہت وسیع سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ قانون معدلت گستری کا یہ تصور تھا کہ قدرت کا ایک قانون اور کچھ فطری حقوق [۲] ایسے موجود ہیں جو بہ حیثیت انسان کے انسان کی ملک ہیں اور طبیعی قوانین وحقوق ان قوانین وحقوق قانونی سے زیادہ ارفع وواثق ہیں

[۱] ۔ جس مفہوم کو لاطینی میں (Jus) فرانسیسی میں (Droit) اور جرمن میں (Recht) کہتے ہیں اس کے لئے انگریزی میں الفاظ موجود نہیں ہیں لفظ (Laws) سے اکثر کام چل جاتا ہے مگر اس لفظ کا مفہوم حقوق وفرائض کا وہ مجموعہ مرکب ہے جو ازروئے قانون قائم ہوا ہے۔

[۲] ۔ مختصر الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح روما کے نشو ونما میں اس کا اثر قانون ملکی کی حدود میں اہمیت

جو کسی خاص سلطنت نے خود اپنے لئے مرتب کئے ہوں۔ درحقیقت یہ تصور خیالات کی اس تحریک کا ایک اہم جزو بن گیا تھا جس کا انجام انقلاب فرانس پر ہوا، کیونکہ اس قانون قدرت کے اصول یہی ہیں کہ "انسان ازروئے قدرت آزاد ہیں" اور "انسان ازروئے قدرت مساوی ہیں"۔

یہاں میں ایک نکتے پر نظر کروں گا جس کے متعلق مین کے بیان میں کچھ قید لگانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف "قانون قدیم" کے باب سوم میں یہ کہا ہے کہ "قانون اجانب اور قانون قدرت دونوں عملاً ایک دوسرے کے مترادف تھے اور اس میں شک نہیں کہ تقریباً تمام حالات میں یہ صحیح تھا، لیکن مخصوص اس مقابلے میں جس کا علم سیاسیات کے مطالعہ کرنے والے کی حیثیت میں ہم سے خاص تعلق ہے، قانون قدرت اور اقوام کے حقیقی مسلمہ قوانین کے درمیان رومانی مقننوں نے نہایت توضیح وقطعیت کے کے ساتھ ساتھ تخالف وتصادم کو تسلیم کیا ہے۔ اس قانون قدرت سے میری مراد اس اصول سے ہے کہ تمام انسان ازروے قانون آزاد ہیں۔ سب اس امر پر متفق ہیں کہ "قانون اجانب" کی روسے غلامی جائز ہے، اور میرا خیال ہے کہ وہ سب کے سب ایسے ہی اتفاق عام کے ساتھ اس کے بھی مقر ہیں کہ یہ امر قانون طبعی کے خلاف ہے، اور اس تضاد وتخالف پر وہ کسی قسم کی رنگ آمیزی کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ حقوق واقعی کے متعلق رومانی مقننوں کا جو خیال تھا اس کے لحاظ سے یہ "نظری آزادی" ظاہری نتیجے سے محروم رہجاتی تھی۔ وہ اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کرتے تھے کہ غلامی کو فوراً

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رکھتا ہے اسی طرح ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ میں اس کی اہمیت بین الاقوامی دا آئینی قانون کے حدود میں ہے۔ (خطبات بست وچہارم تا بست وششم دیکھنا چاہئے)، تاہم قدما کے خیال میں بھی بلند وثوق قانونِ قدرت کا تصور سلطنت کے خود اپنے قانون بنانے کی ہمہ گیری میں ایک طرح کے نظری توازن کا کام دیتا تھا؛ اس کا اطلاق ابتدائی شہنشاہی پر ہوا اور پھر قسطنطنین کے بعد کلیسا نے اس کی جگہ لے لی۔

عله۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق ک

یا جس قدر جلد ممکن ہو منسوخ کر دینا چاہیے"، مگر ان کے ازمنۂ وسطیٰ کے شاگردوں پر اس کا اثر بہت ہی مختلف پڑا، اور مسیحی جذبات کے پر زور اتحاد عمل سے ملکر اس اصول نے غلامی کی تنسیخ میں اس زمانے سے بہت ہی قبل اہم اثر پیدا کرلیا تھا جب کہ اس کا اثر ملکی قانون کی حد سے گزر کر دستوری قانون تک پہنچا، اور سنہ ۱۷۷۹ء کے اصول میں سے یہ بھی ایک اصول ہو گیا۔

خطبۂ سیزدہم

تقلیب بہ جانب تاریخ ازمنۂ وسطیٰ

۱۔ پہلے خطبے میں میں نے روما میں ارتقائے قانون کے متعلق مختصراً تحقیق و بحث کی ہے اور اس میں خصوصیت کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ فی الجملہ کتنے زمانے تک یہ قانون حکومت کی مداخلت سے آزاد رہا۔ جس منزل میں قانون کی حالت بقول مین رسم و رواج کے بہ نسبت عادت سے زیادہ تعلق رکھتی تھی اس منزل سے شروع کر کے ہم نے غیر تحریری رسم و رواج تک اس کا پتا چلایا، پھر جب یہ محسوس ہونے لگا کہ اس سے ظلم و جور کے لئے بہت زیادہ موقع ملتے لگا ہے، تو ۴۵۰ء قبل مسیح کے قریب اس رسمی قانون کے اہم اجزا کا مشہور و معروف انضباط عمل میں آیا۔ اس کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ کس طرح ایک مدت مدید تک ماہران قانون "وکلا" کے تاویلات کے پیرایہ میں قانون میں تغیر ہوتا رہا، اور مین جسے "رومانی نصفت شعاری" کہتا ہے اس کی ترقی کیونکر ہوتی رہی، بعد ازاں روما کی تجارتی نشو و نما کی وجہ سے غیر ملکیوں کے آپس کے یا غیر ملکیوں اور رومانیوں کے باہمی مقدمات کے فیصلے کے لئے مختلف اقوام کے مشترک و مساوی اصول کی رو سے ایک نظم قانون بنام قانون اجانب کیونکر تیار ہو گیا پھر کچھ زمانے کے بعد یونانی تخیلات کے زیر اثر انسان بہ حیثیت انسان کے قانون فطرت کے قابل نفاذ ہونے کا تصور کیونکر مضبوطی سے قائم ہو گیا

اور کس طرح ان دونوں تصورات کے تحت میں جن میں سے ایک عملی اور دوسرا نظری تھا اور جو آخر الامر ایک دوسرے میں بالکل مدغم ہو گئے" رومانی قانون کے دقیانوسی عناصر مغلوب ہو گئے اور یہ حالت زیادہ تر پریٹروں کے ان سالانہ فرامین یا "سوانح قانونی" کی وجہ سے صورت پذیر ہوئی جن میں پریٹر یہ اعلان کرتے تھے کہ کس قسم کے مقدمات و عذرات قابل قبول ہوں گے اور زیادتیوں کے لئے کیا تدارک اختیار کیا جائے گا۔

شہنشاہی کے دور اول یعنی آگسٹس سے ڈیاکلیشین تک کے زمانے میں، قوانین کے اندر منبع تغیر کی حیثیت سے توضیع قانون کو روز بروز غلبہ حاصل ہوتا جاتا تھا اور اگرچہ کچھ زمانے تک شہنشاہ کا اقتدار جمہوری اوضاع ظاہری کے اثرات باقیات کے پردے میں پنہاں رہا پھر بھی اس توضیع قانون میں شہنشاہی رنگ روز بروز زیادہ صاف طور پر نمایاں ہوتا گیا اور پردہ آہستہ آہستہ اٹھتا گیا۔ جمعیت عمومی کی قانون سازی جو جمہوریہ کی آخری صدی میں بہت سرگرم کار رہ چکی تھی اس کی توضیع قوانین ماند پڑتی گئی اور آخر میں بالکل غائب ہو گئی، درحقیقت رومانی قانون اب جس دقیق حد کو پہنچ گیا تھا اس کے لئے یہ جمعیت کچھ زیادہ موزوں نہیں رہی تھی۔ آگسٹس اپنے تشریعی تجاویز بدستور اس جمعیت کے سامنے پیش کرتا رہا مگر ٹائبریس کے عہد تک پہونچ کر یہ طریقہ بند ہو گیا اور مجلس سینیات وضع قوانین کا ظاہری ذریعہ بن گئی، لیکن جسے ہم "مسودہ قانون" کہتے ہیں اس کی ترتیب شہنشاہ کی مجلس شوریٰ ہی میں ہوتی تھی، اور دوسری صدی عیسوی کے اختتام تک یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان مسودات قانون کا منظور کیا جانا اس درجہ بدیہہ الوقوع سمجھ لیا گیا تھا کہ لوگ ان "ملفوظات" کے حوالہ دینے کے عادی ہو گئے جن میں شہنشاہ مجلس سینیات کی قرارداد کے بجائے قانون کے متعلق اپنا ارادہ بیان کیا کرتا تھا اس دوران میں قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار شہنشاہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا، مشکوک مقدمات کی ہدایت کی درخواست کے جواب میں اس کے "مکاتیب" اور عدالتی حیثیت سے جو مقدمات اس کے سامنے آتے تھے ان کے "فیصلے" ججوں کے لئے نظائر لازمی کا کام دیتے تھے گویہ ضرور تھا کہ فیصلے اہل فن قانون داں تیار کرتے تھے) بہ حیثیت حاکم اعلیٰ کے اس کے "فرامین" بھی اگرچہ اول اول صرف اسی صورت میں لازمی ہوتے تھے کہ اس کے مرنے کے بعد ان کی تجدید کی جائے مگر بتدریج قانون اور ان فرامین میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا یہاں تک کہ ڈیاکلیشین کے بعد یعنی ۳۰۵ء سے)

حاکمانہ و عدالتی اعلیٰ اقتدار کے ساتھ ہی ساتھ تمام تشریعی اقتدار بھی شہنشاہ کے دائرہ اختیار میں تسلیم کیا جانے لگا۔

اسی کے پہلو بہ پہلو "اجوبہ علما" کا سلسلہ بھی جاری رہا، یہ وہ علما تھے جن کے قابل اسناد ہونے کے متعلق اگسٹس نے ایک طریقہ قرار دیدیا تھا۔ بعد میں ان کے اجماع کو قانون کی قوت حاصل ہوگئی تھی، لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس دور میں ان کا کام زیادہ تر تاویلی و تنظیمی تھا، صریحی تغیرات مجلس سینیٹ و شہنشاہ کے احکام سے عمل میں آتے تھے۔ پریٹر کے فرامین جن سے قانون کا ایک کم و بیش ناقابل انتظام و بے ترتیب انبار جمع ہوگیا تھا، ان کی ترقی بھی رک گئی تھی۔ ہیڈرین کے زمانہ میں سالویوس جولیانوس نے ان فرامین پر نظر ثانی کر کے انھیں، ایک صورت میں مرتب کیا، پھر اس کے بعد سے اس میں بہت کم تغیر ہوا۔

اس طرح قانون کا جو مرکب مجموعہ تیار ہوگیا تھا، اس کا مطالعہ اس اثنا میں برابر زور و شور کے ساتھ جاری رہا۔ ہیڈرین اور ایٹونین کا دور حکومت رومانی فلسفہ قانون کا زرین زمانہ تھا، اس دور کا خاتمہ ۲۳۵ء میں الگزنڈر سیورس کی موت پر ہوا۔ اس کے بعد وہ پریشانیاں پیش آئیں جنسے شہنشاہی کے مغربی حصے کو کبھی کامل طور پر بحالی نصیب نہیں ہوئی اور انھیں پریشانیوں میں ہر طرح کی تعلیم پر زوال آگیا اور اصول قانون بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا مشرقی شہنشاہی میں اس میں دوبارہ جان پڑی مگر اب اسے مواد قانونی کے طومار سے عہدہ برآ ہونے کی دشواری پیش آئی۔ اسی کے تدارک کے لئے جسٹینین کی جلیل القدر تصنیف کی تجویز ہوئی اور اسے مرتب کیا گیا۔ اس تصنیف نے ہمیشہ کے لئے یہ طے کر دیا کہ شہنشاہی کے قانونی نظریہ کے بموجب قانون سازی کا اختیار ہمیشہ کے لئے تمام و کمال شہنشاہ کی ذات سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔

مگر جب ہم جسٹینین (۵۲۷ء – ۵۶۵ء) تک پہنچتے ہیں تو ہم اس تغیر عظیم سے گزر چکتے ہیں، جو پانچویں صدی میں مغربی یورپ میں واقع ہوا یعنے عام خیال کے بموجب غیر متمدن اقوام نے شہنشاہی کو فتح کر لیا تھا۔ مغربی شہنشاہی کے تمام حصص میں اس جدید سلسلۂ عمل کا آغاز ہو چکا تھا جس کا نتیجہ ہزار برس بعد یہ نکلا کہ یورپ کی موجودہ اقوام کی ساخت عمل میں آئی۔

۲۔ رومانی شہنشاہی کی نسبت عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے قدیم تاریخ

سے ازمنۂ وسطیٰ و ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ کی طرف ارتقا ہونے کا کام دیا اور میرا خیال ہے کہ یہ صحیح ہے، مگر خطبات کے اس سلسلہ میں جو نقطۂ خیال مدنظر رکھا گیا ہے اس میں اس ارتقا کا صرف ایک جزو بیش نظر رہے گا۔

یورپ میں معاشرتِ سیاسی کی شکلوں کے نشو و نما کے مطالعہ کرنے میں جس ارتقا کو مقدم اہمیت حاصل ہے وہ اس دور کا ارتقا ہے جس دور میں کہ مہذب و متمدن نظم معاشرت کے حاکمانہ تصور کا اظہار یونانی لفظ "پولس" (بلدیہ Polis) کے اندر شہر، و "سلطنت" کے تخیلات کے امتزاج سے ہوا کرتا تھا۔ یہ نظم معاشرت ایسی تھی کہ اس کے وہ ارکان جنھیں شہریوں کے کامل حقوق حاصل تھے وہ اپنے نہایت اہم مشترک معاملات کا تصفیہ کرنے کے لئے اپنے مرکزی قصبے کی کسی کھلی جگہ میں واقعی طور پر جمع ہو سکتے تھے۔ رومانیوں نے اگرچہ شہر و سلطنت کے خیالات کو اس طرح پر سمو نہیں دیا تھا لیکن رومانی نظم حکومت میں عام شہریوں کو سیاسی اختیار میں جو حصہ دیا گیا تھا اس کا عملدرآمد بھی صرف ایسی ہی حالت میں ہو سکتا تھا جیسی کہ یونان کی حالت تھی مگر جیسا کہ ارسطو نے ظاہر کیا ہے اس قسم کے دستور سلطنت کے موزوں و مناسب عملدرآمد کے لئے ضرورت تھی کہ شہریوں کی تعداد کا اوسط ایک معینہ حد سے آگے نہ بڑھے لیکن جب رومانی سلطنت بڑھتے بڑھتے چار لاکھ شہریوں تک پہنچ گئی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اطالوی حلیفوں کو اپنے میں شامل کر لیا تو پھر ازمنۂ جدیدہ کی "ملکی سلطنت" کی طرف منقلب ہونے کی کارروائی فی الاصل وقوع میں آگئی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوریت سے شہنشاہی کی طرف متغیر ہونے کے اسباب قطعیہ میں اس ارتقا کو بھی ایک اصولی اہمیت حاصل تھی۔ اس طرح پر جو شہنشاہی ملک بنا وہ شہری سلطنت کی قدیم شکل سے تجاوز کر جانے کے باعث اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنے تغیر شدہ حالات کے حسب خواہ ایک نئی جمہوری شکل کو ترقی دے سکے۔ بدنظمی پیدا کرنے والی اندرونی و بیرونی قوتوں کے مقابلے میں شہنشاہی کی مدافعت کے دشوار گذار مرحلے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پرانے سادے طریقے کی طرف عود کیا جائے کہ کل اختیار ایک شخص واحد کو حاصل ہو جائے۔

دیوکلیتیان اور قسطنطین کے مضبوط ہاتھوں میں شہنشاہی میں جیسی صریحی غیر محدود مطلق العنانی نمایاں ہوگئی جس طرح گو نہ جمہوری روایات کے اثر کی وجہ سے

ایک منتظم و منضبط مبدء حکمرانی کے حصول میں اسے کبھی کاملاً کامیابی نہیں ہوئی (کیونکہ افواج کا کسی مختار کل (امپریٹر) کے مقرر کرنے کا حق ہمیشہ اعتصاب کے لئے عمدہ موقع مہیا کرتا اور ملکی جنگ و جدل کا مخزن بنا رہتا تھا)، جس طرح شمال کے نیم وحشیوں کے خلاف اور تجدید شدہ ایرانی شہنشاہی کے مقابلے میں بحیرۂ روم کے گرداگرد کی مہذب دنیا کی مدافعت کا کام حد سے بڑھ گیا اور نظم و نسق ملکی کی وہ تقسیم وقوع میں آگئی جو تدریجاً اس طرز پر قائم ہوگئی کہ یونانی تمدن لاطینی تمدن سے جدا ہوگیا اور آخرالامر جس طرح پانچویں صدی میں نیم بربریوں کے خروج نے شہنشاہی کے مغربی نصف حصے کو زیر و زبر کرکے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، یہ سب ایسے مباحث ہیں کہ میری محدود وسعت مجھے ان پر نظر ڈالنے کا بھی موقع نہیں دیتی۔ چونکہ ہماری دلچسپی اس دستور سلطنت کے زیادہ پیچیدہ اشکال پر مرکوز ہے، جسے ہم نظم حکومت کہتے ہیں، اس لئے ہم یورپی تاریخ کے اس حصے کو نظرانداز کئے دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ رومانی شہنشاہی کے تخیلات و ادارات کے اثرات باقیات نے مغربی یورپ کی ان ملکی سلطنتوں کی تکوین میں کیا کام دیا جو انہدام و تعمیر جدید کے اس طویل دور میں، جسے ہم ازمنۂ وسطیٰ کہتے ہیں بتدریج قومی اتحاد کی جانب قدم بڑھاتی چلی جارہی تھیں۔

پس اسی نقطے پر پہونچ کر ہم قدیم شہری سلطنت کی نسبتاً تیز رفتار ترقی سے پلٹ کر اس جدید ملکی سلطنت کی نسبت تر ترقی کی جانچ کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا ابھی ہم نے صرف ایک جزوی رخ دیکھا ہے کیونکہ فی الواقع اس کا عمل ابھی جاری ہے۔ سیاسی ارتقا کے ان دونوں سلسلوں میں ایسے تشابہات ملیں گے جنھیں غیر اہم نہیں کہہ سکتے مگر ہمارے لئے آغاز کی سہولت اسی میں ہے کہ ہم اولاً ایک اختلاف پر نظر ڈالیں جو بدیہی ہونے کے ساتھ ہی اصولی بھی ہے، یعنے اول الذکر صورت کے بہ نسبت موخرالذکر صورت میں جائز بادشاہی کو جو بہت زیادہ وسیع منزلت حاصل ہے اس پر نظر کریں۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں یونانی شہری سلطنتوں میں ارسطو کو اپنے وقت یا اپنے سے قریبی زمانۂ گزشتہ میں جس واقعی بادشاہی کا علم تھا وہ بے قاعدہ، خلاف قانون اور ظالمانہ خودسر حکومت تھی۔ اگر ہم اسپارٹا کے دستور کو نظرانداز کردیں، جہاں نام نہاد بادشاہ زمانۂ قدیم سے یوں ہی چلے آرہے تھے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کو جائز بادشاہی کا علم یا تو نہایت ہی قدیم زمانے کی بادشاہی کا تھا یا نیم بربریوں کی بادشاہی کا تھا، یا یہ کہ اس کے ذہن میں اس کا ایک خیال تھا

جو عمل میں نہیں آسکتا تھا کہ کسی بے نظیر قابلیت کے فرد واحد کی حکومت ہو جسے وہ واقعاً ان لوگوں میں نہیں پاتا تھا جن کا اسے تجربہ تھا مگر جب ہم یورپ کی ملکی سلطنتوں کی تاریخ پر نظر کرتے ہیں تو صورت حال بہت ہی مختلف معلوم ہوتی ہے جائز بادشاہی ہر جگہ کا قاعدہ عام ہے اور خالص جمہوری ادارات نادر مستثنیات میں سے ہیں لیکن جائز بادشاہی سے میری مراد غیر محدود بادشاہی سے نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد حکومت کی وہ شکل ہے جس میں بہر نوع اقتدار اعلیٰ کا کچھ نہ کچھ پر از اہمیت حصہ ایک شخص واحد کے ہاتھ میں ہو اور وہ اس قسم کے تغیر پذیر قاعدہ و اطاعت کے تابع نہ ہو جو جمہوری حکمران کی حقیقی خصوصیت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ متمدن ممالک یورپ کی تاریخ کے بیشتر زمانہ میں ان ممالک کے اکثر حصص میں بادشاہ کے اختیارات اصولاً و عملاً کم و بیش محدود تھے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے اہل ملک کی عادت اطاعت پر تھا مگر ان میں غیر مشروط اطاعت کی عادت نہیں تھی۔ بادشاہ کو ان قوانین سے موافقت کرنا پڑتی تھی، جنھیں وہ بدل نہیں سکتا تھا، اور جن جماعتوں اور گروہوں کو اختیار حکومت میں کچھ نہ کچھ آئینی شرکت حاصل تھی ان سے بادشاہ کو کشمکش یا افہام و تفہیم کی نوبت پیش آتی رہتی تھی مگر جمہوری حکام کی طرح سے اسے یہ نہیں کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنی سرکاری منزلت سے دست بردار ہو کر دوسرے شہریوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہو اور اس سے ان کاموں کی حساب فہمی کی جائے جنھیں وہ اپنے اختیار کی رو سے عمل میں لایا ہو۔

میرا خیال ہے کہ شہری اور ملکی سلطنتوں کے متعلق ہم اس وقت بھی جس تشبیہ سے کام لے سکتے ہیں، خود اس تشبیہ سے ان دونوں قسم کی سلطنتوں کے ارتقا کا فرق بیّن و مفید طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ یونانی شہری سلطنتوں کی تاریخ میں ہمیں ایک دور ایسا ملا جو خودسروں کا عہد کہلاتا ہے۔ یہ دور، ان دو زینوں کے درمیان واقع تھا جس میں سے پہلا زینہ یہ تھا کہ قدیم ترین بادشاہی کے بعد عدیدیت معتدل حالت میں نظر آتی تھی اور دوسرا زینہ وہ تھا جب بہت سی سلطنتوں میں عمومیت کا رواج ہو گیا تھا اور عمومی حکومت کی طرف عام میلان صاف نمایاں تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا زینہ تھا جس میں بے ترتیب قسم کی بادشاہی کی طرف پلٹنے کا میلان پایا جاتا تھا۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ میلان ہمہ گیری کی حد تک پہنچا ہوا تھا مگر اس کا شیوع اس درجہ ہو گیا تھا کہ اسے خاص حالات میں (معمولی) نتیجہ خیال کر سکتے تھے۔ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ارسطو اور عام طور پر مورخوں کی تحریر

کے مطابق خود سرانہ حکومت کا یہ ظہور حکمران امراء کے خلاف عمومی تحریک کی اولین شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ سرگروہان عوام ہی نے ترقی کرتے کرتے اس ابتدائی خود سری کا جامہ پہن لیا تھا۔ ان پیشواؤں کا اقتدار اس طرح قائم ہوا کہ عوام کو اپنے قدیم ستانے والوں کے مقابلے میں رہبر و محافظ کی ضرورت محسوس تو ہو رہی تھی لیکن متوزان میں حقیقی عمومیت کے حاصل کرنے کی پختگی نہیں آئی تھی مگر ملکی سلطنت کے ارتقاء میں ہمیں (یونانی مفہوم میں) خود سری کا کوئی زمانہ نہیں ملتا۔ البتہ ایک دور ایسا ملتا ہے جس میں مطلق العنان بادشاہی یا کم از کم شاہی اختیارات کی بہت بڑی وسعت کا میلان پایا جاتا ہے۔ یہ دور اپنے آغاز و امتداد کے لحاظ سے مختلف سلطنتوں میں مختلف رہا ہے اور یونان ہی کے مثل یہاں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاہی اختیار کی یہ ترقی کسی حد تک عوام کی تائید پر منحصر تھی اور اسی تائید سے اس کا امکان پیدا ہوا۔ جن مقامات پر مطلق العنانی کی جانب یہ ارتقا بہت ہی تدریجی طور پر ہوا اور جن جگہوں میں یکایک اور دفعتاً واقع ہوا دونوں جگہوں میں، یہ امر عجیب یکساں طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ فرانس اس معاملے میں سب سے مقدم ہے اور وہاں اس کارروائی کا قدم بقدم پتہ چلتا ہے کہ ایک وقت تھا کہ خاندان ”کاپے“ محض برائے نام صاحب تاج و تخت ہوا اور ایک وقت وہ آیا کہ لوئی چاردہم کی نسبت یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ یہ کہا کرتا ہے کہ ”میں ہی سلطنت ہوں“ جملہ مورخین اس امر کے معترف ہیں کہ بادشاہ کو امرا کے مقابل، طبقۂ سوم کی تائید سے کس قدر نفع حاصل ہوا، حالانکہ بادشاہ اور متوسط درجہ کے اہالی شہر کے درمیان مختلف طرح کے اتحادی تعلقات قائم ہوتے رہے اور یہ تعلقات بھی ہر حال میں غیر منقطع نہیں رہے۔ دوسری طرف جب ہم نظر غائر سے یہ دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۶۶۰ء میں ڈنمارک ایک ہی زبردست وار میں حکومت کی اس صورت کو (جو عدیدیت سے بہت ہی قریب تھی) پامال کرکے مطلق العنان بادشاہی کے درجے پر پہنچ گیا تو یہاں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ حکمران امراء کے خلاف بادشاہ اور عوام کا اتحاد ایسا ہی واضح و نمایاں ہے جیسا کہ یونان کی کسی خود سرانہ حکومت کے آغاز میں ہوا کرتا تھا۔

بہر حال سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں یورپی سلطنتوں کے بیشتر حصے میں جس قسم کی مطلق العنانی قائم ہوئی اور جیسے وقت میں قائم ہوئی، اس کے مدارج میں اور (یونان کے) دور خود سری کے درمیان ہم ایک طرح کا مبہم سا شائبہ پاتے ہیں، (یورپ) میں اس مطلق العنانی کا قیام ان دو زمانوں کے درمیان واقع ہوا جس کے قبل کا زمانہ وہ ہے

جب بادشاہ کے رقیب کی حیثیت سے امرا کی طاقت نہایت ہی خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی اور جس کے بعد کا زمانہ وہ ہے جس میں ہم اس وقت موجود ہیں اور جس میں روس کے علاوہ یورپ میں اور ہر جگہ نیابتی عمومیت نے حکومت میں بہت بڑا حصہ حاصل کر لیا ہے۔ ترقیوں کے ان دونوں مدارج عمل میں یہ بھی مشابہت موجود ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں جب وہ دور ختم ہو گیا جو مطلق العنان بادشاہی کے لئے بالتخصیص مفید و موزوں تھا تو نئے دستوروں کا میلان، عمومی خصوصیات کی طرف اس سے زیادہ ہو گیا جتنا اس سے قبل کی خودسرانہ حکومتوں یا مطلق العنان بادشاہی کے دستوروں میں تھا۔ جو واقعات ہمیں معلوم ہیں، ان سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ باوجود کوشش کے بھی امرا کے قدیم غلبہ و فوقیت کی تجدید کسی طویل زمانہ کے لئے تو قطعاً ناممکن ہو گئی مزید براں، جہاں کہیں عمومیت کا قیام اشتداد اور عدم استقلال کے ساتھ ہوا، وہاں قدیم و جدید دونوں حالتوں میں ہمیں ان موخر قسم کے خودسروں کے نمونے ملتے ہیں جو عمومیت کے بعد ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس موقع پر اس مثال میں بہت زیادہ گہری مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس قسم کے بادشاہوں نے قدیم و جدید دونوں زمانوں میں بالعموم خلاف قانون و جابرانہ ہی طریقے پر اقتدار حاصل کیا ہے، جیسا کہ فرانس اور جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں میں ہوا۔

۳۔ لیکن یہ مشابہت اگرچہ کسی حد تک جائز و معنی خیز ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شہری سلطنت کے بہ نسبت ملکی سلطنت میں بادشاہی کی جانب میلان بدرجہا زیادہ قوی تھا کیونکہ موخرالذکر سلطنت کے عدیدی دور کے اثنا میں جہاں کہیں عدیدیت بہت کچھ مستحکم ہو چکی تھی، وہاں بھی حکمران افراد نے اپنے بادشاہ سے گلو خلاصی نہیں حاصل کر لی تھی، انھوں نے بادشاہ کو قائم رکھا اور کچھ نہ کچھ بلکہ بالعموم معتدبہ اختیارات بھی اس کے ہاتھ میں رہنے دیئے۔ مختصر یہ کہ ہم حقیقی دور تاریخ کی یونانی شہری سلطنتوں کی زندگی کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ جائز بادشاہی دتقریباً، کہیں بھی اور کسی وقت میں بھی نہیں پائی جاتی تھی؛ اس کے برعکس یورپ میں جو ملکی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں اور رومانی شہنشاہی کے وقت سے ان میں قومی زندگی پیدا ہو گئی تھی ان کی نسبت ہم کم و بیش یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں جائز بادشاہی ہر جگہ اور ہر وقت میں پائی جاتی ہے۔ قلیل التعداد اہل دولت اور قدیم خاندان والوں کی حکمرانی اور عامۃ الناس کی حکمرانی ہر ایک اپنے اپنے مناسب موقع پر غلبہ حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتی رہی مگر یہ غلبہ صرف جزوی ہوتا تھا اور ہر وقت اس میں جزر و مد کی کیفیت پائی جاتی تھی مگر بادشاہی اپنی جگہ پر قائم تھی۔

آخر اس امر عجیب کے اسباب کیا ہیں؟ میرے خیال میں اس کا خاص سبب وہی ہے جس کا ذکر میں یونانی شہری سلطنتوں کی ابتدائی بادشاہی سے منقلب ہونے کی بحث میں ضمناً کر چکا ہوں[۱]۔ یعنی بادشاہ کی ذات سے جو اتحاد پیدا ہوتا ہے وہ ملکی سلطنت میں ایک ایسا رابطۂ ضروری اور ایک ایسا نشان اتحاد و وابستگی ہے کہ جو شہری سلطنت کے بہ نسبت ملکی سلطنت میں زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے، کیونکہ شہری سلطنتوں میں شہریوں کا باہم ملنا جلنا اور اتحاد و اجتماع زیادہ آسان ہوتا ہے اور اس پر ہم یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ اجتماعی ہستی کا یہ موثر و عیاں نشان و رابطہ ان شہروں ہی میں پایا جاتا تھا جن کے اندر ہی ان کے بازار اور معابد موجود ہوتے تھے۔ یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ملکی سلطنت کی تکوین کی کارروائی بہت ہی سست رفتار کارروائی ہوا کرتی ہے، میرا مطلب اس کارروائی سے یہ ہے کہ سلطنت کو حقیقی ذی حیات قومی اتحاد کی اس حد پر لایا جائے جس حد پر ہم مغربی یورپ کی سربر آوردہ سلطنتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جو قوتیں ارتباط کی طرف مائل ہوتی ہیں، ان کا مقابلہ ان قوتوں سے رہتا ہے جن کا میلان انتشار کی جانب ہوتا ہے اور اس میں انھیں کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناکامی اور اسی طرح صدیاں گزر جاتی ہیں۔ پس جسقدر قومی اوراک اور احساس میں ترقی ہوتی جاتی تھی اور اتحاد و انتظام کی حاجت جس قدر شدت سے محسوس ہوتی جاتی تھی، اس حاجت کو بر روئے کار لانے کے لئے بادشاہی کی ضرورت بھی اسی زور و قوت کے ساتھ محسوس ہوتی جاتی تھی۔ اس کا جواب بالعموم یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ جمہوری انتظام قائم ہو جائے بلکہ متصادم قوتیں سلطنت کے پرزے پرزے کر ڈالتی تھیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ فرانس کی قدیم تاریخ میں جب کارونجی خاندان شاہی سے کاپیتی خاندان کی طرف منقلب ہوتے وقت بادشاہ کا اختیار عملاً انتہائی پستی کو پہنچ گیا تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ امرائے عظام یہ کوشش کرتے کہ کوئی عدیدیت قائم ہو جائے اور وہ بہ حیثیت ایک جماعت کے فرانس پر حکمران ہو جائیں بلکہ ان کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کا ایک بے ترتیب گروہ بن جانا چاہتے تھے جس میں ہر ایک اپنے اپنے ضلع میں بادشاہی اختیارات عمل میں لائے۔

لیکن اگرچہ میری دانست میں بادشاہی کی برتری اور فوقیت کا خاص سبب یہی معلوم ہوتا ہے، تاہم دوسرے اسباب بھی اس کے ساتھ عمل کر رہے تھے اور ان میں سے خاص سبب خود رومانی شہنشاہی کا وجود سابقہ تھا۔ مغرب کی رومانی شہنشاہی پانچویں صدی

[۱] خطبۂ چہارم صـ ۷۱

میں ختم ہو گئی تھی مگر شہنشاہی کے خیالات اس سے بہت زیادہ زمانے تک زندہ رہے اور مطلق العنان بادشاہی کے دور کے قائم ہونے تک یورپ کے ارتقائے مابعد پر اثر انداز ہوتے رہے۔ اولاً یہ کہ جب پانچویں صدی میں بربریوں نے متمدن دنیا کو پامال کرنا شروع کیا، اس وقت یہ متمدن دنیا مطلق العنان بادشاہی کے تحت میں تھی اور جن چار صدیوں میں بربریوں کو اس مہذب دنیا سے واقفیت ہوتی رہی، اس تمام دوران میں وہاں مطلق العنان بادشاہی کا دور دورہ رہا تھا۔ اس لئے جب رومانی صوبوں کے بجائے وحشیوں کی نئی شاہیاں قائم ہوئیں، تو ان صوبوں کی زیادہ مہذب آبادی نے مطلق العنان بادشاہی کے خیالات و عادات بربریوں تک پہنچائے۔ بربریوں کا اپنے سے فائق تر تمدن کے ذہنی اثر کے سامنے کسی حد تک سر جھکا دینا لازمی تھا، اور انھوں نے جس حد تک سر جھکایا ان پر اس بادشاہی کے طرز کا ہی اثر پڑا۔ فرنگی بادشاہی کے معاملے میں ہمیں یہ اثر بہت صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے اور جدید یورپ کے سیاسی ادارات کے بنانے میں اس بادشاہی کو مقدم جگہ حاصل ہے ہم فرانس میں قدیم ترین مروونجی بادشاہی کے اوائل زمانے تک میں اس اثر کو دیکھتے ہیں، اگرچہ اس موقع پر ایسا ہوا کہ فتح کی وجہ سے شاہی اختیار کے بڑھانے کا جو جوش پیدا ہو گیا تھا وہ حکومت کے کام میں (جو فتوحات کی وجہ سے بہت زیادہ مشکل ہو گیا تھا) مروونجی بادشاہوں کی عدم قابلیت کی وجہ سے بہت جلد دب گیا، چارلس اعظم جس نے واقعتاً تاج شہنشاہی زیب سر کیا اس کی بادشاہی کے زمانے میں یہ اثر اور بھی زیادہ نمایاں طور پر دوبارہ ظاہر ہوا، اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ رومانی شہنشاہی کے جس اثر کی اس طرح تجدید ہوئی وہ اسی طاقت تک محدود نہیں رہا جو حکمرانوں کے اس سلسلے کو حاصل تھی جنھوں نے شہنشاہی تاج سر پر رکھا تھا۔ اگر کلیم اتنا ہی ہوتا تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ جس جرمانی بادشاہی کے ساتھ یہ شہنشاہی منصب مدغم کر دیا گیا تھا اس کی موثر قوت بڑھنے کے بجائے گھٹ گئی تھی مگر ہمیں یہ لحاظ کرنا ہے کہ خیالات پر اس کا اثر پر زور طور پر اس کے برعکس ہوا تھا، اس نے لوگوں کی چشم دل کے سامنے ایک قدیم عزت و اختیار والی بادشاہی کو اس حیثیت سے قائم رکھا کہ وہی عام طور پر حکومت کی اعلیٰ ترین شکل سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد بارہویں صدی میں رومانی قانون کے مطالعے کی تجدید سے شہنشاہی کے خیالات نے قانون پیشہ گروہ کے وسیلے سے ایک نئی اور اہم صورت میں زور پکڑا۔ اس دور جدید کے اہل قانون جنھیں رومانی مقننوں سے تعلیم حاصل ہوئی تھی ان کا میلان

برابر یہی رہا ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ قانون کے تعلق کی نسبت وہی خیال قائم کریں جو رومانی مفہوم کا تھا اور اس طرح تا حد امکان جدید بادشاہ کی حیثیت کو قدیم شہنشاہ کی حیثیت کے ہم پلہ قرار دینے کے لئے برابر ناواجب میلان قائم رکھیں۔

میرے خیال میں بادشاہی کے جانب کے ان اثرات کے ساتھ جن کا تعلق رومانی شہنشاہی سے ہے مسیحی کلیسا کے اثر کے اہم جزو کا بھی اضافہ کرنا چاہئے، لیکن اس بیان کو محدود و مشروط کر دینا چاہئے کیونکہ یہ اثر پیچیدہ اور تغیر پذیر قسم کا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے ہمیں دو اموریں امتیاز کرنا ہے یہاں ایک طرف تو وہ قوت تھی جس کا نفاذ کلیسا ایک منتظم جماعت کی حیثیت سے کرتا تھا اور ان میں اسے اپنے مادی اغراض کی حفاظت کرنا پڑتی تھی، دوسری طرف وہ سیاسی خیالات و جذبات تھے جن کا میلان قدیمی عیسویت کے ساتھ وابستہ ہو جانے کی طرف تھا اور جن کی اشاعت کے لئے پادری واعظ دورہ کرتے پھرتے تھے۔ اس امتیاز کی ضرورت یہ تھی کہ یہ دونوں قوتیں اکثر ایک دوسرے سے مختلف راستے اختیار کر لیتی تھیں۔ تاریخ یورپ کے تمام دور میں یہ ہوتا آیا ہے کہ کلیسائی عضویت کی حیثیت سے مذہب کیتھولک کے ساتھ اکثر مختلف یورپی ممالک کی شاہی حکومتوں کا سخت تصادم برپا ہو جاتا تھا اور جب ایسا ہوتا تھا تو کلیسا نظم معاشرت کی دنیاوی تنظیم کے ان عناصر و میلانات کے ساتھ ہو جاتا تھا، جو شاہی یا کم از کم مطلق العنانی کے خلاف ہوتے تھے تاکہ وہ اس معرکے کو زیادہ خوبی سے سر کر سکے، لیکن اپنی مادی تنظیم اور اس سے متعلقہ جذبات سے علیحدہ ہو کر مذہب کیتھولک اپنا اثر نظم و انتظام اور اس لئے بادشاہی کی جانب سے کام میں لاتا تھا۔ وہ عام الفاظ میں "موجودالوقت طاقتوں" کے مطیع رہنے کا حکم دیتا تھا، مگر ان طاقتوں کی نسبت اس کا روایتی تصور شاہی کا تھا۔ اس کا نشو و نما مطلق العنان شاہی کے زیر سایہ ہوا تھا، اور اس طرح تخیل و تصور کے جو عادات اس میں راسخ ہو گئے تھے، انھیں عادات کو اس نے اس دور تک پہنچایا جب بربریوں کے حملے کے بعد سیاسی نظم کی شکست و ریخت اور تعمیر جدید ہونے لگی تھی، اور اسی وجہ سے کلیسا کا میلان یہ ہو گیا کہ وہ شاہی کی مخالف قوتوں کو بدعملی و غداری سمجھنے لگا۔

ان تمام اسباب کے جمع ہو جانے کا آخری نتیجہ بالعموم مغربی یورپ کے اقوام میں یہ ہوا کہ صحیح معنی میں ازمنۂ جدید کی تاریخ کا اولین دور، وہی دور رہے جسے مطلق العنان

بادشاہی کا دور کہہ سکتے ہیں (ازمنۂ جدید کی تاریخ سے مراد اس زمانے کی تاریخ سے ہے جب مغربی یورپ کی سلطنتیں کامل طور پر مہذب نظم میں آگئیں ؛ اس زمانے میں، حکومت کے ذرائع عمل کا تمام نظم ایسے موروثی بادشاہوں کے تحت اقتدار میں آگیا کہ وہ اپنی مرضی کو جس جگہ بھی کام میں لانا چاہتے کوئی وہاں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا اور یہی نظم نہ صرف واقعتاً حاوی و غالب طرز ہوگیا بلکہ بہت وسعت کے ساتھ اسی کو سیاسی تنظیم کی وہ شکل سمجھا جانے لگا جو منتظم تمدن کے برقرار رکھنے کے لئے موزوں تھی۔ مغربی یورپ کی سلطنتوں کو بالعموم یہ درجہ سترہویں صدی میں نصیب ہوا یعنی ان مذہبی جنگوں کے بند ہو جانے کے بعد جنھوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسیات سے ازمنۂ جدید کی سیاسیات کی طرف منقلب ہونے کے معاملے میں ایسا سخت طوفان برپا کر دیا تھا۔ فرانس اس جدید شاہی کا مقدمۃ الجیش تھا۔ اسی نے اسکے طرز و طور کو ڈھالا اور اسی نے اس کے خیالات کو شائع کیا، مگر اور ملکوں کے حالات بھی کافی حد تک فرانس ہی کے مثل تھے، جس سے اس مطلق العنان بادشاہی کو تمدن یورپ پر طبعاً غلبہ حاصل ہو گیا۔

۴۔ اس کے بعد خطبات کا جو سلسلہ آتا ہے ان میں میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ اس عمل کو درجہ بدرجہ بیان کروں جسکے وسیلے سے یہ عام نتیجہ حاصل ہوا تھا، میں اس کی ابتدا اس کے خاص خاص مدارج کے نشان دینے سے کروں گا اور کوشش کرونگا کہ ترقی پذیر نظمہائے معاشرت کے ان خاص عناصر کے نمایاں خصوصیات امتیاز بیان کروں جنھیں مختلف دوروں میں قوت و اہمیت حاصل تھی۔

ان عناصر پر بحث کرنے میں ہمیشہ اس امر کو مدنظر رکھنا ضروری و اہم ہے کہ یورپ کی ملکی سلطنت کے سیاسی حالات یونانیوں کی شہری سلطنت کے حالات کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یونانی سلطنت میں ہمیں ایک ایسی قوم نظر آتی ہے جسکے ابتدائی حالات بہت زیادہ زرعی نوعیت کے تھے، وہ ایک ایسی زرعی قوم تھی جس میں مزروعہ زمین پر شخصی ملک کے قائم ہو جانے کے بعد کامل الحقوق شہری ایسے زمیندار بن گئے جو خود اپنی زمین کی پیداوار پر بسر کرتے تھے (خواہ وہ خود اس زمین کو جوتتے بوتے ہوں یا دوسروں کے ذریعے سے ایسا کرتے ہوں) اور جنگ میں خود اپنے خرچ سے شریک ہوتے ہوں، لہٰذا وہاں جب جائداد کی عدم مساوات کا رواج ہوا تو بڑے زمیندار و ملک

میلان یہ ہو گیا کہ وہ سیاسی اختیار کو ہضم کر لیں اور وہ اقتصادی حیثیت میں چھوٹے کاشتکاروں کو ستانے لگیں۔ لیکن جو قومیں تجارت و تمدن میں پوری تیز رفتاری کے ساتھ گامزن تھیں ان میں آہستہ آہستہ شہری حالات و کیفیات ارضی حالات و کیفیات پر غالب آ گئیں۔ یہ متمول زمیندار فصیل دار شہروں کے سربر آوردہ باشندے بن گئے اور بعد میں شہریت کے لئے ارضی ملکیت کی شرط لازمی او صاف سے ساقط ہو گئی۔ قوم کی مذہبی و دنیاوی دونوں زندگیاں شہر کی مادی ہئیت مجسمہ کی وجہ سے یکساں ہو گئیں۔

ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ کی تحقیقات میں، قدیم شہری سلطنت کے ابتدائی دور کی طرح ہمیں ارتقا کا خاص رشتہ وہی تعلق نظر آئے گا جو اتنی مدت تک سیاسی اختیار اور ارضی ملکیت کے درمیان قائم رہا تھا اور اسی کے ساتھ وہ تغیرات بھی ہوں گے جو اس تعلق کو اس تمام زمانے میں پیش آتے رہے، جب قوم جاگیری دور میں داخل ہوئی اور پھر اس میں سے گزر گئی لیکن اس ترقی کا ایک دوسرا رشتہ بھی ہے جو کبھی تو اس سابقہ رشتے کے برابر رہتا اور کبھی کبھی اس میں الجھ بھی جاتا تھا، یہ ملکی سلطنت کے اندر ایک بڑی حد تک حکومت خود اختیاری رکھنے والے شہروں اور قصبوں کا ترقی پانا ہے۔ علیٰ ہذا، ازمنۂ وسطیٰ کی یورپی تاریخ کی مخصوص ہئیت کے طور پر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ بہ حیثیت ایک جماعت کے پادریوں کی جداگانہ تنظیم موجود تھی جس کی ہئیت و مشغلہ زندگی اگرچہ دنیاوی حکومت کی ہیئت اور قوم کے سیاسی نظم کی زندگی میں ملی ہوئی تھی، پھر بھی اس سے ممیز تھی۔ ان میں سے ہر ایک صورت میں تاریخ کے عالمانہ مطالعہ کرنے والے کو ان عناصر کے سیاسی ارتقا کا جدا جدا پتا چلانا اور بہ حیثیت مجموعی قوم کے ارتقا کے ساتھ ان کے تغیر پذیر تعلقات کا بھی سراغ لگانا ہے۔ کلیسا اور بلدیہ دونوں نے جدید یورپی سلطنتوں کی تکوین میں مدد دی ہے اور یہ مدد سیاسی اہمیت رکھتی ہے مگر ان میں سے ہر ایک عنصر خاص خاص مواقع اور خاص زمانے میں ایک ایسی قوت بن جاتا تھا جو قومی اتحاد کی ترقی میں سدِ راہ ہو جاتا۔ کلیسا، تو اس طرح سدِ راہ ہوتا کہ اس کا میلان مذہبی حکومت قائم کر لینے کی طرف تھا اور شہروں نے یہ دقت ڈالی کہ انھوں نے تنہا یا دوسرے کے ساتھ متفق ہو کر ایسی خود مختاری حاصل کر لینے کی کوشش کی جو قومی اتحاد و ارتباط کے منافی تھی۔

پس جبکہ میں نے ابھی ابھی یورپی بادشاہی کی یہ خصوصیت قرار دی کہ وہ عدیدیت کے انتشار انگیز و بدنظم میلانات کے مقابلے میں گویا اتحاد و نظم کی نمائندہ تھی، تو میں نے اس کی حالت

کی یہ ایک ناکمل صورت پیش کی ہے، کلیسا نے جب ایک غیر ملکی حکمران کے زیر اثر اپنے حکومت مذہبی کے ادعا کو انتہائی حد پر پہنچادیا، تو اس وقت کلیسا کے خلاف بھی بعض مواقع پر سلطنت کو اس قسم کی متعاونت کی ضرورت پیش آئی، اور شہروں اور ذی اختیار بلدیات نے جب ادعائے خود مختاری کو حد سے آگے بڑھایا تو ان کے مقابلے میں بھی ایسی ہی ضرورت لاحق ہوئی۔ بادشاہ کے منصب کو تقویت اس امر سے تھی کہ جب مختلف و متصادم عناصر قوم کی خود مختاری و ارتباط میں دراندازی کی طرف مائل ہوتے تو ان کے مقابلے میں پادشاہ قومی اتحاد و تنظیم کا نمائندہ بن جاتا تھا۔

۵۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں شہروں کا نشو و نما خطبات مابعد کا موضوع ہوگا۔ یہاں میں صرف اس قدر بیان کروں گا کہ جہاں اس نشو و نما کو نہایت درجہ کمال و نمو حاصل ہوا وہاں اسے یہ موقع جدید یورپی سلطنتوں کے پیچ در پیچ حالات کے ایک دوسرے عنصر یعنی مقدس رومانی شہنشاہی کی وجہ سے میسر آیا۔ میں ان خیالات کا ذکر کرچکا ہوں جو قدیم رومانی شہنشاہی کے بعد ذہنی قوت کے طور پر باقی رہ گئے تھے اور جن کا زور بادشاہی کی جانب بڑھ رہا تھا، اور میرے خیال میں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شہنشاہی لقب کی تجدید سے اس عام رائے کے قائم رکھنے میں مدد ملی کہ ایک اعلیٰ و برتر شخص کی مرضی کے مطابق حکومت کا ہونا ایک طبعی و معتدل حالت ہے لیکن (جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں) اس میں بھی شک نہیں ہے کہ مقدس رومانی شہنشاہی بجائے خود شاہی کے لئے تقویت کا باعث ہونے سے زیادہ ضعف کا سبب بن گئی تھی۔ اوٹو اعظم کے عہد سے ان دونوں ملکوں کا یہی حال رہا جن میں القاب شہنشاہی کے دامن دولت سے وابستہ بلند بانگ اور گونہ تہی باطن دعاوی نے قومی بادشاہی کو پست کردیا تھا۔ اگر مقدس رومانی شہنشاہی نہ ہوتی، یعنی اگر جرمانی بادشاہوں کو جرمنی کا بادشاہ رہنے سے زائد کچھ طمع نہ ہوتی، اگر ان کی توجہ برابر اطالیہ کے مہمات کی طرف منعطف نہ ہوتی رہتی اور ان کے خزانے انھیں لڑائیوں میں خالی نہ ہوتے رہتے، تو پھر مجھے کوئی صاف وجہ اس کی نظر نہیں آتی کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ختم ہونے تک فرانس و اطالیہ کی طرح جرمنی نے بھی بادشاہ کے تحت میں قومی اتحاد کیوں نہ حاصل کرلیا ہوتا۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا کہ آغاز تاریخ جدید کے وقت ہم اسے جس حالت میں پاتے ہیں وہ حالت نہ ہوتی یعنی وہاں چھوٹی بڑی امارتوں کی وہ کثرت نہ ہوتی جس سے عقل حیران ہوجائے اور جن کے اتحاد باہمی کا وسیلہ اسی نام نہاد شہنشاہی کا ناکمل رشتہ ہو۔ ٹیوٹنی تو میں باہم ملکر یقیناً اتنی بڑی سلطنت قائم کرلیتیں جتنی بڑی سلطنتیں ان کے شمالی رشتہ دار اہل اسکنڈ نیویا نے قائم کرلی تھی۔

اگرچہ اس میں نسبتاً شک کا پہلو زیادہ غالب ہے مگر ایک متحدہ اطالیہ بھی اس طرح قائم ہوسکتی تھی یا کم از کم ایک شمالی اطالیہ ہوتی اور ایک جنوبی اور غالباً یورپ کے علاقے سے یہ تقسیم واقع ہوتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہونے کے بجائے جو کچھ واقعاً پیش آیا اس کا تعلق عجائبات تاریخ کے اس بڑے حصہ سے ہے جسے ہم محض امر اتفاقی کا نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہیں، یعنی ہم صاف طور پر ایسے عام اسباب کا پتا نہیں چلا سکتے جن سے یہ نتیجہ ظہور پذیر ہوا ہو اور جنکی قوت عملاً ناقابل مدافعت ہو۔ اگر سنہ ۸۰۰ء میں ایسی نادر و پرزور قابلیت کا ایک بادشاہ موجود نہ ہوتا کہ ہم اسے محض ایک امر اتفاقی سمجھنے پر مجبور ہوں، تو بظاہر اسباب اس توقع کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس سال مغرب میں رومانی شہنشاہی کی تجدید وقوع میں آتی، اور اگر چارلس اعظم کی ذات سے مقدس رومانی شہنشاہی نہ قائم ہوگئی ہوتی تو اس خیال کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ اس کا قیام کسی وقت میں بھی ہوا ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں جب کہ مغرب کی رومانی شہنشاہی کو تازہ تازہ زوال ہوا تھا، اس وقت کلیسا نے شہنشاہی کو دوبارہ قائم کرنے کی متواتر کوششیں کی تھیں، اس نے وحشی بادشاہوں سے یہ التجائیں کی تھیں کہ وہ رومانی شہنشاہ بن جائیں رومانی شہنشاہ کے حقوق اختیار کریں اور کلیسا کے ساتھ وہی تعلقات قائم کریں جو رومانی شہنشاہوں کے تھے۔ ۱ لیکن بربریت کی حملہ آوریوں میں، قدیم تمدن جس قدر زیادہ شکست ہوتا گیا، اسی قدر یہ کوششیں بھی فنا ہوتی گئیں، اور جب دسویں صدی کے اختتام کے قریب نظم معاشرت و کلیسا دونوں ساتھ ساتھ اس حالت سے نکلنے لگے تو اس وقت تک مغرب کی رومانی شہنشاہی ایسی گزری ہوئی شئے ہو چکی تھی کہ اگر چارلس اعظم کے زبردست ہاتھوں سے فرنگی بادشاہی اس جلیل القدر وسعت کو نہ پہونچ گئی ہوتی اور نیز چارلس نے رومن کیتھولک مذہب کا حامی بنکر شاہی میں یہ وسعت نہ حاصل کی ہوتی تو رومانی شہنشاہی کی تجدید کا قابل العمل سمجھا جانا بہت دشوار تھا۔ پس اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں

۱ ملاحظہ ہو گیزو کی "تاریخ تمدن یورپ"۔

کہ اگر چارلس اعظم نہ ہوتا تو اوٹو اول اور اسکے جانشین محض جرمانی بادشاہ ہوتے۔

یہ ملحوظ رہے کہ (میرے قول کے مطابق) یہ امر اتفاقی شاہی مطلق العنانی کے اس وسیع وعام نتیجہ میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا جو اسے سترھویں صدی کے آخر میں حاصل ہوئی۔ صرف جرمنی اور شمال اطالیہ میں شاہی اختیارات ان متعدد چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ذریعہ سے عمل میں آتے تھے جنھوں نے جرمنی میں عملاً خود مختاری حاصل کرلی تھی اور اطالیہ میں باضابطہ خود مختار ہو گئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض آزاد شہری بادشاہیاں بھی ان میں باقی رہ گئی تھیں، جو از منۂ وسطیٰ کی شہری جماعتوں کے ارتقائے عظیم کے نتائج تھیں اور جنکی نسبت میں خطبات مابعد میں آپ کی توجہ منعطف کروں گا لیکن حکومت کے مروجہ طرز کے لحاظ سے انجام کار جرمنی واطالیہ کے اندر بھی نتیجہ حقیقتاً وہی ہوا جو اور مقامات پر ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس کارروائی سے یہ نتیجہ حاصل ہوا وہ اصولاً مختلف تھی۔ شہنشاہی کے باہر جس قوت کو فتح حاصل ہوئی وہ مرکزی قوت تھی۔ امرائے عظام کو سر جھکا کر (وابستگان شاہی) میں داخل ہونے پر قناعت کرنا پڑی (اس کے برخلاف) جرمنی میں انھوں نے شاہی یا امارت عظمیٰ کے تاج خود اپنے سروں پر رکھ لیئے۔[1]

۶۔ پس عام طور پر مغربی یورپ کی سلطنتوں کے متعلق عناصر کی مذکورہ بالا پیچیدگی کو ذہن میں محفوظ رکھ کر ہمیں تغیر کی کارروائی کے ان مدارج کی مختصر طور پر جانچ کرنا چاہیئے جو ان سیاسی ادارات میں واقع ہوئے جو بربریوں کے حملوں سے شکست ہو کر رومانی شہنشاہی کے اجزا کے طور پر باقی رہ گئے تھے (نیز ان جدید ممالک میں بھی اس کی جانچ کرنا چاہیئے) جو زیادہ تر مسیحیت کے پھیلنے کی وجہ سے اس ترقی پذیر تمدن میں شریک ہو گئے تھے جس میں قدیم وجدید عناصر ملے ہوئے تھے۔ ارتقا کی مختلف روشوں میں اس کارروائی کا سراغ لگاتے وقت خاصکر فرانس

---

[1] شمالی اطالیہ کی سلطنتوں میں یہ نتیجہ بلدی جمہوریت کی ایک دوسری کارروائی سے حاصل ہوا۔ یہ بلدی جمہوریت اول اول تو جاگیرداریت پر غالب آئی اور پھر وہ (مطلق العنانی) کے آغوش میں جا پڑی، اور یہ مطلق العنانی ترقی کر کے موروثی بادشاہی بن گئی مگر اسکے مطلق العنانانہ وصف میں کچھ کمی نہ ہوئی۔

وابیین کے مقابلہ میں جرمنی واطالیہ کے معاملہ میں اس امر کے زیر نظر رکھنے سے مدد ملتی ہے کہ بالفاظ عام یہ مختلف طریقے گھوم پھر کر صرف اُس نتیجۂ واحد پر نہیں پہنچ جاتے کہ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں مطلق العنان بادشاہی قائم ہو گئی تھی بلکہ ہر ایک قوم میں دنیاوی طاقت کے خاص مخزن کے لحاظ سے ان کی ابتدا بھی ایک ہی طرح سے ہوتی تھی یعنی یہ طاقت قدیم ٹیوٹنی قوم سے حاصل ہوئی جیسا کہ میں اپنے دوسرے خطبے میں بیان کرچکا ہوں۔

میں پہلے یاد دلا چکا ہوں کہ اس قوم کا جو ابتدائی حال ہمیں معلوم ہوا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اعلیٰ اختیار مسلح آزاد اشخاص کی قبایلی جمیعت کو حاصل تھا اسی جمیعت میں صلح وجنگ کا تصفیہ ہوتا تھا شدید جرائم کے لئے سزا دی جاتی تھی، مقامی حلقوں کی صدارت کے لئے سرداروں کا انتخاب ہوتا تھا اور جنگ کے لئے سپہ سالار انھیں سرداروں میں سے منتخب ہوتے تھے بعض صدر لوگوں میں جنگ کی سپہ سالاری کا تعلق کسی بادشاہ کی ذات سے ہوتا تھا لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ٹیسیٹس کے زمانے میں بہت کم ایسا ہوتا تھا۔ بادشاہ بھی انتخاب سے ہوتا تھا لیکن عام طور پر وہ ایک ہی خاندان سے لیا جاتا تھا اور جنگ وصلح دونوں میں وہی مستقل سردار ہوتا رہتا تھا۔ چونکہ ہمسایہ رومانی تمدن کے زیر اثر جرمانی قبایل کا مجموعہ زیادہ تھا اس لئے برضا ورغبت یا کم وبیش جبر واکراہ سے بادشاہی کو وسعت ہوتی جاتی تھی کیونکہ ان مجموعات کو باہم متفق رکھنے کے لئے اسی رشتے کی ضرورت تھی۔ بعد ازاں چونکہ رومانی فوج میں یہ بربری روز بروز زیادہ داخل ہوتے جاتے تھے اور اسی طرح جرمانیوں کو متمدن طریقے کی جنگ سے خود رومانی فوجوں کے اندر اور اس کے بالمقابل تربیت حاصل ہوتی جاتی تھی، اس سے رومانی فوجیں اور رومانی شہنشاہی کی متمدن دنیا روز بروز جرمانیوں کے لئے شکار بنتی جاتی تھی آخر کار یہ سد اس درجہ کمزور ہو گئی کہ وہ جرمانیوں کو روکنے کے قابل نہ رہی اور وہ صوبوں میں پھیل گئے۔ اول اول ان کا داخلہ نہ تو فاتحانہ حیثیت سے ہوا اور نہ شہنشاہی کے مسلمہ دشمن کے طور پر بلکہ زیادہ تر یہ لوگ شہنشاہی کی فوقیت تسلیم کرتے اور شہنشاہی اگر ساماں بہم پہنچا دے تو اس کے فوجی مددگار دں

کے طور پر کام کرنے کے لئے بھی بالکل آمادہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پانچویں صدی کے اوائل میں یہ بھی صاف طور پر واضح ہوگیا تھا کہ شہنشاہی کے مغربی صوبوں میں ان جرمانیوں کے بہت بڑے بڑے گروہ ٹھیرنے کی نیت سے آگئے تھے۔ یہ کچھ جور و زیادتی اور کچھ آپس کی قرارداد اور افہام و تفہیم سے یہ آنے والے اکثر آہستہ آہستہ ایسے معاونین کی حیثیت سے (جن کے قیام و آرام کا انتظام باشندگان صوبجات کے ساتھ کردیا گیا تھا) ایسے قابض بن گئے جنھوں نے ان صوبوں کے باشندوں کے لئے خود ان کے املاک میں سے کم و بیش ایک معقول حصہ چھوڑ دیا ہو۔ مغربی یورپ کی رومانی حکومت میں اس قسم کا جو انقلاب اور آپس کا جدال و قتال برابر جاری رہا وہ سب اس کارروائی کے لیئے مؤید و باعث سہولت ہوگیا۔ آہستہ آہستہ یہ عیاں ہوگیا کہ ان ممالک میں فوجی قوت کا غلبہ بہت زور کے ساتھ وحشیوں کی جانب میں ہوگیا ہے۔ شہنشاہی کا اختیار خاص رفتہ رفتہ فنا ہونے لگا اور کم از کم کوہ آلپس کے پار تو بالکل ہی درہم و برہم ہوگیا اور پانچویں صدی کے ختم ہونے کے قبل ہی ان بربری بادشاہوں نے دریائے رائن سے بحر اوقیانوس تک اور بحیرہ جرمانی سے صحرائے افریقہ تک جرمانیوں کے ساتھ رومانیوں پر حکومت کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیلیا۔

اب ہم اپنی توجہ فرینکی بادشاہی پر مرکوز کرتے ہیں کیونکہ بعد میں اسی بادشاہی کے چارلس اعظم کی شہنشاہی کی صورت میں وسیع ہوجانے کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی ادارات کے تعین میں اس کو تقدم حاصل ہوگیا تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فرینک جب کلوویس کے تحت میں حاوی و غالب ہوگئے تو گاتھ اور برگنڈی وغیرہ کے ایسے دوسرے وحشیوں کے بہ نسبت انھوں نے رومانی خو بو کم اختیار کی اور ان کے دستور سے نمایاں طور پر ابتدائی دولت عامہ کے خصائص ظاہر ہوتے رہے۔ نئی بادشاہی کے بننے کا اولین نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کا اختیار و اعزاز بڑھ گیا۔ مختلف قوموں کے لئے وہی واحد رشتہ اتحاد ہوگیا۔ سابق رومانی رعایا کے لئے وہ شکستہ و افتادہ رومانی شہنشاہی کے بمنزلہ ہوگیا اور بہتوں کے لئے بلکہ خود جرمانیوں تک

کے لئے وہ ایک فاتح کی حیثیت میں آگیا۔ تحمد فرنیک انتشار کی وجہ سے سیاسی طور
پر کمزور ہو گئے اور اگرچہ فوج نے اس امر کو یاد رکھا کہ وہ سلح بردار آزاد اشخاص کی
ایک جمعیت ہے اور گاہ بگاہ سیاسی نازک وقتوں میں موثر طور پر مداخلت
بھی کرتی رہی تاہم قوم کے معاملات کے انصرام میں معمولی آزاد اشخاص کا شریک
ہونا بند ہو گیا۔ جنگ جویوں کی شاذ و نادر جمعیت بھی عملاً محض فوجی معائنہ ہو گئی
اور مقامی حلقے منتخب شدہ عہدہ داروں کے بجائے شاہی عہدہ داروں کے
زیر نگرانی آگئے۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ عام آزاد اشخاص کے ہاتھ سے جو
قوت اس طرح نکل گئی تھی اس پر زیادہ تر قدیم جماعت امرا نے قبضہ کر لیا ہو
بلکہ اس کا میلان زیادہ تر یہ تھا کہ وہ قوت ان امرا (کاؤنٹوں اور ڈیوکوں) کے ہاتھوں میں
جاتی رہی جو میرووِنجی بادشاہوں کے تحت میں اس زمانے میں فرنیکی بادشاہی کے
صوبوں کا انتظام کرتے تھے جب یہ بادشاہ نظم و ارتباط کے قائم رکھنے کے ناقابل
ہو گئے تھے لیکن یہ امرا (کاؤنٹ اور ڈیوک) بھی بادشاہ کے خدام میں سے لئے
جاتے تھے اور اولاً ان کا منصب محض بادشاہ کے نمائندے کے طور پر تھا۔
ملک کا انتظام بادشاہ کے ملازمان محل کے ہاتھ میں تھا اور جب موروثی بادشاہ
اس درجہ کمزور ہو گیا کہ وہ حکمرانی کے قابل نہ رہا تو ناظر محلات شاہی وہ شخص تھا
جو بادشاہ کو ہٹا کر خود اس کی جگہ متمکن ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ "اس کو ہٹا کر اس کی جگہ پر متمکن ہو گیا" وجہ یہ ہے کہ اگرچہ
اس طرح قدیم ٹیوٹنی بادشاہی کی طاقت اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ ان
ضرورتوں کو پورا کر سکے جو فتوحات کے پیدا کردہ وسیع الحدود و مختلف الاحوال مجموعہ
پر حکمرانی کرنے کے لئے درکار تھیں مگر اس میں اتنی قوت نہیں آئی کہ وہ اس کام کے
لئے کما حقہ کافی و وافی ہو سکے۔ خاندان کا تغیر بھی پوری طرح اس کی تلافی نہ کر سکا
کئی صدیوں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ مغربی یورپ کا تمدن نت نئی بدنظمیوں کے
ساتھ تکلیف دہ کشمکش میں مبتلا ہے اور کوئی واقعی راستہ اسے نہیں ملتا، اس
میں اگر کوئی وقفہ پڑا تو وہ خاندان کارولنجی کی پر زور حکمرانی کا مختصر زمانہ تھا۔
اسے اگر ہم مدارج ارتقا میں سے کوئی درجہ قرار دیں تو یہ دوسرا درجہ ہو گا۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم معاشرت کے اس خطرے کے زمانے میں بادشاہ یا حاکم کی اطاعت کرنے کی عادت، مذہبی شبہات کا احترام، مشترکہ شہریت کا احساس اور مشترکہ اغراض کے اتحاد عمل کا جوش ان میں سے کوئی قوت بھی اتنی زبردست نہیں تھی کہ متمدن نظم معاشرت کو ہیولانی حالت سے نکال لیجائے جس رشتہ نے نظم معاشرت کو مربوط کر رکھا تھا وہ عام و خاص سرکاری و شخصی حقوق و فرائض کا ایک مخصوص امتزاج یعنی زمین کی مشترکہ ملکیت سے جو روابط باہمی پیدا ہوتے تھے انہیں شخصی روابط کے ساتھ اس خاص طور پر متحد کر دیا گیا تھا جسے ہم نظم جاگیرداری کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

خطبۂ چہاردہم

جاگیری و نیم جاگیری نظم

میں نے سابقہ خطبہ میں یہ کوشش کی ہے کہ مغربی یورپ کا جو حصہ چارلس اعظم کی شہنشاہی حکومت کے تحت میں متحد تھا اسکے اسوقت تک کے خصوصیات مختصراً دکھاؤں جب وہاں وہ حالت پیدا ہو گئی جو جاگیریت کے نام سے مشہور و معروف ہے (اور یہی حصہ مغربی یورپی دستور سلطنت کے مطالعہ کرنے والے کے لئے خاص طور پر اہم ہے) ہمیں اب لازم ہے کہ اس موخر ارتقا اور اس کے نتائج کا تجزیہ زیادہ دقت نظر سے کریں۔

میرے خیال میں جاگیری نظم کو مذکورۂ ذیل میلانات کے اجتماع و ارتباط کیجانب منسوب کیا جا سکتا ہے ان میلانات میں ہر ایک کا پتا اس نظم سے علیحدہ اور اس سے قبل چل سکتا ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں (۱) جب بدنظمی کی انتشار انگیز قوتوں کے مقابلے میں آزاد شہریوں کا وہ رختۂ اتحاد جو اسے اپنے ہم شہروں اور اپنی ملت کے ساتھ تھا زاید از ضرورت کمزور ثابت ہوا تو اس تعلق پر سرداری و ماتحتی کے زیادہ قوی و قریبی شخصی تعلق کے غالب آجانے کا میلان پیدا ہو گیا۔ یہ دونوں مختلف تعلقات یعنی ایک طرف آقا و ملازم کا تعلق اور دوسری طرف آزادوں کا باہمی تعلق، قدیم ٹیوٹنی قوم میں ہمیشہ سے چلا آرہا تھا

بلکہ شاید ٹیوٹنی قوم کے بجائے یورپی قوم کہنا بجا ہوگا کیونکہ یہ تعلقات روما میں بھی صاف نظر آتے ہیں[1] البتہ روما میں ہمیں یہ ٹیوٹنی رواج نہیں ملتا کہ قبائلی سلطنت کے اندر سردار ایسا کر سکتے ہوں کہ نیم آزاد ماتحتوں کے ساتھ ہی ساتھ آزاد ماتحتوں یعنی برضائے خود قومی خدمت کرنے والوں کو بھی اپنی خدمت میں رکھیں کیونکہ ان میں یہ لازمی میلان نہیں تھا کہ جو تابعین ان خدمات کو انجام دیتے ہوں ان کا ادنیٰ طبقے کی طرف تنزل کر دیا جائے۔ یہ تعلق جاگیریت کے تخموں میں سے ایک تخم تھا۔ یہ ایک طبعی امر تھا کہ پر آشوب زمانوں میں ادنیٰ و اعلیٰ آزادوں کا یہ تعلق اس خواہش سے بہت کچھ بڑھ جائے کہ ایک طرف کمزور یہ چاہتے ہوں کہ وہ کسی زبردست کی حفاظت میں آجائیں اور دوسری طرف زبردست یہ چاہتے ہوں کہ وہ نئے تابعین کے ذریعے سے اپنی قوت کو بڑھا لیں۔

(۲) جاگیریت میں ایک دوسرا امتیازی عنصر یہ تھا کہ یہ میلان بڑھتا جاتا تھا کہ افراد کے سیاسی تعلق کا تعین ان کے اس تعلق سے کیا جائے جو زمین کے ساتھ انھیں حاصل ہو۔ قدیم ٹیوٹنی قوم میں آزاد شہری کو زمین کے لئے اپنے حصے کا استحقاق ملک کی حیثیت سے اس درجہ حاصل نہیں ہوتا تھا جس درجہ اس حق کی وجہ سے حاصل ہوتا تھا جو شہریت کامل کا لازمہ تھا۔ اولاً اس قسم کے حصے عارضی ہوتے تھے ٹکڑے اوقات معینہ پر دوبارہ تقسیم ہوتے رہتے تھے اور جب یہ طریقہ بند ہو گیا اس کے بعد بھی کچھ زمانے تک اگرچہ بیٹا فطرتاً باپ کا جانشین ہوتا تھا پھر بھی حصے قابل تقسیم نہیں ہوتے تھے یعنے وہ صحیح معنی میں قابل انفکاک یا قابل توریث نہیں تھے۔ جب قابل حصول زمین پر بالکلیہ قبضہ ہو گیا تو بتدریج توریث، تقسیم اور اس کے نتیجے میں عدم مساوات نے رواج پکڑا اور اگرچہ قبضہ زمین کے ساتھ شہریت کا واسطہ در ابطہ بدستور باقی رہا۔ مگر علت و معلول کا معاملہ منقلب ہو گیا۔ بے زمین آدمی کے حقوق شہریت زائل ہو گئے اور اگر وہ نظم معاشرت میں کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہو تو اسکے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے لئے کوئی آقا پیدا کرے۔ اسلئے وہ کسی نہ کسی صورت میں کسی بڑے زمیندار کی ملازمت میں داخل ہو جاتا تھا۔

[1] رومانی شہریوں کا شہریوں سے (Clens + Patronus) اور ماتحت کا آقا یا سردار سے Civis-Civis تعلق سمجھا جاتا تھا

وہ روپے یا خدمت کے عوض اس سے حق حفاظت حاصل کر لیتا تھا، اور اکثر لگان پر اس کی زمین کے کسی جزو کا کاشتکار بھی بن جاتا تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ (صحیح معنی میں) جاگیریت کے رواج کے قبل انگلستان میں یہ میلان نارمن فتح کے ذریعے سے قطعی صورت میں مروج ہو گیا تھا۔

پہلے ان دونوں میلانات کا جداگانہ اجزا کے طور پر تصور قائم کیجئے اور پھر ان دونوں کو ذہن میں جمع کیجئے۔ ان دونوں کے اختلاط سے شخصی خدمت اور قبضۂ اراضی کا وہ امتزاج پیدا ہوا جو جاگیریت کے لئے شرط لازمی تھا۔ یہاں مجھے ان دو قسموں کے تعلقات کا فرق بھی دکھانا ہے جس میں سے ایک تو جاگیری امراء کا تعلق اپنے اُن زیر دستوں کے ساتھ تھا جو کلیۃً نہیں مگر مقدماً و خاصتہً اس کے لئے فوجی خدمت کے پابند تھے اور دوسرا تعلق اس کی زمین کے ان اصلی آزاد کاشت کاروں کے ساتھ تھا جن کے خدمات غیر فوجی تھے۔ یہ موخرالذکر تعلق اگرچہ جاگیریت کا ایک لازمہ تھا مگر قطعاً جاگیری نہیں تھا۔ قطعی جاگیری طریقہ وہی تھا جو تابع کا اپنے آقا کے ساتھ ہوتا تھا۔ قانونی الفاظ میں یہ تعلق شخصی و حقیقی (جائیدادی) دونوں تھا، تابع اپنے آقا کے لئے ایک ماتحت آزاد شخص کی خدمت اور خاص کر جنگ کی خدمت کا پابند ہوتا تھا مگر یہ پابندی اس پر زمین کے ایک حصے کے مشترکہ حق کی وجہ سے عائد ہوتی تھی۔ جیسے آخرالامر جاگیر کہنے لگے تھے۔

مگر جاگیریت کی نمایاں سیاسی خصوصیت اسباب و علل کے ایک تیسرے اجتماع کی زیر بار احسان تھی۔ ایک مزید امتزاج یہ پیدا ہوا کہ زمینداری اگر وسیع ہوتی تھی تو علی العموم اس زمین پر بسنے والے آزاد اشخاص کے متعلق اہم حکومتی فرائض بھی، زمینداری کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ پھر یہ آخری امتزاج بھی دو تحریکوں کے متحدہ نتائج کی وجہ سے پیدا ہوا (۱)۔ بڑے بڑے زمینداروں نے

یہ کوششیں کیں کہ ان کے علاقوں میں جو آزاد خواہ غیر آزاد اشخاص رہتے ہوں ان پر انھیں خود مختارانہ عدالتی اختیار مل جائے، اور اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے فرینکی شہنشاہی کے وہ منتشر اجزا جو خالص جاگیریت کے مسکن اولین تھے ان میں اس تحریک کا آغاز کلیسا نے کیا اور علمانی اشخاص انھیں کے اتباع میں چلے۔ (۲) وہ ڈیوک اور کاؤنٹ جو ابتداً سرکاری عہدہ دار ہوتے اور جنہیں ایسے فرائض تفویض ہوتے تھے جو بادشاہ کی مرضی سے علیحدہ کئے جا سکتے تھے اور اس کے ساتھ آمدنی کے سرکاری وسائل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے، ان لوگوں نے یہ کوششیں کیں کہ ان کے فرائض موروثی سمجھے جائیں اور سرکاری و ذاتی آمدنی کے فرق کو مٹا دیا جائے وہ بھی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ پس اس طرح بر عام زمینداروں کے حکومتی فرائض کے اختیار کر لینے اور سرکاری عہدہ داروں کے اپنے اختیارات و امتیازات کو ایک طرح کی موروثی جاگیر بنا لینے سے قبضۂ اراضی کی بنا بر ذاتی و سرکاری حقوق و فرائض کے امتزاج پر دونوں طرف سے بار پڑ گیا اب اس کے ساتھ یہ تصور بھی قائم کیجئے کہ امراء کے وہ تابعین جو ان کے لئے فوجی خدمت کے ذمہ دار تھے (اور جن میں سے بعض نیم غلامی کی حالت سے ترقی کر کے اس درجہ پر پہنچے ہوں گے) اور وہ لوگ جو ان امرا کی زمینوں پر کاشت کرتے اور انھیں لگان ادا کرتے یا غیر فوجی خدمات انجام دیتے تھے (اور جن میں سے بعض بعض ابتداً آزاد رہے ہوں گے)، ان دونوں قسم کے لوگوں میں بھی نمایاں معاشری فرق قائم ہو گیا تھا اب سیاسی تعلقات کا عام جاگیری تصور مکمل ہو گیا۔

(۲) ہمیں چاہیئے کہ سلسلۂ عمل پر فکر کو ترک کر کے نتیجۂ حاصلہ (یعنی ایک ایسے نظم معاشرت کی سیاسی و معاشری ہیئت) کے اہم خصوصیات پر غور کریں جس میں جاگیریت قائم ہو چکی ہو اور سر دست قسیول کے طبقے کو چھوڑ دیں اور شہروں کی اس آزاد ہیئت و حکومت خود اختیاری سے بھی غرض نہ رکھیں جسنے جاگیریت کے ابتدائی مدارج کے زمانے میں اکثر اضلاع میں بہت ہی کم نشو و نما حاصل کی۔

ہم ایک ایسا نظم معاشرت دیکھتے ہیں جسکے ارکان ایک دوسرے کے ساتھ مختلف مدارج کے معیار سے وابستہ تھے اور یہ مدارج تعلقات اراضی کے معیار کے بموجب قائم و مستحکم ہوئے تھے۔ اس معیار میں سب سے زیادہ نمایاں تقسیم وہ تھی جو بالائی یعنی فوجی حصے کو زیرین حصہ خاص کر زرعی حصہ سے جدا کرتی تھی سپاہی یا زمین ملیز یا نائٹ جو کچھ بھی اس کا درجہ ہو کہ ہر حال میں کسان سے برتر تھا خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ اس معیار کے بالائی حصہ پر (یعنی اس فوجی طبقہ پہ جو اپنی زمین کی پیداوار پر بسر کرتا اور اس کا مالک ہوتا تھا مگر خود کاشت نہیں کرتا تھا) ایک مقررہ انداز کے ساتھ (جس کا تعین رسم و رواج سے ہو گیا تھا) اپنے سے قریب تر بالادست کے لئے فوجی خدمت لازمی تھی کیونکہ یہ لوگ اپنے بالادست کے ساتھ شخصی وفاداری کے روابط سے وابستہ ہوتے تھے اور اس وفاداری کا قیام و استحکام حلف وفا شعاری سے ہوتا تھا۔ علاوہ ان عام ذمہ داریوں کے کہ تابع اپنے آقا کو یا اسکی ذات، خاندان یا جائداد کو کسی نہج سے نقصان نہ پہنچائے گا وہ خاص طور پر اس امر کا بھی پابند ہوتا تھا کہ جنگ میں اس کے ساتھ شریک ہوگا، اسکی عدالت میں حاضر ہوگا اور بشرط طلب عملدرآمد انصاف میں شرکت کرے گا اور اسکی عدالت کے فیصلوں کو قبول کرے گا۔ گاہ بہ گاہ جو رقوم عاید ہونگے انہیں بھی ادا کریگا خاص کر جب جاگیر وراثت میں جائے تو "نذرانہ" دینا ہوگا تھا، اور جاگیر کی علیحدگی کی صورت میں جرمانہ اور آقا کی بعض خاص ضرورتوں کے وقت میں "امداد" بھی دینا پڑتی تھی [1]۔

یہ ہو سکتا تھا کہ ان تابعین کے ادنیٰ ترین طبقے کا آقا، بادشاہ یا کوئی ڈیوک ہو جو شہنشاہ کے سوا اپنے سے کسی اور بالاتر شخص کا تابع نہ ہو مگر اکثر و بیشتر صورتوں میں جاگیری و فاشعاری کی زنجیر میں بہت سی کڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ بڑے بڑے تابعین جن پر ایک مدت تک

---

[1] اس کے مسلمہ اوقات مختلف دوروں اور مختلف جگہوں میں مختلف تھے انگلستان میں منشور اعظم کی رو سے وہ تین اوقات کے لئے مخصوص تھے یعنی جب[1] لارڈ کا بڑا بیٹا نائٹ بنایا جاتا تھا، جب[2] اس کی بڑی لڑکی کا عقد ہوتا تھا اور جب[3] خود لارڈ کو قید خانہ سے رہا کرانے کی ضرورت ہوتی تھی

شہنشاہ فرانس کو برائے نام حق شاہی کے سوا اور کچھ اختیار نہ تھا۔ ایک بڑی حد تک ان کے بھی تابعین تھے جو اپنی باری میں دوسرے تابعین کے آقا تھے۔ جب جاگیریت اپنے پورے زور دل پر تھی، اس وقت میں اس کے دو نتائج نظم سیاسی کے لئے خصوصیت کے ساتھ مہلک ثابت ہوئے (۱) ایک تو یہ کہ تابعین کی وفاداری اپنے سے قریب ترین آقا کے لئے تھی اور اس لئے معمولی حالات میں بادشاہ تک یہ وفاداری انہی کے ذریعے سے پہنچتی تھی اور کبھی کبھی اس سلسلے میں ایک سے زائد کڑیاں ہوتی تھیں بادشاہ کو اس کا حق نہ تھا کہ اپنے براہِ راست تابعین کے سوا اور کسی سے حلف وفاداری لے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر بادشاہ اور اس کے کسی بڑے جاگیردار میں تنازعہ پیش آجاتا تھا تو موخر الذکر کو بالعموم یہ اعتماد ہوتا تھا کہ اس بغاوت میں اس کے فوجی ماتحت اسی کا ساتھ دینگے (۲) دوسرے یہ کہ ابتداً اس نظم میں تجویز یہ تھی کہ ایک تابع کی صرف ایک ہی جاگیر ہونا چاہیئے مگر حرص و ہوس نے اس قاعدے کو بیکار کر دیا اور نوبت بایں جا رسید کہ ایک ہی امیر ایک ہی وقت میں دو متخاصم بادشاہوں کا تابع ہوتا تھا یا کہ خود مختار بادشاہ اپنی اس خود مختاری کے باوجود کسی دوسرے بادشاہ کا تابع بھی ہوتا تھا۔ پس اس قسم کی پیچیدگیوں سے صریحاً یہ میلان پیدا ہوا کہ رشتۂ وفاشعاری ایک خیالی شے ہو کر رہ گیا۔

ان نتائج میں سے پہلا نتیجہ نہایت ہی اہمیت رکھتا تھا، اور نارمنڈی کے ولیم کی پرزور حکومت کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اگرچہ اس نے انگلستان میں جاگیریت کو رواج دیا مگر اس نتیجے کو اس سے الگ رکھا۔ یہاں میں اسٹبز کی عبارت نقل کرتا ہوں سالزبری کی ۱۰۸۶ء والی مشہور مجلس کے موقع پر ہمیں "اخبار سکسن" The Chronicle سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے تمام ذی اثر زمیندار خواہ وہ کسی کے بھی تابع رہے ہوں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور سب نے اس کی اطاعت قبول کی، اور اس کے تابع ہو گئے اور یہ حلف وفاداری اٹھایا کہ تمام دنیا کے مقابلے میں وہ اس کے

(یعنی بادشاہ کے) وفادار رہیں گے؀ قدیم قانون کے بموجب برِاعظم تک میں یہ مقدر سمجھا جاتا تھا کہ کسی نیچے درجے کے آقا کی حلف وفاداری سے بادشاہ کے متعلق جو فرض تھا وہ محفوظ رہتا تھا اگر اس تحفظ کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا اور فرانس وجرمنی میں جاگیریت کے دورِعروج میں جاگیری اخلاقیات کے اندر یہ تحفظ نقش برآب ہوگیا اور اسکے ساتھ ہی اپنے اتباع عظام پر شہنشاہ کا اقتدار اعلیٰ اور کچھ دنوں کے لئے شاہ فرانس کا اقتدار اعلیٰ بھی ہوا ہوگا جنگ وصلح ضرب سکہ جات کے جملہ امور عدالت؛ غرض کوئی بھی حق فرمانروائی ایسا نہیں تھا جس پر یہ لوگ اپنی آزادانہ صوابدید کے بموجب عمل کرنے کے دعویدار نہ ہو گئے ہوں۔

اب ہمیں اس معیار کے درجہ ادنیٰ یعنی کاشتکاروں کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ ان لوگوں کے حقوق حیثیت کے متعلق کسی قسم کی تعمیم اس وجہ سے دشوار ہے کہ ان میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا اور اکثر ازمنہ واکمنہ میں وہ نامعلوم سے ہیں؛ مگر عام اجمالی حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے غلام تھے، جو بتدریج غلامان وابستہ اراضی (سرف) کی حیثیت کو پہنچ گئے تھے (اور یہ زیادہ تر کلیسا کے اثر سے ہوا) اور اگرچہ قانونی نظرئے کی رو سے یہ لوگ غیر محدود صورت سے ادائے محصول اور جبری خدمت کے لئے مجبور تھے مگر بتدریج انھوں نے حقوق حاصل کر لئے تھے اور ان کی ذمہ داریاں رسم و رواج کے ذریعے سے محدود ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد دوسرے درجے میں وہ آزاد تھے جو معاشری معیار میں گر گئے تھے اور جو کبھی (خاصکر نویں اور دسویں صدی کے پرآشوب زمانے میں) کسی دنیاوی امیر اور بالعموم کسی اسقف یا رئیس خانقاہ کے زیرِحفاظت ہو جایا کرتے تھے (اور کبھی کبھی اپنی ذات کے ساتھ اپنی زمین کو بھی سلسلۂ تحفظ میں شامل کر دیتے تھے) اور اس طرح زیرِحفاظت آکر اس تحفظ کے عوض میں ادائے رقوم کی چند معینہ

؀ تاریخ دستوری جلد اول باب نہم صفحہ ۲۶۶ –

شرائط کے ساتھ باجگذار ماتحت کی حیثیت قبول کر لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ انھیں اس حالت کے قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہوگا لیکن علی العموم وہ لوگ برضائے خود ایسا کیا کرتے تھے اگرچہ بعد میں اکثر ایسا ہوا ہوگا کہ انھیں زیادہ تکلیف دہ شرائط کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو کیونکہ مختلف ازمنہ واکمنہ کے اختلاف رفتار کے باوجود بظاہر عام میلان یہی تھا کہ کاشتکاروں کے دونوں طبقوں کو ایک کر دیا جائے۔ پس اس طرح ایک عنصر تو غلامی کی حالت سے ترقی کر کے غلامان وابستۂ اراضی کی حیثیت تک بلند ہو گیا اور دوسرا اس حیثیت کی جانب تنزل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ غرض بظاہر آزاد کاشتکاروں کی نسبت بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ زمین کے ساتھ وابستہ ہونے میں وہ غلاموں سے کم نہیں ہیں اور ان کے آقا کی طرف سے جو عدالتی احکام صادر ہوتے ہیں ان کی نسبت ان کاشتکاروں کو اکثر و بیشتر کسی قسم کے قانونی مرافعے کا حق نہیں حاصل تھا[۱]۔

[۱] کاشتکاروں کے ساتھ فوجی زمیندارانہ طبقہ کے تعلق کا مقابلہ یونان میں اہل اسپارٹا کے اس تعلق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو انھیں ہیلوٹوں (غلامان وابستۂ اراضی) کے ساتھ تھا۔ درحقیقت بعض وقت تو اس جاگیریت کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے کہ بربریوں کا کوئی قبیلہ یا غول یا اس متمدن لوگوں پر مسلط ہو گیا تھا (خاصکر فرانس کی نسبت بعض کا یہی خیال ہے) فاتح بربری مفتوحین کی زمین لے لیتے اور اس پر آرام سے بسر کرتے اور مفتوح زمین جوتتے تھے۔ اس طرح "امیرانہ" طبقہ اور جنگجو طبقہ ایک ہو گیا۔ اس بیان میں بہت کچھ صداقت ہے مگر اس میں ضرورت سے زیادہ سادگی سے کام لیا گیا ہے کیونکہ محض ایسی فتح سے کہ فاتح زمین کو اپنے تصرف میں لے لیں جاگیریت کا سیاسی خیال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ مثلاً اسپارٹا کے معاملہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نسبتاً کم متمدن فاتح قبیلہ یونان کے ایک ایسے حصہ پر حاوی ہو کر جس کی تمدنی حالت اس سے برتر تھی آرام طلب زمیندار و جنگ آور بن گیا مگر اس فتح سے قبیلہ کے اندرونی سیاسی تعلقات میں کوئی ایسا فرق نہیں آیا۔ جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں اسپارٹا کے نظم حکومت میں ابتدائی خصوصیات بہت نمایاں طور پر باقی رہے مگر جاگیریت میں اس صورت کا وقوع نہایت ہی بعید ہے۔ جاگیریت وہ قبیلی ٹوٹی نظم سلطنت نہیں ہے جو رومانی متمدن پر اوپر سے مسلط کر دی گئی ہو قدیمی نظم حکومت کے حقیقی خصوصیات اساسی طور پر بدل گئے تھے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ قدیم دستور کی صورتیں نئی صورت حالات پر مطابق نہیں آتی تھیں اور رومانی شہنشاہی کے ادارات کا بہت بڑا اثر پڑ رہا تھا۔

جس نظم کا میں نے یہ مختصر خاکہ کھینچا ہے اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالکر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نظم پر جب سیاسیات متقابلہ کے نقطۂ نگاہ سے خیال کیا جائے۔ تو بعض دوسرے لوگوں کے مباحث میں جو خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے یعنی اس کی فوجی خدمت کے ساتھ قبضۂ اراضی، وہی اس میں سب سے کم ممیز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فوجی خدمت اور قبضۂ اراضی کا تعلق نظم معاشرت کی ان حالتوں تک میں پایا جاتا ہے جو جاگیریت کے زمانے سے بہت دور دراز واقع تھیں جس کی ایک مثال اسپارٹا ہے۔ اپنے موجودہ نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے ہمیں زیادہ ضرورت ان امور پر زور دینے کی ہے کہ (۱) اپنے سے بالاتر کی شخصی وفاداری نے مشترک شہریت کے رشتے کی جگہ لیلی تھی اور (۲) قبضۂ اراضی کے ساتھ بہت وسیع پیمانے پر حکومتی حقوق کا امتزاج ہوگیا تھا یعنی بڑے بڑے جاگیری امرا کو اپنا خاص سکہ چلانے، اپنے طور پر جنگ کرنے، آزادانہ طور پر باقاعدہ محصول لگانے، ابتدائی اختیارات عدالتی کو کلیۃً خانگی عمل میں لانے کے حقوق حاصل ہوگئے تھے جس قوم میں اس قسم کے حکومتی اختیارات وامتیازات چند بڑے بڑے زمینداروں کو (بہ حیثیت زمیندار ہونے کے) حاصل ہوں، صاف عیاں ہے کہ اصولاً اس قوم کا ارتباط ناکمل ہوگا اور اسلئے اغلب یہی ہے کہ عملاً بھی اس میں نظم وامن نہایت ہی ناقص ہوگا اور واقعی تھا بھی ایسا ہی۔

اس نظم کے حق میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے تمام اصولی نقائص اور عملی عدم تکمیل کے باوجود اس نے شخصی وفاداری کے زبردست احساس اور قبضۂ زمین سے متعلق مستحکم تعلقات کو باہم ملا کر نظم وامن کا ایک ایسا عارضی قالب تیار کردیا جس میں نسبتاً زیادہ صحیح قومی زندگی نشوونما پاسکتی تھی اور اگر فی الحقیقت ہم یہ خیال اپنے ذہن میں رکھیں کہ ان ممتزج حقوق کے قابضین میں مختلف حد تک خدید مسیحی اخلاق کا جوش بھی موجود تھا تو اس امتزاج کے بہت سے خطرات باطل ہوجاتے ہیں۔ ایک سچے مسیحی کے لئے شخصی جائداد کے مالک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ

کہ اس پر معاشری فرض عائد ہوتا ہے اور وہ عام بہبود کے لئے کوشش کرے جس کا اسے اسی سختی کے ساتھ حساب دینا پڑے گا جس سختی کے ساتھ حکومتی اختیار پر قابض ہونے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ جاگیری صورتوں نے جس اثر انگیز اسلوب پر اس اعلیٰ تخیل کا خیال پیدا کیا، اسی کی وجہ سے پرجوش قدر دانوں کو نظم جاگیری کی طرف ایسی توجہ ہوئی لیکن اس تخیل اور اوسط درجے کے انسانی طبائع کے امکانات میں بہت ہی بون بعید تھا کم از کم یہ کہ ارتقا کی اس منزل میں تو ضرور ہی ایسا تھا عملی نتیجہ بہت کچھ باغ کی رکھوالی بکری کی دالی جرمانی مثل کے مترادف تھا اور جب ہم جاگیری بادشاہی کا ذکر کرتے ہیں (جیسا کہ جائز طور پر ہونا چاہیئے) تو ہمیں دل میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بادشاہی کی قوت اور انجام کار اس کے غلبے کا راز اس حقیقت میں مضمر تھا کہ اس تمام دوران میں اسے جس حد تک حکمران جاگیری طبقے کے اندر سمجھا جاتا تھا اسی حد تک اسے اس طبقے سے باہر بھی خیال کیا جاتا تھا کیسے ہی دھندلے اور ناکمل طور پر ہو مگر بادشاہی کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ سلطنت کی غیر منقسم قوت اور بلند تر و مساوی تر انصاف کا منبع ہے (جس کے حضور میں معاشری انظم کے تمام طبقات اسفل مرافعہ کر سکتے ہیں) اور وہ ایک ایسے اقتدار کی نمائندہ ہے جسے قانونی طور پر یہ دعویٰ ہو سکتا ہے کہ وہ حکمران طبقہ کے درمیانی مدارج کی جنگ و جدل کے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

(۳) جس جاگیریت کا میں یہ بیان کر رہا ہوں، اس کا بسیطۂ عمل وہ ممالک تھے جو چارلس اعظم کے تحت میں متحد رہ چکے تھے۔ فرانس کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یہ طریقہ دسویں صدی میں مستحکم و مربوط ہو چکا تھا۔ جرمنی میں اس کی ترقی کسی قدر بعد کو ہوئی، اس وجہ سے کہ رائن کے دوسری جانب قدیم دارات و رسوم زیادہ مستحکم طور پر رائج تھے۔ شہنشاہی کے اثر کے وسیلے سے ڈنمارک میں بھی اس کا شیوع ہوا اور نارمن فتح نے اس کے ایک اہم جزو یعنی فوجی خدمت کی شرط کے ساتھ قبضۂ اراضی کو نہایت ہی مکمل صورت میں انگلستان میں بھی رائج کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس سیاسی انتشار کو خارج رکھا جس کا اس درجہ تباہ کن اثر ہم براعظم کی جاگیریت میں دیکھ چکے ہیں۔

اس لئے میری عنان توجہ اس اعتراض پر غور کرنے کی طرف منعطف ہوتی ہے جو میرے اس مضمون زیر تشریح کے تصور عام کی نسبت پیدا ہوگا۔ یہ کہا جائے گا کہ "جاگیریت" یا "جاگیری بادشاہی" اور اس سے بھی بڑھ کر "فرینکی بادشاہی" (اپنے قبل از جاگیری مدارج کی صورت میں) ایسے تصورات ہیں جن میں اس قدر تعمیم نہیں پیدا ہوئی ہے کہ وہ سیاسیات کے مقاصد پورے کرسکیں جس کی نسبت میں پہلے ہی یہ واضح کرچکا ہوں کہ اس کا مقصود یہ ہے کہ خاص مثالوں کے مقابلہ واستقراء سے تاحد امکان عام انداز و میلان کے قطعی تصورات قائم کرے۔ اب مناسب طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرینکی بادشاہی حکومت کا محض وہ طریقہ تھی جو جاگیریت کے قبل اس سلطنت عظیمہ کی مخصوص صورت میں پیش آئی، جسے پانچویں صدی کے اختتام میں کلووس کے فتوحات نے قائم کیا تھا، اور آٹھویں صدی کے اختتام کے قریب چارلس اعظم نے اسے بڑھا کر ایک شہنشاہی بنا دیا۔ مگر انگلستان، اسپین، اور اسکینڈنیویا میں تو کوئی فرینکی اور خاصکر گروہی بادشاہی نہیں تھی؛ اور ارتقا کی عام رفتار کے پتا چلانے میں ہمیں جس بات کی ضرورت ہے وہ ایسے ہی عام تصورات ہیں جو اگرچہ یکساں طور پر نہیں مگر کم و بیش متعدد صورتوں پر عائد ہوتے ہوں۔

اس اعتراض کا جواب دیتے وقت یہ امر لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ "فرینکی بادشاہی" حکومت کی ایک خاص تاریخی شکل کا نام ہے نہ کہ حکومت کے کسی ایسے طرز عام کا جو متعدد مثالوں کی تجرید سے ماخوذ ہو مگر اس کا جواب الجواب یہ ہوسکتا ہے کہ خود رومانی شہنشاہی کا بھی یہی حال ہے پھر بھی اس سے مفر نہیں کہ یورپ کے سیاسی ادارات کے ارتقا میں رومانی شہنشاہی کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس سے اساسی اہمیت کے ایک خاص درجہ کا اظہار ہوتا ہو۔ مغربی یورپ کی جدید سلطنتوں میں سے اگرچہ صرف چند ہی سلطنتیں قدیم رومانی شہنشاہی کے اجزا سے مرتب ہوئی ہیں پھر بھی جن اسباب و علل نے دوسری سلطنتوں کو ان کی موجودہ حالت پر پہنچایا ہے انہیں

ایک اہم جزو یہ رومانی شہنشاہی بھی ہے اگرچہ اس کا اثر بالواسطہ پڑا ہے۔ صرف ایک ہی قسم کے اثر کو لیجئے کہ مغربی یورپ کی تمام سلطنتوں کے اندر ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے تمام دوران میں فرقۂ تسیتس منقسم وفاداری کا اعتراف کرتا رہا ہے یہ فرقہ کسی خاص سلطنت کی حکومت کے تحت میں صرف جزاً تھا اور جزاً وہ اس خودمختار فرمانروا کے تحت میں تھا جس کا دربار روما میں تھا اور جو تمام عالم عیسوی میں پادریوں کے درمیان انصاف کرنے اور ان پر محصول لگانے کا دعویدار تھا، اس امر واقعہ کی تشریح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس سے قبل کی روما کی دنیاوی شہنشاہی پر اسے محول کیا جائے ہابس نے بہت ہی خوب کہا ہے کہ پاپائیت رومانی شہنشاہی کا گویا بھوت ہے جو تاج پہنے ہوئے اس کی قبر پر بیٹھا ہوا ہے۔ بہرحال اگرچہ بالکل اسی حد تک نہیں مگر بالکل اسی طرز پر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ فرینکی شہنشاہی کا وجود مغربی یورپ کی سلطنتوں کی تاریخ میں بالعموم ایک مقدم و مرکزی واقعہ ہے یہاں تک کہ اس کا اثر نہ صرف (فرانس، جرمنی، و شمالی اطالیہ کے) ممالک کی ترقی مابعد میں اہمیت کا درجہ رکھتا ہے جو خود اس شہنشاہی سے لوٹ کر بنے بلکہ دوسرے ممالک پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ فرینکی شہنشاہی کے اندر جس طرح رومانی و جرمانی عناصر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جاگیریت ظہور میں نہ آتی جو صرف فرانس و شہنشاہی تک محدود نہیں رہی بلکہ شہنشاہی کے اثر سے ڈنمارک میں اور نارمن فتح کے ذریعے سے انگلستان بلکہ اسکاٹلینڈ تک پہنچی اور جنوبی اطالیہ میں بھی داخل ہو گئی۔ لہذا کلودس اور اس کے جانشینوں اور اس سے زیادہ چارلس اعظم کے تحت میں فرینک کے سیاسی ادارات نے یورپ کے اندر ایسی مرکزی اہمیت حاصل کر لی تھی جو اور کسی ادارے کو حاصل نہیں ہوی مثلاً اگبرٹ و الفرڈ اور اڈگر دکینوٹ کے تحت میں انگلستان کے متوازی مدارج کے سیاسی ادارات کو یہ مرتبہ نہ حاصل ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ مغربی یورپ کے بیشتر و مقدم حصص میں جو جاگیریت رائج ہوی اس کے بعض ممتاز خصوصیات ایک خاص طریقے پر فرینکی شہنشاہی کے مختص حالات

سے مربوط ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں کسی حد تک مذکورۂ بالا اعتراض کی قوت کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ ہر چند کہ دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک مغربی یورپ میں جاگیریت کا زور شور رہا تاہم صحیح جاگیریت اس وقت بھی ایک گونہ عجائبات ہی سی رہی، اور میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ صحیح جاگیریت کے حدود سے باہر کی سلطنتوں کے ارتقا کو بھی ہم نظر غور سے دیکھیں تاکہ کامل جاگیری و غیر جاگیری حالات کے مقابلہ کرنے سے ہم ان مدارج ارتقا کی وسیع تر خصوصیت پر پہنچ سکیں جن کی نمائندگی فرانس و جرمنی میں فرنگی و جاگیری بادشاہوں سے ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیئے بعض امتیازات سے انگریزی تاریخ کا مطالعہ خصوصیت کے ساتھ مناسب و موزوں ہے کیونکہ نارمن فتح کے قبل ہمیں انگلستان میں ایک ایسی رفتار ارتقا کے تصور کا موقع ملتا ہے جو زیادہ تر اسی جانب چل رہی تھی جس کی انتہا فرانس و جرمنی میں جاگیریت پر ہوئی مگر ہنوز اس کا نتیجہ قطعی جاگیریت کی صورت میں نہیں ظاہر ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گیارھویں صدی میں انگریزی ادارات جس حد پر پہنچ گئے تھے ان میں اور اس جاگیریت میں جسے نارمنوں نے رائج کیا (اسٹبز کی رائے کے مطابق) بہت ہی اہم و اصولی فرق تھا مگر دونوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ بہت زیادہ عمیق و وسیع نہیں تھی چونکہ خالص جاگیریت انگریزوں کے درمیان غیر ملکی لباس میں آئی اس لئے وہ اس کے استرداد کی طرف مائل ہو گئے اور انجام کار ہیں شدت و مدت دونوں لحاظ سے اس کے اثر کو اس درجہ گھٹا دیا کہ وہ برّاعظم کی جاگیریت سے ایک بہت ہی مختلف شے بن گئی۔

(۴) پس سوال یہ ہے کہ ہم سیاسی ارتقا کے ان مدارج میں جن کی خاص مثالیں "فرنگی" و "جاگیری" بادشاہیاں ہیں زیادہ عمومی رنگ پیدا کرنے کی سعی کس طرح کریں؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم جاگیریت خالص کے حدود سے دور تر نظر دوڑانے کی کوشش کریں اور ان سب کو ایک وسیع تر تعمیم کے اندر شامل کر لیں تو پھر ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ سب ایک طویل سلسلۂ عمل کے مدارج ہیں، جن کے میلانات حسب ذیل ہیں؛ قدیم نظم حکومت کا عمومی عنصر یعنی سلاح بردار آزاد شخصوں کی

جمعیت کا اعلیٰ اقتدار مختلف اسباب کے جمع ہو جانے سے زوال پذیر ہوگیا۔ ان اسباب میں ایک سبب یہ تھا کہ وسعت ملکی کی وجہ سے بادشاہ کو زیادہ اختیار و امتیاز حاصل ہوگیا، دوسرا سبب یہ تھا کہ قوم جب زیادہ وسیع رقبے پر پھیل گئی تو شہری ہونے کا رشتہ کمزور ہوگیا۔ تیسرا سبب یہ ہوا کہ اتنی وسیع جماعت کی حکومت کے لئے غیر نمائندہ جمعیت ناموزوں ثابت ہوی۔ پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو اختیار اسطرح قوم کے ہاتھ سے نکل گیا تھا وہ بادشاہ کے ہاتھ میں آجائیگا، وہ زیادہ صاحب اعزاز و منزلت ہوگیا تھا، قوم کا امن بادشاہ کا امن اور قوم کی زمین بادشاہ کی زمین ہوگئی تھی پھر بھی، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحریک قطعی طور پر بادشاہی کی تقویت کی طرف گامزن تھی۔ چنانچہ اسٹبز نے انیگلو سیکسن نظم کے متعلق یہ لکھا ہے کہ شاہی اختیار کی ترقی عملی ہونے کے بہ نسبت زیادہ تر نظری تھی، ایک طرف اس نے نفع حاصل کیا تو دوسری طرف نقصان اٹھایا۔ بادشاہ انصاف کا منبع و ماخذ، اپنی قوم کا آقا و مربی اور سرکاری زمینوں کا مالک ہوگیا مگر اس طرح جو اختیارات حاصل ہوئے ان کے حقیقی نفاذ سے اسے بہت ہی جلد دست بردار ہونا پڑا[1]۔ حکومت کا کام چلانے کے لئے ماتحت سرداروں کو کسی قدر اختیارات دینا پڑے اور ان اختیارات نے انھیں بادشاہ کا خطرناک رقیب بنا دیا۔ نتیجہ بہ حیثیت مجموعی یہ نہیں ہوا کہ شاہی کو تقویت حاصل ہو جاتی بلکہ شاہی و عدیدیت میں سے کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کا، اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) یہ عدیدیت انتشاری قسم کی تھی جس کا میلان یہ تھا کہ طاقتور امراء کو ضرورت سے زیادہ شخصی آزادی ملجائے۔ جیسا کہ میں فرینک قوم کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ہی کہہ چکا ہوں قوم کے زیادہ وسیع ہو جانے سے شاہی پر جو مزید بار پڑا اسے سرانجام دینے کی ضرورت نے شاہی میں ترقی پیدا کر دی مگر اس میں اتنی ترقی نہ ہوی کہ وہ اس کام کو کاملاً انجام دیسکتی، ایسے ماتحت حکومتوں کے اس میلان سے دست دگریباں ہونا پڑا کہ یہ حکومتیں موروثی و نیم آزاد ہو جائیں یعنی ہر ایک حکمراں اپنے اپنے ضلع میں چھوٹا سا بادشاہ بن جائے[2]۔

---

[1] ۔ تاریخ دستوری جلد اول صفحہ ۲۰۷۔
[2] ۔ بجنسہ اسی قسم کا تنازعہ اسکینڈینویا کی تاریخ میں ہمارے سامنے آیا تھا۔

پس اس دور میں (جس کی وسعت سرسری طور پر بارھویں یا تیرھویں صدی تک سمجھنا چاہیئے) سیاسی نظم کی نہایت ہی عمومی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو وہ بادشاہی کی طرف مائل تھی نہ عدیدیت کی جانب بلکہ ان دونوں کے درمیان اسکے پلے حرکت کرتے رہتے تھے۔ جوامر بہ گیر طور پر صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سرداری وماتحتی کا تعلق ان تعلقات پر غالب آجاتا تھا جو قبیلے یا قوم کے معمولی شہری یا آزاد رکن کو اپنے ہم شہروں یا قوم کے ساتھ ہوتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی جیساکہ اسٹبز نے انگلستان کی صورت میں بیان کیا ہے شخصی تعلقات کی جگہ پر ملکی تعلقات قائم ہوتے جاتے تھے۔ معاشرت قدیم کا اساسی اصول یہ تھا کہ قوم کے ہر آزاد وکامل الحقوق رکن کو قومی زمین میں حصہ پانے کا حق حاصل تھا، اور افراد کی سیاسی حیثیت ومنزلت سے اس کے تعلق اراضی کا تعین ہوتا تھا، لیکن بعد کے زمانے میں جس پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں یہ اصول الٹ گیا۔ اس زمانے میں افراد کی سیاسی حیثیت کا انحصار ان کے اراضی سے تعلق رکھنے پر ہوگیا۔ ایک طرف تو بے زمین شخص کو کسی نہ کسی آقا کے پیدا کرلنے کی ضرورت ہوئی اور دوسری طرف حکومتی فرائض کا ایک اہم جز یعنی مختلف درجہ کے عدالتی اختیارات ملکیت اراضی کے جزد لاینفک ہوگئے اور قومی عدالتیں بڑے بڑے زمینداروں کی عدالتیں بنتی گئیں۔

غرض، یہ میلانات صحیح جاگیریت کے حدود سے باہر بھی صاف نظر آتے تھے اگرچہ (جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کو سب سے زیادہ نمایاں اظہار کا موقع اسی نظم میں ملا۔

میں اس طرح پر اس کی توضیح اور زیادہ کرسکتا ہوں کہ خاص انگلستان کے معاملے میں فتح کے قبل کے نیم جاگیری حالات اور نارمنوں کی جزوی جاگیریت کے فرق کی جانچ پرتال زیادہ غائر نظر سے کروں۔ پہلے تو وابستہ اراضی فوجی خدمت کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نارمنوں کے قبل ہی سے اس کا سلسلۂ عمل جاگیریت کی طرف رواں تھا، مگر ہنوز کوئی قطعی قانونی نتیجہ نہیں حاصل ہوا تھا۔ فوجی خدمت کی بنا پر زمین کا قبضہ اس قطعی صورت میں رائج

نہیں ہوا تھا، جیسا کہ فتح کے بعد ہوا جب کہ ملک "نائٹوں کی جاگیروں" یعنی ایسے قطعات میں تقسیم کردیا گیا تھا، جن میں ہر قطعے سے یہ توقع تھی کہ جاگیری فوج کی طلبی کے وقت ایک نائٹ حاضر ہوگا۔ لیکن (صورت سابقہ میں بھی) عملاً بہت زیادہ زمین کا قبضہ اسی طرح کا تھا کیونکہ امرا کے ماتحتوں کو بھی زمین ملگئی تھی اور وہ بدستور ماتحت رہے، نیز کسی سردار کی حفاظت کا نفع حاصل کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی ماتحت بن گئے۔ ان سب پر اپنے آقائے اعلیٰ کی خدمت واجب تھی اور بوقت طلب اس کے حشم و خدم کی حیثیت سے حاضر ہوتے تھے تاہم اس قسم کی خدمت ہنوز ان کے قبضۂ اراضی کی قطعی و معنیہ شرط نہیں تھی۔

اس پر بھی نظر رہے کہ قومی فوج محافظ میں خدمت کرنے کے اس ملکی فرض کو نارمن بادشاہوں نے بھی قائم رکھا اور اسے ترقی دی، اور یہ ایک خاص اہم تدبیر تھی جس کے ذریعے سے انھوں نے جاگیریت کے ان سیاسی اثرات کو روکا جو شاہی و قومی ارتباط کو کمزور کردیتے تھے۔ پس یہ اصول انگلستان میں کبھی بھی تسلیم نہیں ہوا کہ تابع اس امر کا پابند رہے کہ وہ اپنے بلاواسطہ آقا کے ہمراہ جنگ میں جائے خواہ یہ جنگ خود بادشاہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اور خانگی جنگ اور امرا کی گراہیوں کی وجہ سے جن خرابیوں نے فرانس میں جڑ پکڑلی تھی وہ انگلستان کی تاریخ میں محض ہنگامی ابتری کا موجب ہوئیں۔ علیٰ ہذا شخصی سکہ سازی جو اسٹیفن کے تحت میں عام ہوگئی تھی ہنری دوم کے عہد میں سختی کے ساتھ بند کردی گئی، عدالتی انتظامات کے متعلق بھی ایسا ہی ہوا، فتح کے بہت قبل سے مصاحبان شاہی اور کلیسا کو جو زمینیں عطا ہوئی تھیں ان کے ساتھ عام طور پر عدالتی اختیارات بھی مل جاتے تھے، ہنڈریڈ کی معمولی عدالت سے اور بعض وقت صوبے کی عدالت سے بھی استثنا حاصل ہوجاتا تھا، چنانچہ فتح کے قبل "حق انصاف رسانی" قبضۂ اراضی کا ایک جزو لاینفک ہوگیا تھا، مگر قدیم قومی عدالتیں بدستور باقی رہیں عدالت کا انتظام کلیتہً جاگیری نہیں ہوگیا۔ اس سے بھی نارمن بادشاہوں کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتیار آگیا جس سے انھوں نے بیرنوں کی کشاکشی میں خوب ہی کام لیا۔

خطبۂ پانزدہم

ازمنۂ وسطیٰ کی حکومت مذہبی

میں نے آخری دو خطبوں میں مختصراً ان مدارج کا قدم بقدم پتا چلایا ہے جنھیں طے کر کے مغربی یورپ (جس سے مقدم مراد یورپ کا وہ حصہ ہے جس میں چارلس اعظم کی شہنشاہی یعنی فرانس، مغربی جرمنی اور شمال اطالیہ شامل تھے) رومانی شہنشاہی کے دور سے نکل کر، جاگیریت کے دور میں داخل ہوا، اور میں نے اس میں یہ اشارہ کیا ہے کہ جاگیریت کا سرچشمہ کارولنجی شہنشاہی تھی اور یہیں سے یہ سیل پھیلا تھا، اسی شہنشاہی کے وسیلے سے جاگیریت مشرقی جرمنی اور ڈنمارک میں پہنچی، جنوبی فرانس کے اثر سے اس کی رسائی اسپین کے اس مسیحی حصہ میں ہوئی جو آہستہ آہستہ عربوں سے واپس لیا گیا تھا، نارمنی فتوحات کے ذریعے سے اس کے قدم جنوبی اطالیہ اور (بعض قیود کے ساتھ) انگلستان میں پہنچے۔ اگرچہ قطعی مفہوم میں تمام یورپ پر جاگیریت کا رنگ نہیں چھایا تھا، پھر بھی وسیع معنی میں ہم اسے جاگیری دور کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں فتح نے جن وحشی بادشاہوں کو صاحب اقتدار وامتیاز بنا دیا تھا، جاگیریت نتیجہ تھی انھیں کی اس کوشش کا کہ وہ ایسے آدمیوں سے متمدن نظم ونسق کا کام لینا چاہتے تھے جن میں قدیم ٹیوٹنی خیالات وعادات اور قبائلی قوم کے ایسے رشتے موجود تھے جیسے فتح کے اثرات نے کمزور کر دیا تھا، پس جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں نظم سلطنت کی شکل میں اس کا نتیجہ یوں بیان ہو سکتا ہے کہ بادشاہی اور ایک طرح کی انتشار انگیز عدیدیت میں

کشمکش جاری تھی، جس میں کبھی ایک کو غلبہ ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کو (اس عدیدیت کو انتشار انگیز کہنا یونانی شہری سلطنتوں کی قدیم عدیدیت کے بالمقابل ہے) جیسے ہم جدید ملکی سلطنت کہ سکتے ہیں، وہ اسی جاگیری دور میں تیار ہو رہی تھی، اس میں ناکمل ارتباط اور ناکمل تعیین کا میلان پیدا ہو چلا تھا کیونکہ حکومتی اختیار اور زمینداری کے امتزاج نے متعین حدود اور اندرونی نظم دونوں کو خراب کر رکھا تھا۔ ناکمل ارتباط کی جانب میلان اس وجہ سے تھا کہ کوئی اتنی قوی مرکزی طاقت موجود نہیں تھی جو تمام ملل انداز افراد وجماعت پر قوم کے نام سے غالب آجائے اور انھیں پامال کر ڈالے اور اس کے ناکمل تعیین کے میلان کی وجہ وہ طرز تھا جس سے ایک ملک کے اجزا یعنی جاگیری علاقے مناکحت و وراثت کے ذریعے سے غیر ممالک کے دوسرے اجزا سے متحد ہو جاتے تھے۔

مگر اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ قدیم شہری سلطنت کے بالمقابل جدید ملکی سلطنت کی بڑھی ہوئی پیچیدگیوں کی وجہ سے ہمیں تا حد شیوع جاگیریت صرف واقعی جاگیری تنظیم اور کسانوں کے ساتھ فوجی زمیندار طبقے کے تعلقات ہی پر غور نہیں کرنا ہے بلکہ ہمیں اس جاگیری تنظیم کے اندر ان غیر عناصر پر بھی لحاظ کرنا ہے جو اگرچہ جاگیریت کے قوی ترین وقت میں اسی میں مل گئے اور گو نہ جاگیری رنگ میں آگئے تھے پھر بھی حقیقتاً اس سے علیحدہ و ممیز تھے۔ یہ عناصر تین تھے (۱) اول بادشاہ تھا، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس پر ہمیشہ دو حیثیتوں سے نظر ڈالنا ہے۔ ایک تو اس حیثیت سے کہ وہ جاگیری عمارت کا سنگ وسطی تھا یعنی جاگیری فرمانروا تھا، اور دوسرے اس حیثیت سے کہ اپنے جاگیری تابعین کے علاوہ اس کے کچھ حقوق و فرائض قوم کے ان بقیہ خصص کے ساتھ بھی تھے جو جاگیریت سے بے تعلق تھے، اور جن کی ترقی نے انجام کار جاگیریت کو تباہ کر دیا۔ وہ جس طرح جاگیرداروں کا آقائے اعلیٰ تھا اسی طرح کل قوم کا بھی بادشاہ تھا اور جہاں جاگیریت سب سے زیادہ قوی تھی وہاں اگرچہ اس کی اس قومی حیثیت کا کچھ زیادہ اثر نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور رہتے، (۲)، دوسرے پادری تھے جو عہد اصلاح کے زمانے تک ایک خود مختار فرمانروا

یعنی پوپ کے تحت میں خود اپنی ایک تنظیم رکھتے تھے اور اس فرمانروا کی مدد کے لئے ان پر محصول لگایا جاتا تھا اور وہ کم و بیش کامیابی کے ساتھ دعویٰ کرتا رہا کہ کلیسائی معاملات میں آخری عدالت مرافعہ وہی ہے۔ یہ تنظیم جو تمام مغربی یورپ پر حاوی تھی، ایک طرف تو اس کا میلان یہ تھا کہ وہ مغربی یورپ کو ایک متمدن نظم میں متحد کرنے پر آمادہ تھی اور دوسری طرف انجام کار میں وہ فرداً فرداً ہر ایک سلطنت کی ارتباطی تنظیم میں سدراہ بھی ہو گئی تھی۔ میں انجام کار کا لفظ اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ (تمثیلاً) انگلستان کی نسبت میرا خیال ہے کہ نارمن فتح کے قبل کلیسا کے اتحاد نے ان متعدد جماعتوں کے ایک قوم بننے میں مدد دی تھی جو مختلف آبادکاریوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں (۳) تیسرے شہر تھے، یہ شہر اگرچہ جاگیریت کے اندر[له] دونوں قسم کے تعلقات رکھتے تھے یعنی ان کے جاگیری بالادست بھی تھے اور زیردست بھی تھے تاہم جب انھوں نے پوری ترقی کر لی تو اپنی خصوصیت و تنظیم میں جاگیریت سے بیگانہ محض ہو گئے۔ انھیں شہروں کی نیم آزاد حکومت خوداختیاری کی وجہ سے یہ ہوا کہ اس سے مدتوں قبل کہ عمومیت کو ازمنۂ وسطیٰ کی قومی حکومتوں میں جزدی و سریع الزوال حصہ مل سکے، وہ اس زمانے کے یورپ کے شہروں کے اندر دوبارہ زندہ ہو گئی تھی۔

اب اگر نظم معاشرت کی جاگیری تنظیم میں یہ تینوں مغائر یا نیم مغائر عناصر ہمیشہ اس امر کا احساس و ادراک رکھتے کہ جاگیری تنظیم کے غیر مکمل انتظام و ارتباط کے مقابلہ میں وہ تہذیب و تمدن کے حق کی نمائندگی کر رہے ہیں (اور بعض اعتبار سے وہ واقعی ایسا کرتے بھی تھے) اور پھر اس احساس و ادراک کے نتیجے کے طور پر اگر وہ ہمیشہ جاگیریت کے خلاف ایک دوسرے کے حلیف بنتے رہتے تو ازمنۂ وسطیٰ کے تنظم کی رفتار ترقی نسبتاً بہت زیادہ سہل ہو جاتی اور اس کا عام تصور قائم کرنا بہت زیادہ آسان ہو جاتا، مگر واقعاً یہ صورت نہیں ہوئی بادشاہ اور کلیسا کے درمیان ہمیشہ بساط جنگ بچھی رہی، خاص کر ہلڈےبرانڈ کے بعد سے،

له اعلےٰ وادنیٰ۔

اور جب ان دونوں میں معرکہ آرائی ہونے لگی تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقع سے جاگیری عنصر کو اپنا حلیف بنانے لگا۔ علیٰ ہذا بادشاہ اگرچہ بالعموم شہروں کی ترقی کا جانبدار تھا مگر کبھی کبھی شہروں کو زیر کرنے کے لئے وہ اپنے بڑے بڑے باجگزاروں کے ساتھ متحد بھی ہو جاتا تھا۔

جیساکہ میں کہہ چکا ہوں انجام کار شاہی اصول کو ہی فروغ ہوا وہ اکمل نظم و اتحاد جس نے ازمنۂ جدیدہ کی سلطنت کو ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت سے ممیز کر دیا۔ وہ اسی شاہی بنیاد پر قائم ہوا اور وہ مرکزی اقتدار جسے انجام کار میں اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ جاگیریت کے بدنظمی و انتشار پیدا کرنے والے میلان کو پامال کر دیا وہ بھی شاہی اقتدار تھا لیکن اس کے وقوع میں آنے سے قبل یورپی نظم سلطنت میں زیادہ مربوط انتظام پیدا کرنے کی ایک تحریک مذہبی حکومت کی بنا پر ہو چکی تھی جس نے نشو و نما پایا اوج کمال کو پہنچی اور پھر فنا ہو گئی۔ میں اس موجودہ خطبے میں اسی کو مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں۔

۲- زمانۂ جدید کے مصنفان سیاسیات میں یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ حکومت کی شکلوں کے اختصاص و انقسام میں وہ ایک شکل حکومت مذہبی کی بھی قائم کیا کرتے ہیں، مگر اس وقت تک مجھے اس پر بحث کرنے کا موقع نہیں ملا ہے کیونکہ جس مفہوم میں اس لفظ کا استعمال مجھے سب سے زیادہ موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے اس مفہوم میں کامل ترقی یافتہ حکومت مذہبی نہ تو یونانی شہری سلطنتوں کی تاریخ ہی میں صاف طور پر نظر آتی ہے اور نہ رومانی تاریخ کے اس حصہ میں جس کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی ہے اس کا صاف صاف اظہار ہوتا ہے اور اس لئے یونانی و رومانی اصحاب فکر کے سیاسی تخیلات میں اسے کوئی جگہ نہیں ملی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یونان کے سیاسی فلاسفہ نے قوم و ملت کی زندگی کے اندر بلکہ اس کی سیاسی تنظیم تک میں مذہب کی منزلت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ ارسطو نے پجاریوں کو عہدہ داروں میں شامل کیا ہے مگر یہ ایسا مذہب تھا جو قطعی طور پر سلطنت کے اغراض کے تابع اور دنیادی حکومت کے زیر اقتدار تھا لیکن ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کے سیاسی ادارات کا پتا چلاتے

وقت ہمیں ایک ایسا درجہ بھی ملتا ہے جس کی نسبت مناسب طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اطالیہ کے ایک حصے میں بشمول روما الکبریٰ مذہبی حکومت قائم ہو گئی تھی، اور اس سے کسی قدر گھٹ کر جرمنی میں شہنشاہی کی کلیسائی ریاستوں کا بھی یہی حال تھا اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس مذہبی حکومت کو عملاً مغربی یورپ پر حاوی کردینے کی بہ زور و مستقل کوشش کی جارہی تھی، اس کوشش کو اگرچہ کسی وقت بھی جزوی کامیابی سے زیادہ کچھ نصیب نہیں ہوا مگر بعض اوقات و مقامات میں اس کی کامیابی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

مذہبی حکومت کی اس تحریک کے حالات و مدارج کے پرکھنے اور جانچنے سے قبل بہتر یہ ہوگا کہ اس لفظ کی تعریف سے آغاز کیا جائے۔ اول یہ کہ اس کے استعمال میں کسی قسم کا الہیاتی اصول مضمر نہیں ہے، مذہبی سلطنت سے مراد وہ سلطنت نہیں ہے جس میں خدا حکمرانی کرتا ہو بلکہ اس سے مراد وہ سلطنت ہے جس میں عادتاً ان لوگوں کی اطاعت کیجاتی ہو جنہیں ربانی مرضی کے اظہار و اعلام کا کچھ خاص اقتدار حاصل ہو، اور یہ اطاعت محض مذہبی عبادت کی نظم و ترتیب ہی تک محدود نہ ہو، بلکہ دنیاوی نظم و نسق سے بھی تعلق رکھتی ہو۔ مزید براں مذہبی حکومت کی بنا کرنے کے لئے میں صرف اسی کو کافی نہیں سمجھتا کہ موروثی بادشاہ کی نسبت یہ خیال کر لیا گیا ہو کہ وہ خداداد حق کی رو سے حکومت کرتا ہے یا کم متمدن زمانے میں یہاں تک سمجھ لیا گیا ہو کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے حکومت کرتا ہے۔ الوہیت کے ساتھ اس قسم کے خاص تعلقات کی وجہ سے اس حکمراں کو جس کی نسبت اس طرح کے مورد عنایات الٰہی ہونے کا یقین ہو خاص امتیاز ضرور حاصل ہو جاتا ہے مگر حکومت کی شکل میں کسی قطعی تغیر کے لئے اس کا کافی ہونا دشوار ہے کیونکہ جس بادشاہ کے سر پر تقدس کا یہ ہالہ ہوتا ہے اس کے تقرر و فرائض کے متعلق لازماً اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہ صورت حال اس وقت کسی قدر بدل جاتی ہے جب بادشاہ یا امرا اہم قسیسی مذہبی فرائض کے اجارہ دار بن جاتے ہیں اور بالعموم ان کا یہ دعویٰ مسلم ہو جاتا ہے کہ وہ ان قوانین کو جانتے ہیں جن کی بجا آوری سے خدائی

قہر وغصہ معلق یا ساکن کیا جاتا ہے اور اس طرح رائے اور خیال پر جو اثر انھیں حاصل ہو جاتا ہے اسے اپنی حکمرانی کی مخالفت کو دبانے یا باطل کرنے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس صورت میں ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ جس بادشاہی یا عدیدیت نے اس طرح تقویت واستحکام مزید حاصل کر لیا ہو اگرچہ اس سے اس کے شاہی یا عدیدی ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا تاہم اسے ایک طرح پر مذہبی حکمرانی کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے علہ لیکن ہمیں اس میں سب سے زیادہ سہولت معلوم ہوتی ہے کہ قطعی معنی میں مذہبی حکومت کی اصطلاح سے مراد یہ لینا چاہیئے، کہ وہ ایک ایسی معاشری تنظیم ہے جس میں وہ لوگ جنھیں ملاء اعلیٰ سے خاص لگاؤ اور ربانی مرضی سے خاص مناسبت ہوتی ہے وہ ایک ایسی پیشہ ور جماعت بن جاتے ہیں جو بالتخصیص مذہبی کام کے لئے وقف ہوتی اور معمولی دنیاوی حکومت سے زیادہ ممیز و جدا رہتی ہے پھر یہ جداگانہ جماعت جس نسبت سے دنیاوی معاملات میں اقتدار حاصل کرتی جاتی ہے اسی نسبت سے حکومت صریحی و مادی طور پر مذہبی حکمرانی کے رنگ میں آتی جاتی ہے اور جب اس مذہبی جماعت کو اعلیٰ اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو حکومت مذہبی، کمل ہو جاتی ہے۔

یونانی شہری سلطنتوں کی تاریخ میں اگر پجاریوں کو کبھی اس قدر اثر حاصل ہوا ہو تو وہ لازماً اس زمانے میں رہا ہوگا جو تاریخی علم سے قبل کا زمانہ ہے "کبھی اسقدر اثر حاصل ہوا ہو" یہ الفاظ میں اس وجہ سے کہتا ہوں کہ اس میں شک کی گنجایش بہت کم ہے کہ یونانیوں کی جو کیفیت ہمیں ہومر سے معلوم ہوتی ہے اس وقت ان میں جتنی مذہبیت نظر آتی ہے اس کے قبل ضرور ان میں اس سے زیادہ مذہبیت رہی ہوگی۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ مذہبیت کس حد تک پہنچی ہوئی تھی لیکن یونانی شہری سلطنتوں کے جس دور کا ہمیں تاریخی علم ہے اس دوران میں پجاریوں کی یہ حیثیت کہیں بھی نظر نہیں آتی کہ سیاسی فلسفے میں انھیں،

علہ۔ ملک رومامیں جب پیٹریشین عدیدیت طبقۂ پلیب کے ساتھ کشمکش میں مبتلا تھی اسوقت یہی حیثیت تھی۔

اس قسم کی خود مختاری و غلبہ حاصل ہوگیا ہو، مذہب سیاسی نظم معاشرت کا ایک جزو لاینفک تھا مگر سیاسی تغیرات کے تعین میں اس کی کوئی صریحی عام اہمیت نہیں معلوم ہوتی اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی خاص صورتوں میں اس کا عمل زوردار طور پر ہوتا تھا جیساکہ اس وقت ہوا جبکہ خاندان پی سس ٹراٹوس ایتھنز سے نکالا گیا جس کی وجہ ایک حد تک یہ ہوئی کہ اہل اسپارٹا کو ڈلفی کہانت کی جانب سے متواتر ہدایت یہ ہو رہی تھی کہ ایتھنز کو خلاص دلائیں (کہا یہ جاتا ہے کہ اس ہدایت کا باعث وہ فیاضی تھی جو ڈلفی کے اپالو کے مندر کے دوبارہ بنانے میں بعض دولتمند جلا وطن اہل ایتھنز کی طرف سے ظہور میں آئی تھی) بہرحال بہ حیثیت مجموعی یونان میں مذہب ایک مستحفظی قوت تھا، البتہ اہل فلسفہ اسے یہ اہمیت دیتے تھے کہ عمدہ سیاسی اوارات کے قائم رکھنے کے لئے یہ ایک ذریعہ ہے لیکن جب ہم یہ خیال کرتے ہیں، کہ انقلابی تحریکات کے روکنے میں واقعاً اس کا کتنا کم اثر پڑتا تھا تو ہمیں گونہ حیرت ہوتی ہے مگر فلاسفہ ہمیشہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ جس طرح کی اعلیٰ و عاقلانہ دنیاوی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، مذہب قطعی طور پر اس حکومت کے تحت میں رہیگا۔

جب ہم روما کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں مذہب نے زیادہ نمایاں حصہ لیا تھا۔ نیو ما کے متعلق، ہم جو کچھ سنتے ہیں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ روما کی تاریخ کے دور افسانہ میں کم از کم ایک موقع تو ایسا آیا تھا جب سلطنت کے اتحاد وارتقاء میں مذہبی اثرات نے بہت اچھا کام کیا، اور تاریخی زمانے میں بھی طبقۂ پلیبب کے ساتھ قدیم عدیدیت کی کشمکش میں مذہب موخرالذکر کی جانب ایک قابل قدر قوت معلوم ہوتا تھا۔ اس سے انھیں کم از کم اتنا موقع تو ملگیا کہ جن سیاسی امتیازات کی وسعت کو وہ روک نہیں سکتے تھے ان میں تاخیر و تعویق ڈالدیں، مگر یونان کی طرح روما میں بھی یہ نہ ہو سکا کہ مذہب کی وجہ سے کوئی ایسی مذہبی ذات یا طبقہ پیدا ہو جاتا جو اپنی اس حیثیت سے اختیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ درحقیقت سلطنت کے متعلق یونانی واطالوی خیال اور ازمنۂ وسطیٰ و جدید کے خیال میں منجملہ اور فرقوں کے ایک نہایت ہی اہم فرق یہ بھی ہے کہ اول الذکر میں

سلطنت کے کچھ ایسے فرائض سمجھے جاتے تھے جنھیں ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت سے جدا کر کے کلیسا کے حوالہ کر دیا گیا تھا اور جنھیں جدید نظریات نے ابھی اس وقت تک سلطنت کو واپس نہیں دیا ہے۔ چنانچہ اصحاب فکر کے تخیل کے بموجب یہ اساسی اہمیت رکھنے والا فرق سلطنت کو تفویض کیا گیا ہے کہ وہ اہل ملک کے اوصاف نیک کو اس طرح قائم رکھے کہ بچپن کے زمانے میں ان کی تعلیم کی نگرانی کرے اور سن رشد کے بعد ان کے عادات عیش پرستی و بدکاری کی اصلاح کرے۔

کلیسا و سلطنت کے جدا کر دینے سے لامحالہ مذہبی حکومت کا پیدا ہو جانا لازم نہیں آتا بلکہ درحقیقت یہ کہنا چاہیئے کہ مذہبی حکومت جب اپنے کمال پر ہوتی ہے تو اس میں کلیسا و سلطنت دونوں مخلوط ہو جاتے ہیں۔ تاہم جہاں کہیں کہ بیشتر قبیلوں کی کوئی جداگانہ تنظیم ہوتی ہے، مذہبی خیالات و جذبات زبردست رہتے ہیں اور معاشرہ کی حالت ابتدائی ازمنۂ وسطیٰ کی سی ہوتی ہے جس میں قومی اتحاد ناکمل اور سیاسی نظم ہیجان اور ناپائدار ہوتا ہے جس سے نظم معاشرت کے ہر اس عنصر کو جس میں کچھ بھی لڑنے کی قوت ہوتی ہے مجبور ہو کر اس قوت کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیئے استعمال کرنا پڑتا ہے، یہ محل مذہبی حکومت کی کوشش کرنے کے لیئے موزوں و مناسب ہوتا ہے۔

۳۔ پس اب میری تجویز یہ ہے کہ اسی جداگانہ تنظیم کا درجہ بدرجہ پتا چلانے سے آغاز کیا جائے۔ جیسا کہ ہم سب کو عام طور پر معلوم ہے اس کی بنائے اول عبرانی یعنی یہودی نظم حکومت پر ہے جو اپنی تاریخ کے اہم دور میں کامل حکومت مذہبی کی شکل رکھتی تھی، یونانی رومانی دستور میں جو جگہ قانون ملکی کو حاصل تھی وہ جگہ قوم یہود میں قانون الٰہی سے پر کیگئی تھی، جن محرکات مروجہ کی وجہ سے اس قانون کی اطاعت ہوتی تھی وہ اس شارع ربانی کے وعدے پر اعتماد اور اس کے وعید کا خوف تھا جس نے اس شرط پر قوم یہود کی حفاظت کا خاص عہد کیا تھا کہ وہ اس کا حق اطاعت ادا کرتی رہے اور جن وسائل سے واقعاً قانون کا علم حاصل ہوتا تھا ان میں ایسی پیچیدگیاں موجود تھیں جن کا اظہار اکثر ترقی یافتہ قوموں کے اصول فقہ سے ہوتا ہے مسیحیت کو تحریری مجموعۂ ضوابط کا خیال ورثے میں ملا جسے سچے بنی اسرائیل نے

اسی حیثیت سے تسلیم کیا تھا اور بنی اسرائیل سے خدا نے جو وعدے کئے تھے اس میں عیسائیوں کو اپنا واجبی حصّہ ملنے کا مدار اسی مجموعۂ ضوابط کو صدق دل سے قبول کرنے پر تھا اور اب تو فی الاصل تمام بنی نوع انسان در نہ کم از کم اس کی تمام برگزیدہ قومیں عیسائیت ہی کے زمرے میں داخل ہیں) اگرچہ قدیم عبرانی مجموعۂ ضوابط کا محض رسمی حصّہ بالکل مسترد کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وہ تمام ضمنی قوانین جن کا انحصار روایات اور عالموں کے شروح و حواشی پر تھا، خارج کر دئے گئے ہیں پھر بھی یہ یقینی کہا جاتا تھا کہ خدا کا قانون یہود کی کتب مقدس پر متضمن ہے جن کے ساتھ حضرت عیسیٰ کی تعلیم اور ان کے حواریوں کی تحریریں بھی ضم کر دی گئی تھیں۔ اس قانون کے تسلیم کرنے سے سلطنت سے قطعاً ممیز ہو کر کلیسا اب ایک منتظم ملت کی حیثیت سے ترکیب پا گیا تھا، اور دونوں کے درمیان یہ فرق اس وجہ سے بھی سخت ہو گیا کہ قدیم مسیحی اس خیال سے ملکی زندگی سے الگ ہو گئے تھے کہ وہ ان بت پرستانہ رسموں سے بچے رہیں جو وفاداری کے سرکاری اظہار کے طور پر عاید کی جاتی تھیں، اس تفریق میں اس دار و گیر کی وجہ سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی جو انھیں اس وقت برداشت کرنا پڑی جب ان کی اس جماعت کے شیوع نے جو قدیم نظم معاشرت کے قالب کی اس درجہ مخالف تھی، آخر میں شہنشاہی حکومت کے لئے خطرہ شدید پیدا کر دیا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس علٰحدگی کی وجہ سے عیسوی نظم معاشرت کے اندر ابتدا ہی سے مذہبی حکومت کے تخم مخفی تھے لیکن جو لوگ کہ اس ربانی قانون کو تسلیم کرتے تھے جس کی حکمرانی تمام انسانی زندگی پر تھی، ان لوگوں کی جماعت اگرچہ نیم سیاسی سوسائٹی بنی رہی تاہم اس نے مدت تک اس وسیع متمدن سوسائٹی کے درمیان بسر کی جو رومانی قانون کے ماتحت تھی، الاخود کو دنیاوی تنظیم سے الگ رکھا اور یہ سعی نہیں کی کہ اس سوسائٹی پر اقتدار حاصل کر کے جدید مجموعۂ ضوابط کے بموجب دنیاوی قانون کے نظم و نسق میں ترمیم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے زیادہ ابتدائی زمانے میں ملت عیسوی نے ہر قسم کی دنیاوی حکومت سے علٰحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ قدیم عیسائیوں کے

خیال کے بموجب عام انسانی نظم معاشرت ایک ایسا عالم تھا جو عارضی طور پر شیطان
کی حکومت میں دیدیا گیا تھا اور اس پر عاجل دناگہانی بتاہی محیط تھی۔ ایسے عالم
میں اس مختصر سی جماعت کا جو گرجا کی محراب کے نیچے جمع ہوتی تھی۔ تعلیم دنیا میں
کیا حصّہ ہوسکتا تھا۔ غرض ابتدائی عیسویت کے زیر اثر حب وطن و خدمت
ملکی کا احساس یا تو عالمگیر حُب انسانی کی صورت میں وسیع ہوگیا یا کلیسائی ملت
تک محدود رہ گیا۔ ترتولیان کہتا ہے کہ "ہم (کل دنیا کی) ایک دولت عامہ کو تسلیم
کرتے ہیں" اور ریگن کہتا ہے کہ "ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا ایک وطن ہے، جو
خدا کے حکم سے قائم ہوا ہے"۔ ؎

جب قسطنطین کے زیر سایہ مذہب عیسوی رومانی شہنشاہی کا مسلمہ مذہبی
معیار بنگیا، اس وقت اس روش میں کس قدر تغیر ہوا مگر صرف کسی قدر، مسیحی طبقۂ قسیس
اب بھی اصولاً دنیا و معاملات دنیا سے الگ رہا اور عملاً اس مذہب کے اکابر
کی ذات کے ساتھ کتنی ہی دنیاداریاں کیوں نہ لاحق ہوگئی ہوں مگر اس دنیاداری
نے ہنوز اس کوشش کی صورت نہیں اختیار کی تھی کہ وہ دنیاوی امور میں
دنیاوی حکومت پر اقتدار حاصل کرلے۔ شہنشاہ کے زیر اقتدار کلیسا کے خود
اپنے حکمراں تھے، اور اگرچہ ضوابط جسٹی نیان کے بموجب اکابر کلیسا کو اخلاقی
یا کرم گسترانہ حیثیت کے انتظامی فرائض تفویض کئے گئے، مثلاً یہ کہ خلاف قانون
گرفتاریوں کے روکنے کے لئے قیدخانوں کا معائنہ کرنا، قمار بازی کا انسداد، عورتوں
کے جبراً سٹیج پر لانے کا سد باب، وغیرہ یہ امور ان سے متعلق تھے اور چوتھی صدی
میں شہروں کے زوال کے وقت شہری انتظامات میں بھی اکابر کلیسا نے اچھی
اہمیت پیدا کرلی تھی، پھر بھی یہ لوگ فی الجملہ دنیاوی حکومت سے بے تعلق تھے
نظم ونسق ملکی میں اہل کلیسا سے اس طرح کام لینا غالباً مذہبی حکومت کی جانب
پہلا قدم سمجھا جائیگا مگر اسے صرف پہلا ہی قدم سمجھنا چاہیئے۔ اس میں کسی شک
کی گنجایش نہیں ہے کہ مذہبی و اخلاقی مسائل میں پادریوں کا دعویٰ یہ تھا کہ عام

ؑ مصنف کی تاریخ اخلاقیات صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۲۰ کا مقابلہ کیجئے۔

دنیا دار کسی رتبے کے کیوں نہ ہوں ان کی اطاعت کریں۔ شہنشاہ اگر اپنے مذہبی و اخلاقی فرض میں کوتاہی کرے تو صدر کلیسا اگر صاحب جرأت و ایقان ہو تو وہ اسے بھی زجر و توبیخ کر سکتا، اس پر کفارہ عائد کر سکتا، اور اس کے گناہوں کی معافی سے انکار کر سکتا تھا لیکن جب تک کہ مغرب یا مشرق میں رومانی شہنشاہی باقی رہی، بلند حوصلہ افراد کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے مگر پادریوں نے ایک منضبط جماعت کی حیثیت سے یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ اپنے اس اثر کے ذریعے سے شہنشاہوں کو تخت نشین کرنے، ان کی میعاد حکومت معین کرنے یا ان کے معمولی نظم و نسق پر نگرانی قائم کرنے کا کام لیں۔

۴۔ پس شہنشاہی کے تحت میں، ہم شہنشاہی کے اندر تنظیم کی وہ تفریق دیکھتے ہیں جس میں آئندہ کی مذہبی حکومت کا تخم مخفی تھا، مگر اس تخم نے ابھی تک نشوونما نہیں پائی تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ تخم کے نشوونما کی اولیں وجہ خود کلیسا کے اندر حکومت مذہبی کی کسی بلند حوصلگی کی تحریک نہیں تھی، بلکہ خارجی حالات اس کا سبب ہوئے یعنی مغربی شہنشاہی کے زوال کے بعد دنیاوی اقتدار میں جو برہمی و ابتری پیدا ہوئی وہی اس کا باعث ہوئی۔ شہنشاہی شکست ہو گئی مگر کلیسا بدستور منضبط رہا۔ کلیسائی استعارے میں یہ ایک کشتی تھی جس کے ذریعے سے بربریوں کے حملوں کے بعد کی ابتدائی پانچ صدیوں کے تلاطم بحر سے گزار کر تہذیب و تمدن کو پار اتارا گیا تھا۔ اس پُرآشوب زمانے میں مغربی یورپ کے نظم معاشرت میں اگر کچھ اتحاد قائم تھا تو اس کی اصل مغربی عالم عیسوی کا یہی اتحاد تھا۔ کلیسا کا تنظیمی ارتباط مضبوط تھا۔ اسے اس امر کا احساس تھا کہ ان وحشی حملہ آوروں پر اسے کامل ذہنی فوقیت حاصل ہے۔ کلیسائی تعلیم و مراسم کے وسیلے سے ذہنی اثر کا وہ واحد ذریعہ جس سے ان کندۂ ناتراش بربریوں کے دلوں پر پر زور اثر ہو سکے وہ اسی کے قبضۂ قدرت میں تھا، اور بدنظمی کے بالمقابل کامیاب جد و جہد سے اسے نئی قوت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ ان تمام امور نے وحشیوں کی ان فرمانرواییوں کے اندر جو رومانی شہنشاہی کی شکست اور اس سے باہر کی ٹوٹتی قوموں کے اجزا سے بن گئی تھیں، کلیسا کو اول درجے کی اہمیت دیدی اور بتدریج اس کا

تسلط وسیع ہوتا گیا۔ یہ امر واقعہ جیسا فرانس و جرمنی کی تاریخوں میں نمایاں ہے اس سے کم انگلستان کی تاریخوں میں نمایاں نہیں ہے اور اسپین میں بھی گاتھ اور عربوں کے فتوحات کے درمیانی زمانے میں نظر آرہا ہے مگر زیادہ خصوصیت کے ساتھ اس کا اظہار چارلس اعظم کی شہنشاہی میں ہوا جس کی متبرک حیثیت ایک نہایت حیرت انگیز خصوصیت ہے۔ یہ چارلس ہی تھا جس نے زیادہ تر عیسوی عشر کا نظم قائم کیا اور کلیسائی اکابر کے وجود کا سلسلہ بھی اسی کی روش پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔ یہ کلیسائی اکابر وہ انتخاب کنندہ اساقفہ اعظم تھے، جو جرمنی میں صدیوں تک شہنشاہ کے بعد بڑے بڑے دنیاوی حکمرانوں کی ہمسری کا دعوی کرتے رہے ہے۔ درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس نے مشرق کے بربری ملک کو بزور شمشیر زیر کرکے ازمنۂ وسطیٰ کے تمدن کا مطیع بنا دیا تو اس کے ساتھ ہی اس نے اس ملک پر قبضہ و اقتدار عصائے اسقفی کے ذریعے سے قائم رکھا۔

نتیجہ عام یہ ہوا کہ اساقفہ نظم و نسق ملکی کے اور ان مجالس کے جو دنیاوی حکمرانی کو حکومت کے کام میں مدد دیتی تھیں اہم رکن بن گئے اور اس کے ساتھ ہی گرجے اور خانقاہیں اپنے اراضی اوقاف پر قابض و متصرف رہے اور انھیں ترقی دیتے گئے۔ اور جب واقعات اپنی باری میں بالطبع خیالات پر اثر انداز ہوئے تو پادری اپنی خود مختاری اور دنیاوی معاملات کی نگرانی کے متعلق تبدریج لاطایل دعادی پیش کرنے لگے۔ پادریوں کا دنیاوی عدالتوں کے اختیار سے آزاد ہونا، دنیاوی معاملات پر اسقفی دیا پاپائی اختیارات کا وسیع ہونا، بدکردار، ستم شعار حکمرانوں کی مقاومت کرنے بلکہ انھیں معزول تک کردینے کا استحقاق جتانا، یہ سب وہ دعادی ہیں جو اوائل نویں صدی کے ابتدا ہی میں پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن ہنوز کلیسا کی اندرونی تنظیم اپنے پورے اتحاد وارتباط کو نہیں پہنچی تھی۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ پادری دنیاوی جاگیری نظم سے علٰحدہ ہو جائیں اور اس علٰحدگی میں دشواریاں جو اس وجہ سے لاحق ہو جاتی تھیں کہ دور تفریق و انتشار کے بعد نظم معاشرت کی تعمیر میں خود پادریوں ہی نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا (خاصکر فرانس و جرمنی میں)۔ اس کا ایک طبعی نتیجہ

جزوی جاگیریت اور اس لئے کلیسائی عہدوں کے دنیاوی رنگ میں آجانے
کی صورت میں ظاہر ہوا۔

(جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) چارلس اعظم کی شہنشاہی کے اجزاء میں جب
جاگیری طرز کی مدد سے نظم معاشرت کی تعمیر ثانی شروع ہوی تو اس وقت
دنیاوی جاگیری طبقہ حکمراں میں کلیسا کے مقامی ارباب اقتدار کو بڑی ہی اہم
حیثیت و منزلت حاصل ہوگئی تھی۔ اساقفہ بلکہ اہل صومعہ تک نے نیم خودمختاری
حیثیت حاصل کر لی تھی اور بڑے بڑے وسیع علاقوں پر بالکل دنیاوی امراء کی
طرح سے نیم حاکمانہ اختیارات عمل میں لانے لگے۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ
انھوں نے جاگیری نظم سلطنت کے اندر جابجا ایک طرح کی مذہبی حکمرانی
قایم کر دی تھی مگر جو مذہبی حکمرانی اس طرح قایم ہوی وہ اس قسم کی تھی کہ مذہبی
حکمراں کو زاید از ضرورت دنیاوی حکمراں کے مشابہ کر دینے سے خود اپنے
ہی اصول کے برباد کرنے کی طرف مائل ہوگئی۔ ازمنۂ مابعد میں مقدس رومانی
شہنشاہی کے اندر اس کا اظہار نہایت ہی حیرت انگیز شکل میں ہوا چنانچہ جب
مرکزی قوت کمزور ہوگئی تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس انتشار کے دور میں جو امارتیں
بنیں ان میں کلیسائی امرا کو بہت ہی اہم حصہ مل گیا اور محکوموں کے ساتھ ان کا
برتاؤ اور ان کے ساتھ محکوموں کا انداز طبیعت دونوں دنیاوی حکمرانوں کے
برتاؤ کے بہت ہی مشابہ ہو گئے تھے۔ مگر سابق تر ازمنۂ وسطیٰ میں بھی واقعہ عجیبہ
مغربی یورپ کی دوسری سلطنتوں میں بھی پیش آچکا تھا اگرچہ وہ اس حد تک
نہیں پہنچا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرنگی شہنشاہی میں ملک کی معمولی عدالتوں
سے برآت و مستثنیات (جنھوں نے حکومتی فرائض اور زمینداری کے امتزاج
باہمی میں اس قدر اہم اثر دکھایا) پہلے پادریوں کو عطا ہوئیں اس کے بعد
بڑے بڑے دنیاوی امرا کو ملیں۔ جو شخص کلیسائی تسلط کا دشمن بھی رہو اس کے
لئے بھی یہ انکار کرنا دشوار ہے کہ جاگیری تنظیم میں پادریوں کو جو جگہیں دیگئیں وہ ان
خدمات کی بنا پر بالکل بجا و درست تھیں جو بربری اقوام کے حملوں کے بعد کی
ابتدائی پانچ صدیوں کے دور ابتری میں کلیسا نے اتحاد کے رشتے کو مضبوط کر کے

اور بجائی نظم وامن میں مدد دیکر تہذیب وتمدن کے حق میں انجام دی تھیں - اگر کلیسا ارضی انعامات کا خواہاں تھا تو اس نے مناسب طور پر یہ حق پیدا کرلیا تھا کہ جس جاگیری نظام میں زمین کا قبضہ اور حکومتی اختیار ملے ہوئے تھے اس نظم میں اسے وسیع ارضی دنیاوی اور حاکمانہ اختیار عطا کیا جائے۔ لیکن سوال یہ نہیں تھا کہ وہ ان دنیاوی انعامات کا اہل تھا یا نہیں بلکہ سوال یہ تھا کہ اپنی نمایاں خصوصیت کو زائل کیے بغیر ان انعامات کو قائم بھی رکھ سکتا تھا یا نہیں؟ کم از کم اس وقت تک تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا جب تک کہ کوئی پر زور مرکزی تنظیم اور کوئی سخت گیر جداگانہ انضباط دنیاوی رنگ اختیار کرنے کے اس میلان کا بدل نہ کر دیتا جو لازماً ان انعامات کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہو جاتا تھا اور میرا خیال ہے کہ مورخ بھی اس کا جواب اسی طرز پر دینا چاہے گا جس طرز پر ہلڈے براند نے اس کا جواب دیا تھا ہلڈے براند نے اس معاملے میں جیسا پر زور اثر ڈالا کسی ایسے ہی پر زور اثر کے بغیر اغلب یہی تھا کہ وسیع دولت وعظیم طاقت کے ترغیبات اور ان کے ساتھ ہی پدرانہ الفت اور نظم جاگیری کی موروثیت کا میلان کو تمام مغربی یورپ میں مذہبی مناصب اعلیٰ کو موروثی جاگیر بنا دیتے اور ان مناصب کی مابہ الامتیاز مذہبی خصوصیت ہلڈے براند اور اسکے جانشینوں کی سعی وکوشش کے باوجود بھی واقعتاً جس حد تک گمنامی وخرابی میں پڑی رہی؛ اس سے زیادہ کامل طور پر غارت ہو گئی ہوتی۔

بہر حال جب پوپ کے زیر سایہ پادریوں کا تجربہ اور پر زور مرکزی انتظام کامیابی کے ساتھ قائم ہو گیا تو پھر یہ امر تقریباً لابدی تھا کہ اس قوت کی سعی یہ ہوگی کہ جس نظم معاشرت پر اس نے پہلے ہی سے اس قدر زبردست قابو حاصل کر رکھا تھا اس پر مکمل وہمہ گیر حکمرانی قائم کرلے۔ اور یہ اکابر دین روحانی ودنیاوی اقتدار کی تقسیم کو قطعاً یہ سمجھنے لگیں کہ (ان دونوں اقسام اقتدار میں) محکومین کے لحاظ واعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا بلکہ یہ فرق صرف طرز حکمرانی کے اعتبار سے تھا کیونکہ اخلاقیات کا تعلق بہ حیثیت مجموعی روحانی دائرے سے ہے اور سیاسیات کا وہ کونسا مسئلہ ہے جس کی نسبت اخلاقی مسئلہ ہونے کا